یاد کی اِک دُھنک جلے

(افسانے)

قرۃ العین حیدر

رفعت پبلشرز

۴۳۔ شاہراہ قائد اعظم۔ لاہور

ناشر : ریاض ملک ۔ رفعت پبلشرز لاہور

طابع : میاں محمد طفیل ۔ نقوش پریس ۔ لاہور

قیمت : [redacted]وپیہ صرف

غم کی صلیب کے نام ——!

(جس پر ہر انسان اپنی لاش لٹکائے کھڑا ہے۔)

ترتیب

کارمن

رات کے گیارہ بجے ٹیکسی شہر کی خاموش سڑکوں پر سے گزرتی ایک پرانی وضع کے پھاٹک کے سامنے جا کر رُکی۔ ڈرائیور نے دروازہ کھول کر بڑی قطعیت کے ساتھ میرا سوٹ کیس اُتار کر فٹ پاتھ پر رکھ دیا اور پیسوں کے لئے ہاتھ پھیلائے تو مجھے ذرا عجیب سا لگا۔

"یہی جگہ ہے؟" میں نے شبہ سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" اُس نے اطمینان سے جواب دیا۔ میں نیچے اُتری۔ ٹیکسی گلی کے اندھیرے میں غائب ہو گئی اور میں سنسان فٹ پاتھ پر کھڑی رہ گئی۔ میں نے پھاٹک کھولنے کی کوشش کی مگر وہ اندر

سے بند تھا۔ تب ہی مَیں نے بڑے دروازے میں جو کھڑکی لگی تھی اسے کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر بعد کھڑکی کھلی۔ میں نے چوروں کی طرح اندر جھانکا۔ اندر نیم تاریک آنگن تھا جس کے ایک کونے میں دو لڑکیاں رات کے کپڑوں میں ملبوس آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں۔ آنگن کے سرے پر ایک چھوٹی سی شکستہ عمارت ایستادہ تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لئے گھسیاری منڈی لکھنؤ کا اسکول یاد آگیا جہاں سے میں نے بنارس یونیورسٹی کا میٹرک پاس کیا تھا۔ میں نے پلٹ کر گلی کی طرف دیکھا جہاں مکمل خاموشی طاری تھی۔ فرض کیجئے —— میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ جگہ افیموں بردہ فروشوں اور راہگیروں کا اڈہ نکلی تو —— ؟ میں ایک اجنبی ملک کے اجنبی شہر میں رات کے گیارہ بجے ایک گمنام عمارت کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی جو گھسیاری منڈی کے اسکول سے ملتا جلتا تھا!

ایک لڑکی کھڑکی کی طرف آئی۔

"گڈ ایوننگ! یہ وائی ڈبلیو سی اے ہے نا؟" میں نے ذرا عجز سے مسکرا کر پوچھا۔ "میں نے تار دلوایا تھا کہ میرے لئے ایک کمرہ ریزرو کر دیا جائے۔" مگر کس قدر خستہ حال وائی ڈبلیو سی اے ہے یہ —— میں نے دل میں سوچا۔

"ہمیں آپ کا کوئی تار نہیں ملا۔ اور افسوس ہے کہ سارے کمرے گھرے ہوئے ہیں۔"

اب دوسری لڑکی آگے بڑھی ——"یہ ورکنگ گرلز کا ہوسٹل ہے۔ یہاں عام طور سے مسافروں کو نہیں ٹھہرایا جاتا۔" اس نے کہا۔

میں یک لخت بے حد گھبرا گئی۔ اب کیا ہوگا؟ میں اس وقت یہاں سے کہاں جاؤں گی؟ دوسری لڑکی میری پریشانی دیکھ کر خوش خلقی سے مسکرائی۔

"کوئی بات نہیں۔ گھبراؤ مت۔ اندر آجاؤ——لو ادھر سے کود آؤ——"

"مگر کمرہ تو کوئی خالی نہیں ہے——" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میرے لئے جگہ کہاں ہوگی؟"

"ہاں ہاں۔ کوئی بات نہیں۔ ہم جگہ بنا دیں گے۔ اب اس وقت آدھی رات کو تم کہاں جاتی ہو۔" اسی لڑکی نے جواب دیا۔ میں سوٹ کیس اٹھا کر کھڑکی سے اندر آنگن میں کود گئی۔ لڑکی نے سوٹ کیس مجھ سے لے لیا۔ عمارت کی طرف جاتے ہوئے میں نے جلدی سے کہا۔ "بس آج کی رات مجھے ٹھہر جانے دو۔ میں کل صبح اپنے دوستوں کو فون کر دوں گی۔ میں یہاں تین چار لوگوں

کو جانتی ہوں۔ تم کو بالکل زحمت نہ ہوگی۔

"فکر مت کرو ـــــــ" اس نے کہا۔ پہلی لڑکی شب بخیر کہہ کر غائب ہوگئی۔

ہم سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں پہنچے۔ برآمدے کے ایک کونے میں لکڑی کی دیواریں لگا کر ایک کمرہ سا بنا دیا گیا تھا۔ لڑکی سُرخ پھولوں والا دبیز پردہ اٹھا کر اس میں داخل ہوئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے گئی۔ "یہاں میں رہتی ہوں۔ تم بھی یہیں سو جاؤ" اس نے سوٹ کیس ایک کرسی پر رکھ دیا اور الماری میں سے صاف تولیہ اور نیا صابن نکالنے لگی ایک کونے میں چھوٹے سے پلنگ پر مچھر دانی لگی تھی۔ برابر میں سنگھار میز رکھی تھی اور کتابوں کی الماری ـــــــ جیسے کمرے ساری دنیا میں لڑکیوں کے ہوسٹلوں میں ہوتے ہیں ـــــــ لڑکی نے فوراً دوسری الماری میں سے چادر اور کمبل نکال کر فرش کے گھسے ہوئے بدرنگ قالین پر بستر بچھایا اور پلنگ پر نئی چادر لگا کر مچھر دانی کے پردے گرا دیئے۔

"لو تمہارا بستر تیار ہے"

مجھے بے حد ندامت ہوئی۔ "سنو۔ میں فرش پر سو جاؤں گی۔"

"ہرگز نہیں۔ اتنے مچھر کاٹیں گے کہ حالت تباہ ہو جائے گی۔

ہم لوگ ان مچھروں کے عادی ہیں۔ کپڑے بدل لو ــــــ" اتنا کہہ کر وہ اطمینان سے فرش پر بیٹھ گئی "میرا نام کارمن ہے۔ میں ایک دفتر میں ملازم ہوں اور شام کو یونیورسٹی میں ریسرچ کرتی ہوں۔ کیمسٹری میرا مضمون ہے۔ میں وائی ڈبلیو کی سوشل سیکرٹری ہوں۔ اب تم اپنے متعلق بتاؤ۔"

میں نے بتایا۔

"اب سو جاؤ۔" مجھے اونگھتے دیکھ کر اُس نے کہا۔ پھر اُس نے دوزانو جھک کر دعا مانگی اور فرش پر لیٹ کر فوراً سو گئی۔

صبح کو عمارت جاگی۔ لڑکیاں سروں پر تولیہ لپیٹے اور ہاؤس کوٹ پہنے غسلخانوں سے نکل رہی تھیں۔ برآمدے میں سے گرم قہوے کی خوشبو آ رہی تھی۔ دو تین لڑکیاں آنگن میں ٹہل ٹہل کر دانتوں پر برش کر رہی تھیں۔

"چلو تمہیں غسلخانہ دکھا دوں۔" کارمن نے مجھ سے کہا اور ہال میں سے گزر کر ایک گلیارے میں لے گئی جس کے سرے پر ایک ٹوٹی پھوٹی کوٹھڑی سی تھی۔ جس میں صرف ایک نل لگا تھا اور دیوار پہ ایک کھونٹی گڑی تھی۔ اس کا فرش اکھڑا ہوا تھا اور دیوار میں پر سیلن تھی۔ روشندان کے اُدھر سے کسی لڑکی کے گانے کی آواز

آرہی تھی۔ اس غسل خانے کے اندر کھڑے ہو کر میں نے سوچا۔ کیسی عجیب بات ہے ـــــ مدتوں سے یہ غسلخانہ اس ملک میں، اس شہر میں، اس عمارت میں اپنی جگہ پر موجود ہے ـــــ اور میرے وجود سے بالکل بے خبر ـــــ اور آج میں اس میں موجود ہوں۔ کیسا بیوقوفی کا خیال تھا۔

جب میں غسل کر کے باہر نکلی تو نیم تاریک ہال میں ایک چھوٹی سی میز پر میرے لئے ناشتہ چنا جا چکا تھا۔ کئی لڑکیاں جمع ہو گئی تھیں۔ کارمن نے ان سب سے میرا تعارف کرایا۔ بہت جلد ہم سب پرانے دوستوں کی طرح قہقہے لگا رہے تھے۔

"اب میں ذرا اپنے جاننے والوں کو فون کر دوں"۔ چائے ختم کرنے کے بعد میں نے کہا۔

کارمن شرارت سے مسکرائی "ہاں۔ اب تم اپنے بڑے بڑے مشہور اور اہم دوستوں کو فون کرو اور ان کے وہاں چلی جاؤ۔ تمہاری پروا کون کرتا ہے۔ کیوں روزیٹا ـــــ ہم اس کی پروا کرتے ہیں؟"

"بالکل نہیں"۔ کورس ہوا۔

لڑکیاں میز پر سے اٹھیں "ہم لوگ اپنے اپنے کام پر جا رہے ہیں۔ شام کو تم سے ملاقات ہو گی"۔ میگڈیلینا نے کہا۔

"شام کو۔۔۔" ایملیا نے کہا "شام کو یہ کسی کنٹری کلب میں بیٹھی ہو گی۔۔۔!"

کارمن کے دفتر جانے کے بعد ہم نے برآمدے میں جا کر فون کرنے شروع کئے۔۔۔ فوج کے میڈیکل چیف میجر جنرل کیملو گلڈاس۔ جو جنگ کے زمانے میں میرے ماموں جان کے رفیقِ کار رہ چکے تھے۔۔۔ مسز الطینیا کوسٹیلو۔۔۔ ایک کروڑ پتی کاروباری کی بیوی جو یہاں کی مشہور سماجی لیڈر تھیں۔ اور جن سے میں کسی بین الاقوامی کانفرنس میں ملی تھی۔ الفانسو دلیرا۔۔۔ اس ملک کا نامور ناول نگار اور جرنلسٹ جو ایک دفعہ کراچی آیا تھا۔۔۔ "ہلو۔۔۔ ہلو۔۔۔ ارے۔۔۔ تم کب آئیں ہمیں اطلاع کیوں نہیں دی۔۔۔؟ کہاں ٹھہری ہو۔۔۔؟ وہاں۔۔۔؟ گڈ گاڈ! وہ کوئی ٹھہرنے کی جگہ ہے۔۔۔! ہم فوراً تمہیں لینے آرہے ہیں۔" ان سب نے باری باری مجھ سے یہی الفاظ دہرائے۔ سب سے آخر میں میں نے ڈون گارسیا ڈیل پریڈس کو فون کیا۔ یہ مغربی یوروپ کے ایک ملک میں اپنے دیس کے سفیر رہ چکے تھے۔ اور وہیں ان سے اور ان کی بیوی سے میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ ان کے سیکرٹری نے بتایا کہ وہ لوگ آج کل پہاڑ پر

گئے ہوئے ہیں۔ اس نے میری کال ان کے پہاڑی محل میں منتقل کردی۔

تھوڑی دیر بعد مسز کوسٹیلو اپنی مرسی ڈیز میں مجھے لینے کے لئے آگئیں۔ کارمن کے کمرے میں آکر انہوں نے چاروں طرف دیکھا اور میرا سوٹ کیس اٹھا لیا۔

مجھے دھکا سا لگا۔ میں ان لوگوں کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ میں کارمن، ایمیلیا، برنارڈ اور روزا، اور مگدلینا کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔

"سامان رہنے دیجئے۔ شام کو دیکھا جائے گا۔" میں نے ذرا جھینپ کر مسز کوسٹیلو سے کہا۔

"مگر تم کو اس نامعقول جگہ پر بے حد تکلیف ہو گی۔" وہ برابر دہراتی رہی۔

رات کو جب میں واپس آئی تو کارمن اور ایمیلیا پھاٹک کی کھڑکی میں ٹھلتی میرا انتظار کر رہی تھیں "آج ہم نے تمہارے لئے کمرے کا انتظام کر دیا ہے۔ کارمن نے کہا۔ میں خوش ہوئی کہ اب اسے فرش پر نہ سونا پڑے گا۔

ہال کی دوسری طرف ایک ادھ سیلے ہوئے کمرے میں دو پلنگ

بچھے تھے۔ ایک پر میرے لئے بستر لگا تھا دوسرے پر مسز سوڈیل بیٹھی سگریٹ پی رہی تھیں۔ وہ اڑتیس انتالیس سال کی رہی ہوں گی۔ ان کی آنکھوں میں عجیب طرح کی اُداسی تھی۔ یورپینیز ین نسل کی کس شاخ سے ان کا تعلق تھا۔ ان کی شکل سے معلوم نہ ہو سکتا تھا۔ پلنگ پر نیم دراز ہو کر انھوں نے فوراً مجھے اپنی زندگی کی کہانی سنانا شروع کر دی "میں گام سے آئی ہوں" انھوں نے کہا۔

"گام کہاں ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

بحرالکاہل میں ایک جزیرہ ہے۔ اس پر امریکن حکومت ہے وہ اتنا چھوٹا جزیرہ ہے کہ دنیا کے نقشے پر اس کے نام کے نیچے صرف ایک نقطہ لگا ہوا ہے ــــــ میں امریکن شہری ہوں" انہوں نے ذرا فخر سے اضافہ کیا۔

گام ــــــ میں نے دل میں دہرایا۔ کمال ہے۔ دنیا میں کتنی جگہیں ہیں۔ اور ان میں بالکل ہمارے جیسے لوگ بستے ہیں۔

"میری لڑکی ایک وائلن بجانے والے کے ساتھ بھاگ آئی ہے۔ میں اسے پکڑنے آئی ہوں۔ وہ صرف سترہ سال کی ہے۔ مگر حد سے زیادہ خود سر ــــــ آج کل کی لڑکیاں ــــــ" پھر وہ دفعتاً اٹھ کر بیٹھ گئیں ــــــ "مجھے کینسر ہو گیا تھا۔"

"اوہ ـــــ" میرے منہ سے نکلا۔

"مجھے سینے کا کینسر ہو گیا تھا" انہوں نے بڑے الم سے کہا "ورنہ تین سال قبل ـــــ میں بھی ـــــ میں بھی اور سب کی طرح نارمل تھی"۔ ان کی آواز میں بے پایاں کرب تھا ـــــ "دیکھو ـــــ" انہوں نے اپنے نائٹ گون کا کالر سامنے سے ہٹا دیا ـــــ میں نے لرز کر آنکھیں بند کر لیں۔ ایک عورت سے اس کے جسم کی خوب صورتی ہمیشہ کے لئے چھن جائے۔ کتنی قہرناک بات تھی۔

تھوڑی دیر بعد مسز سوریل سگریٹ بجھا کر سو گئیں۔ کھڑکی کی سلاخوں میں سے چاند اندر جھانک رہا تھا۔ نزدیک کے کسی کمرے سے مگدیلینیا کے گانے کی دھیمی آواز آنی بھی بند ہو گئی۔

دفعتاً میرا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔

اگلا ہفتہ، فیشن ایبل رسالوں کی زبان میں "سوشل اور تہذیبی مصروفیات کی آندھی" کی طرح "آرٹ و کلچر" کے معاملات میں گزارا۔ دن مسز کوسٹیلو اور ان کے احباب کے حسین، پرفضا مکانوں میں اور شامیں شہر کی جگمگاتی تفریح گاہوں میں بسر ہوتیں۔ ہر طرح کے لوگ ـــــ انٹلیکچوئیل ـــــ جرنلسٹ ـــــ مصنف ـــــ سیاسی لیڈر، مسز کوسٹیلو کے گھر آتے اور ان سے بحث مباحثے رہتے۔ اور میں

انگریزی محاورے کے الفاظ میں اپنے آپ کو گویا بے حد "اینجوائے" کر رہی تھی۔ میں رات کو وائی ڈبلیو واپس آتی اور ہال کی چوکور میز کے اردگرد بیٹھ کر پانچوں لڑکیاں بڑے اشتیاق سے مجھ سے دن بھر کے واقعات سنتیں۔ "کمال ہے ——" روزا کہتی —— "ہم اسی شہر کے رہنے والے ہیں مگر ہمیں معلوم نہیں کہ یہاں ایسی الف لیلوی فضائیں بھی ہیں۔"

"یہ بے حد امیر لوگ جو ہوتے ہیں نا۔ یہ اتنے روپے کا کیا کرتے ہیں؟" امیلیا پوچھتی۔ امیلیا اسکول میں پڑھاتی تھی۔ روزا ایک سرکاری دفتر میں اسٹینو گرافر تھی۔ مگد یلینا اور برنارڈ ایک میوزک کالج میں پیانو اور وائلن کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ یہ سب متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی لڑکیاں تھیں۔

اتوار کی صبح کارمن ماس میں جانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ کوئی چیز نکالنے کے لئے میں نے الماری کی دراز کھولی تو اس کے جھٹکے سے اوپر سے ایک اونی خرگوش گر پڑا۔ میں اسے واپس رکھنے کے لئے اوپر اچکی تو الماری کی چھت پر بہت سارے کھلونے رکھے نظر آئے۔

"یہ میرے بچے کے کھلونے ہیں۔" کارمن نے سنگھار میز کے

سامنے بال بناتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔
"تمہارے بچے کے ــــ؟" میں ہکا بکا رہ گئی۔ اور میں نے بڑے دکھ سے اسے دیکھا۔ کارمن بن بیاہی ماں تھی۔

آئینے میں میرا ردِ عمل دیکھ کر وہ میری طرف پلٹی۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور اس نے کہا ــــ "تم غلط سمجھیں!" پھر وہ کھِل کھِلا کر ہنسی۔ اور اس نے الماری کی نچلی دراز میں سے ایک ہلکے نیلے رنگ کی چمکیلی "بے بی بک" نکالی "دیکھو۔ یہ میرے بچے کی سالگرہ کی کتاب ہے۔ جب وہ ایک سال کا ہوگا تو یہ کرے گا۔ یہاں اس کی تصویریں چپکاؤں گی ــــ" وہ اطمینان سے آلتی پالتی مار کر پلنگ پہ بیٹھ گئی اور اسی کتاب میں سے خوب صورت امریکن بچوں کی رنگین تصویروں کے تراشے نکال کر بستر پر پھیلا دیئے "دیکھو میری ناک کتنی چپٹی ہے۔ اور رنگ تو مجھ سے بھی گیا گزرا ہے۔ تو ہم دونوں کے بچے کی ناک کا سوچو کیا حشر ہوگا؟ میں اس کی پیدائش سے مہینوں پہلے یہ تصویریں دیکھا کروں گی تاکہ اس بے چارے کی ناک پہ کچھ اثر پڑے!!"

"تم دیوانی ہو اچھی خاصی!!" میں نے کہا۔ "اور یہ نک کون بزرگ ہیں؟"

اس کا رنگ ایک دم سفید پڑ گیا۔ "ابھی اس کا ذکر نہ کرو۔ اس

کے نام پر مجھے لگتا ہے کہ میرا دل کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔"

مگر اس کے بعد وہ برابر نک کا ذکر کرتی رہی "میں اتنی بدصورت ہوں مگر نک کہتا ہے۔ کارمن ـــــ کارمن ـــــ مجھے تمہارے دل سے، تمہارے دماغ سے، تمہاری روح سے عشق ہے۔ نک نے اتنی دنیا دیکھی ہے۔ اتنی حسین لڑکیوں سے اس کی دوستی رہی ہے۔ مگر اسے میری بدصورتی کا ذرا بھی احساس نہیں۔"

گرجا سے واپسی پر، خلیج کے کنارے سڑک پر چلتے ہوئے، وائی ڈبلیو کے نمناک ہال میں کپڑوں پر استری کرتے ہوئے کارمن نے مجھے اپنی اور نک کی داستان سنائی۔ نک ڈاکٹر تھا اور ہارٹ سرجری کی اعلیٰ ٹریننگ کے لئے باہر گیا ہوا تھا اور اُسے دلوانہ وار چاہتا تھا۔

رات کو میں مسز سوریل کے کمرے سے کارمن کے کمرے میں واپس آچکی تھی۔ کیونکہ مسز سوریل اپنی لڑکی کو پکڑ لانے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ اور لڑکی اب ان کے ساتھ مقیم تھی۔ سونے سے پہلے میں مچھردانی ٹھیک کر رہی تھی۔ کارمن پھر فرش پر آسن جمائے بیٹھی تھی۔

"نک ـــــ" اس نے کہنا شروع کیا۔

"آج کل کہاں ہے؟ میں نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔"

"تم اسے خط نہیں لکھتیں؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے سوال کیا۔

"تم خدا پر یقین رکھتی ہو؟" اُس نے کہا۔

"یہ تو بہت لمبا چوڑا مسئلہ ہے۔" میں نے جمائی لے کر جواب دیا۔
"مگر یہ تو بتاؤ کہ تم اسے خط کیوں نہیں لکھتیں؟"

"پہلے میرے سوال کا جواب دو۔ تم خدا پر یقین رکھتی ہو؟"

"ہاں۔" میں نے بحث کو مختصر کرنے کے لئے کہا۔

"اچھا۔ تو تم خدا کو خط لکھتی ہو؟"

عمارت کی روشنیاں بجھ گئیں۔ رات کو ہوا میں آنگن کے درخت سرسرا رہے تھے۔ کمرے کے دروازے پر پڑا ہوا سُرخ پھولوں والا پردہ ہوا کے جھونکوں سے پھڑپھڑائے جا رہا تھا۔ میں نے اُٹھ کر اسے ایک طرف سرکا دیا۔

"بہت خوب صورت پردہ ہے۔" میں نے پلنگ کی طرف

لوٹتے ہوئے اظہار خیال کیا۔ کارمن فرش پر کروٹ بدل کر آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ میری بات پر وہ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا ——— میں اور نکِ ایک مرتبہ پہاڑی علاقے میں کئی سو میل کی ڈرائیو کے لئے گئے تھے ——— سن رہی ہو ———؟"

"ہاں ——— ہاں ——— بتاؤ ———"

"راستے میں نکِ نے کہا کہ چلو ڈون ریموں سے ملتے چلیں۔ ڈون ریموں نکِ کے والد کے دوست اور کابینہ کے وزیر تھے۔ اور انہوں نے حال ہی میں اپنے ضلع کے پہاڑی مقام پر نئی کوٹھی بنوائی تھی۔ جب ہم لوگ ان کی کوٹھی کے نزدیک پہنچے تو سامنے سے سفید فراک پہنے بہت سی چھوٹی چھوٹی بچیاں اسکول سے نکل کر آتی دکھائی دیں۔ مجھے وہ منظر ایک خواب کی طرح یاد ہے۔ پھر ہم لوگ اندر گئے اور مسز ریموں کے انتظار میں ان کے شاندار ڈرائنگ روم میں بیٹھے۔ کیبنٹ منسٹر گھر پر موجود نہیں تھے۔ ڈرائنگ روم اور اسٹڈی کے درمیان جو دیوار تھی۔ اس میں شیشے کی ایک چوکور ڈبے ایسی کھڑکی میں پلاسٹک کی ایک بہت بڑی گڑیا سجی تھی جو کمرے کی نفیس آرائش کے مقابلے میں بہت بھدی معلوم ہو رہی تھی۔ ہم دونوں اس بدمذاقی پر چپکے سے

مسکرائے۔ پھر مسز ریمون برآمد ہوئیں۔ انہوں نے ہمیں ٹھنڈی چائے پلائی۔ اور سارا گھر دکھلایا۔ ان کے غسلخانے سیاہ ٹائل کے تھے اور مہمان کمرے کے نفیس "دیوان بیڈ" سُرخ پھولدار ٹیپیسٹری TAPESTRY کے جھالر والے غلافوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ان پلنگوں کو دیکھ کر نِک نے چپکے سے مجھ سے کہا تھا ——— "بدمذاقی کی انتہا" اور میں نے اپنے دل میں کہا تھا ——— کوئی بدمذاقی نہیں۔ میں تو اپنے گھر کے لئے ایسے ہی پلنگ خریدوں گی۔ اور اسی رنگ کے غلاف بنواؤں گی۔ اس کے بعد ——— میں جب بھی گھریلو ساز و سامان کی دوکانوں سے گزرتی تو اس کپڑے کو دیکھ کر میرے قدم ٹھٹھک جاتے ——— پھر میں نے تنخواہ میں سے بچا بچا کر اسی قیمتی کپڑے کا پردہ خرید لیا۔

"جب میں ایک مخصوص ریستوران کے آگے سے گزرتی ہوں ——— " وہ اسی آواز میں کہتی رہی "۔ اور شیشے کے دریچے کے قریب رکھی ہوئی میز اور اس پر جلتا ہوا سبز لیمپ نظر آتا ہے تو میرا دل ڈوب سا جاتا ہے۔ وہاں میں نے ایک شام نِک کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔"

مجھے نیند آ رہی تھی اور میں نِک کے اس وظیفے سے اُکتا چکی

تھی۔ میں نے مچھر دانی کے پردے گراتے ہوئے کہا "ایک بات بتاؤ تم کو اس قدر شدید عشق ہے اپنے اس نک سے تو تم نے اس سے شادی کیوں نہ کر لی۔ اب تک کیوں جھک مارتی رہیں؟"

"مجھے دس سال تک ایک دُور افتادہ جزیرے میں اپنے بابا کے ساتھ رہنا پڑا۔" اس نے اُداسی سے جواب دیا۔ "پہلے ہم لوگ اسی شہر میں رہتے تھے۔ جنگ کے زمانے میں بمباری سے ہمارا چھوٹا سا مکان جل کر راکھ ہو گیا اور میری ماں اور دونوں بھائی مارے گئے۔ صرف میں اور میرے بابا زندہ بچے۔ بابا ایک اسکول میں ٹیچر تھے۔ ان کو ٹی بی ہو گئی اور میں نے انہیں سینے ٹوریم میں داخل کر دیا جو بہت دور کے جزیرے میں تھا۔ سینے ٹوریم بہت مہنگا تھا۔ اس لئے کالج چھوڑتے ہی میں نے اسی صحت گاہ کے دفتر میں نوکری کر لی۔ اور آس پاس کے دولت مند زمینداروں کے گھروں میں ٹیوشن بھی کرتی رہی، مگر بابا کا علاج اور زیادہ مہنگا ہوتا گیا۔ تب میں نے اپنے گاؤں جا کر اناس کا آبائی باغیچہ رہن رکھ دیا۔ تب بھی بابا اچھے نہ ہوئے۔ میں ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے کشتی میں بیٹھ کر جاتی اور زمینداروں کے محلوں میں ان کے کند ذہن بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے تھک کے چور ہو جاتی۔ تب بھی بابا اچھے نہ ہوئے۔ نک

سے میری ملاقات آج سے دس سال قبل ایک فیسٹا (FIESTA) میں ہوئی تھی۔ اس دوران میں جب بھی میں دارالسلطنت آتی وہ مجھ سے ملتا رہتا۔ تین سال ہوئے اس نے شادی پر اصرار کیا۔ لیکن بابا کی حالت اتنی خراب تھی کہ میں ان کو مرتا چھوڑ کر یہاں نہ آسکتی تھی۔ اسی زمانے میں نِک کو باہر جانا پڑ گیا۔ جب بابا مر گئے میں یہاں آگئی ـــــ اب میں یہاں ملازمت کر رہی ہوں اور اگلے سال یونیورسٹی میں اپنا مقالہ بھی داخل کر دوں گی میں چاہتی ہوں کہ بابا کے کھیت بھی رہن سے چھڑا لوں۔ نِک میری مدد کرنا چاہتا تھا مگر میں شادی سے پہلے اس سے ایک پیسہ نہ لوں گی۔ اس کے خاندان والے بڑے بددماغ اور اکڑ فوں والے لوگ ہیں اور ایک لڑکی کے لئے اس کی عزتِ نفس بہت بڑی چیز ہے۔ عزتِ نفس اور خودداری اور خوداعتمادی۔ اگر مجھے کبھی یہ احساس ہو جائے کہ نِک بھی مجھے حقیر سمجھتا ہے ـــــ یا مجھے ـــــ سو گئیں ـــــ ؟ اچھا۔ گڈ نائٹ ـــــ "

دوسرے روز صبح وہ تیار ہو کر حسبِ معمول سب سے پہلے ناشتے کی میز پر انتظام کے لئے پہنچ چکی تھی۔ مسز سوریل گام واپس جا رہی تھیں۔ اپنے ہونے والے داماد سے ان کی صلح ہو گئی تھی۔ وہ سویرے ہی سے آن پہنچا تھا۔ وہ ایک منحنی سا نوجوان تھا اور برآمدے کے

ایک کونے میں بھیگی بلی بنا بیٹھا تھا۔ فضا پر عجیب سی بشاشت طاری تھی۔ لڑکیاں بات بات پر قہقہے لگا رہی تھیں۔ میں بھی بہت مسرور تھی اور خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ یہ ہلکے پھلکے پن اور مکمل امن و سکون کا شگفتہ احساس زندگی میں بہت کم آتا ہے اور صرف چند لمحے رہتا ہے مگر وہ لمحے بہت غنیمت ہیں۔

کارمن جلدی جلدی ناشتہ ختم کر کے دفتر چلی گئی۔

"آج بھی تم اپنے شاندار دوستوں سے ملنے نہ جا رہی ہو نہیں تو تم کو جیپنی (JEEPNEY) میں بٹھا کر شہر کے گلی کوچوں کی سیر کراتے —" مگدیلینیا نے مجھ سے کہا۔

"تمہارے لئے ایک کیڈی لیک آئی ہے بھئی۔" روزا نے اندر آ کر اطلاع دی۔

"کیڈی لیک —— !اوہ — !! کورس ہوا۔

"تمہارے لئے ایسی ایسی جغادری موٹریں آتی ہیں کہ ہم لوگوں کی رعب کے مارے گھگھی بندھ جاتی ہے!" برنارڈا نے خوشدلی سے اضافہ کیا۔ میں نے لڑکیوں کو خدا حافظ کہا اور اپنا سفری بیگ کندھے سے لٹکا کر باہر آ گئی۔ میں سابق سیفرڈ دن گارسیا ڈیل پریڈو کی کے وہاں دو دن کے لئے ان کے ہل اسٹیشن جا رہی تھی۔ ان کے

وردی پوش شوفر نے سیاہ کیڈی لک کا دروازہ مودبانہ بند کیا۔ اور کار شہر سے نکل کر سرسبز پہاڑوں کی سمت روانہ ہو گئی۔

پہاڑ کی ایک چوٹی پر ڈون گارسیا کا ہسپانوی وضع کا شاندار گھر درختوں میں چھپا دور سے نظر آرہا تھا۔ وادیوں میں کہرہ منڈلا رہا تھا اور سفید اور کاسنی اور زرد رنگ کے پہاڑی پھول سارے میں کھلے ہوئے تھے۔ کار پھاٹک میں داخل ہو کر پورچ میں رک گئی۔ قبائلی نسلوں والی شائستہ نوکرانیاں باہر نکلیں۔ بٹلر نے نیچے آکر کار کا دروازہ کھولا۔ ہال کے دروازے میں ڈون گارسیا اور ان کی بیوی ڈونا ماریا میرے منتظر تھے۔ ان کا گھر سفید قالینوں اور سنہرے فرنیچر اور انتہائی قیمتی سامان آرائش سے سجا ہوا تھا۔ اور اس طرح کے کمرے تھے جن کی تصویریں لائف میگزین کے رنگین صفحات پر "پیریڈ فرنیچر" یا "انٹیریر ڈیکوریشن" کے سلسلے میں اکثر شائع کی جاتی ہیں۔

کچھ دیر بعد میں ڈونا ماریا کے ساتھ اوپر کی منزل پر گئی۔ وہاں شیشوں والے برآمدے کے ایک کونے میں ایک نازک سی بید کی ٹوکری میں ایک چھ مہینے کی بے حد گلابی بچی پڑی پڑی غاؤں غاؤں کر رہی تھی۔ وہ بچی اس قدر پیاری سی تھی کہ میں ڈونا ماریا کی بات ادھوری چھوڑ کر سیدھی ٹوکری کے پاس چلی گئی۔ ایک بے حد حسین

صحت مند، تر و تازہ اور کمسن امریکن لڑکی نزدیک کے صوفے سے اٹھ کر میری جانب آئی اور مسکرا کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"یہ میری بہو ہے۔" ڈونا ماریا نے کہا۔

ہم تینوں ٹوکری کے گرد کھڑے ہو کر بچّی سے لاڈ پیار میں مصروف ہو گئے۔

دوپہر کو لنچ کی میز پر امریکن لڑکی کا شوہر بھی آگیا۔

"یہ ہمارا بیٹا ہوزے ہے۔" ڈون گارسیا نے کہا۔

ہوزے کی عمر تقریباً پینتیس سال کی رہی ہو گی۔ اپنی فوجی کرختگی کی ہلکے آبی رنگ کی قمیض اور سفید پتلون میں وہ خاصا وجیہہ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اپنی نوعمر بیوی کو بے انتہا چاہتا تھا اور بچّی پر عاشق تھا۔ زیادہ تر وہ اسی کی باتیں کرتا رہا۔

رات کو میں اپنی بے حد پُرتکلف اور بڑھیا خواب گاہ میں گئی جس کے ساز و سامان کو ہاتھ لگاتے فکر ہوتی تھی کہ کہیں میلا نہ ہو جائے۔ اس وقت مجھے "وائی ڈبلیو" کے سیلے ہوئے کمرے اور تنگ مچھردانی اور مسز سوریل اور ہال کی بدرنگ میز کرسیاں شدت سے یاد آئیں۔

دو دن بعد پریڈوس خاندان میرے ساتھ ہی دارالسلطنت واپس لوٹا۔

اپنے ماں باپ کو ان کے ٹاؤن ہاؤس میں اتارنے کے بعد ہوزے نے مجھے میری جائے قیام پر پہنچانے کے لئے کیڈی لیک دوبارہ اسٹارٹ کی۔ ہوزے اور اس کی بیوی ڈورَوتھی صرف دو ہفتے قبل امریکہ سے لوٹے تھے۔ ان کا بہت سا سامان کسٹم ہاؤس میں پڑا تھا جسے چھڑانے کے لئے انہیں جانا تھا۔

شہر کے سب سے اعلیٰ ہوٹل کے سامنے ہوزے نے کار روک لی۔

"یہاں کیا کرنا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"تم یہیں ٹھہری ہو نا؟"

"نہیں۔ ڈیئر ہوزے۔ میں وائی ڈبلیو اے میں ٹھہری ہوں۔"

"وائی ڈبلیو — ؟ گُڈ گاڈ! کمال ہے۔ اچھا۔ وہیں چلتے ہیں۔ مگر کیا تم کو یہاں جگہ نہ مل سکی؟ تمہیں چاہیئے تھا کہ آتے ہی ڈیڈی کو اطلاع دیتیں۔

اس وقت مجھے دفعتاً خیال آیا کہ میں ہر طبقے اور ہر قسم کے لوگوں کو اپنی افتادِ طبع کے ذریعے کم از کم اپنی حد تک ذہنی طور پر ہموار کرتی چلی جاتی ہوں۔ مگر ہوزے اور اس کے والدین اس ملک کے دس دولت مند ترین خاندانوں میں شامل تھے۔

اور یہاں کے حکمران طبقے کے اہم ستون تھے۔ اور ان لوگوں کو یہ سمجھانا بالکل بے کار تھا کہ مجھے وائی ڈبلیو کیوں اتنا اچھا لگا ہے اور میں وہاں ٹھہرنے پر کیوں اس قدر مصر ہوں۔

ہوزے نے گلی کے نکڑ پر کار روک لی۔ کیونکہ "جیپیوں" کی ایک قطار نے سارا راستہ گھیر رکھا تھا۔ میں جب وائی ڈبلیو کے اندر پہنچی تو سب لوگ سو چکے تھے۔ میں چپکے سے جا کر اپنی مچھر دانی میں گھس گئی۔ کارمن حسبِ معمول فرش پر سکون کے ساتھ سو رہی تھی۔ اس کے سرہانے سانتو طوماس کی تصویر پر گلی کے لیمپ کا مدھم عکس جھلملا رہا تھا۔

صبح چار بجے اٹھ کر میں دبے پاؤں چلتی شکستہ غسلخانے میں گئی اور آہستہ سے پانی کا نل کھولا۔ مگر پانی کی دھار اس زور سے نکلی کہ میں چونک پڑی۔ اسی طرح چپکے چپکے کمرے میں آ کر میں نے اسباب باندھا تا کہ آہٹ سے کارمن کی آنکھ نہ کھل جائے۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ وہ فرش پر سے غائب۔ کچھ دیر بعد اس نے آ کر کہا "ناشتہ تیار ہے" وہ ٹیکسی کے لئے فون بھی کر چکی تھی۔

"کیسا سفر رہا؟" اس نے چائے انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

"بہت دلچسپ۔"

"یہ تمہارے دوست کون لوگ تھے جہاں تم گئیں تھیں؟ تم نے بتایا ہی نہیں۔"

میں بات شروع کرنے ہی والی تھی کہ مجھے اچانک ایک خیال آیا۔ میں نے جلدی سے کمرے میں جاکر سوٹ کیس کھولا۔ اور ایک نئی بنارسی ساری نکال کر ایک پرچے پر لکھا —— "تمہاری شادی کے لئے پیشگی تحفہ ——" اور ساری اور پرچہ کارمن کے تکیئے کے نیچے رکھ دیا۔

"ٹیکسی آگئی۔" کارمن نے برآمدے میں سے آواز دی۔

ہم دونوں سامان اٹھاکر باہر آئے۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ اتنے میں کارمن پھاٹک کی کھڑکی میں سے سر نکال کر چلائی

"ارے تم نے اپنا پتہ تو دیا ہی نہیں۔" میں نے کاغذ کے ٹکڑے پر اپنا پتہ گھسیٹ کر اسے تھما دیا۔ پھر مجھے بھی ایک بے حد ضروری بات یاد آئی "ارے ہاں کارمن تمہاری وائی ڈبلیو نے مجھے اپنا بل نہیں دیا۔"

"بکو مت۔"

"ارے۔ یہ تمہارا نجی گھر تو نہیں ہے۔"

"تم میری مہمان تھیں۔"

"بکومت۔"

"تم خود مت بکو۔ اب بھاگو ورنہ ہوائی جہاز چھوٹ جائے گا۔ اور دیکھو جب میں شادی کارڈ بھیجوں تو تم کو آنا پڑے گا۔ میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔ ذرا سوچو نک تم سے مل کر کتنا خوش ہوگا۔"

مگر ہم دونوں کو معلوم تھا کہ میرا دوبارہ اتنی دور آنا بہت مشکل ہے۔

"خدا حافظ کارمن۔" میں نے کہا۔

"خدا حافظ ——!" وہ کھڑکی میں سے سر نکال کر بہت دیر تک ہاتھ ہلاتی رہی۔ ٹیکسی صبح کاذب کے دھندلکے میں ایرپورٹ روانہ ہوگئی۔

ہوائی جہاز تیار کھڑا تھا۔ میں کسٹم کاؤنٹر پر سے لوٹی تو پیچھے سے ڈون گارسیا کی آواز آئی —— "نک —— میں ذرا سگار خرید لوں۔"

"بہت اچھا ڈیڈی —— یہ ہوزے کی آواز تھی۔

میں چونک کر پیچھے مڑی۔ ہوزے مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا۔

"دیکھو۔ ہم لوگ کیسے ٹھیک وقت پر پہونچے!"

"ہوزے ——" میں نے ڈوبتے ہوئے دل سے پوچھا ——

"تمہارا دوسرا نام کیا ہے؟"

"نِک ـــــ ڈیڈی جب بہت لاڈ میں آتے ہیں تو مجھے نِک پکارتے ہیں۔ ورنہ عام طور پر میں ہوزے ہی کہلاتا ہوں۔ کیوں ـــــ؟"

"کچھ نہیں ـــــ" میں اس کے ساتھ ساتھ لاؤنج کی طرف چلنے لگی۔ "تم ـــــ تم امریکہ کیا کرنے گئے تھے؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہارٹ سرجری میں اسپیشلائیز کرنے ـــــ تمہیں بتایا تو تھا۔ کیوں؟"

"تم ـــــ کبھی تم نے ـــــ تم نے ـــــ"

"کیوں ـــــ؟ کیا ہوا ـــــ؟ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں ـــــ" میری آواز ڈوب گئی۔ لاؤڈ سپیکر نے یکسانیت سے دُہرانا شروع کیا ـــــ "پیَن امریکن کے مسافر ـــــ پیَن امریکن کے مسافر ـــــ"

"ارے ـــــ! روانگی کا وقت اتنی جلدی آگیا؟" ہوزے نے تعجب سے گھڑی دیکھی۔ ڈون گارسیا سگار خرید کر شفقت سے مسکراتے میری طرف آئے۔ میں نے دونوں باپ بیٹوں کا شکریہ ادا کیا۔ انہیں خدا حافظ کہا اور تیزی سے مسافروں کی قطار میں جا ملی۔

دوڑتے ہوئے طیارے کی کھڑکی میں سے میں نے دیکھا۔ ڈون گارسیا اور نِک نیچے ریلنگ پر جھکے رومال ہلا رہے تھے طیارے نے

زمین سے بلند ہونا شروع کر دیا۔

یہاں سے بہت دُور۔ خطرناک طوفانوں سے گھرے ہوئے پوربی سمندر میں ہرے بھرے جزیروں کا ایک جھنڈ ہے جو فلپائن کہلاتا ہے۔ اس کے جاگتے جگمگاتے دارالسلطنت منیلا کے ایک بے رنگ سے محلے کی ایک شکستہ عمارت کے اندر ایک بے حد چپٹی ناک اور فرشتے کے سے معصوم دل والی فلپینو لڑکی رہتی ہے۔ جو اپنے بچے کے لئے کھلونے جمع کر رہی ہے اور اپنے خدا کی واپسی کی منتظر ہے جس کی ذات پر اسے کامل یقین ہے۔

اکثر اس طرح سے بھی رقصِ فغاں ہوتا ہے

رات گئے، شہر کے نیلگوں اندھیرے میں دور کہیں ایک سُریلی دل دوز پاٹ دار آواز بلند ہوتی ہے "کبھی ہم میں..... تم میں بھی راہ تھی..... تمہیں یاد ہو..... اجی کہ نہ یاد ہو....." رفتہ رفتہ یہ صدا دور ہوتی ہے اور بخن میاں اپنے خوبصورت گھر کی آرام دہ خواب گاہ میں پلنگ پر کروٹ بدل لیتے ہیں اور چُپ چاپ پڑے دیوار کو تکتے رہتے ہیں۔ بخن میاں کی چہیتی بیوی رقیہ بچے کے رنگین گجراتی پنگوڑے کی ڈوری پر ہاتھ رکھے سو جاتی ہے۔ کلاک کی ہری سطح پر سفید سوئی آگے سرکتی رہتی ہے۔ رات یوں ہی گزر جائیگی۔

بخن میاں لیڈر، فلسفی، شاعر، ادیب، انٹیلکچول، ہیرو، کچھ بھی

نہیں ہیں، بے حد معمولی، غیر معروف، سیدھے سادے آدمی ہیں، مگر کیا ایک سیدھا سادا آدمی زندگی کی ناقابلِ فہم بھول بھلیاں پر غور نہیں کر سکتا؟ بخن میاں ایک مرنجان مرنج انسان ہیں (ان کا اصلی نام جان کر کیا کیجئے گا)، اٹھارہ سال سے بمبئی میں ملازم ہیں۔ ماموں کی بیٹی سے بیاہ ہوا ہے۔ تین بچے ہیں۔ بڑا لڑکا علی گڑھ میں پڑھ رہا ہے۔ منجھلی لڑکی میٹرک میں ہے۔ چھوٹا بچہ ابھی شیر خوار ہے۔ بخن میاں کا بقیہ کنبہ "وطن" یعنی شمالی ہند میں رہتا ہے۔ دو سال میں ایک بار جا کر وہ سب مل آتے ہیں۔ زندگی آرام سے کٹ رہی ہے۔ بخن میاں ان لاکھوں انسانوں میں سے ہیں جو صبح کو بسوں اور لوکل ٹرینوں میں بیٹھے دفتر جاتے نظر آتے ہیں۔ شام کو سینما دیکھ لیتے ہیں اور اتوار کے روز بیوی بچوں کے ساتھ آرے کولونی کی سیر کر آتے ہیں۔ بخن میاں کی زندگی کی کہانی میں کوئی خاص بات نہیں مگر بہرحال......

بخن میاں جب آج سے اکیس سال پہلے علی گڑھ میں پڑھتے تھے تو ایک بار گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے اپنے ماموں کے ہاں رائے بریلی چلے گئے۔ ماموں کی لڑکی رقیہ سے ان کی ٹھیکرے کی مانگ تھی اور وہ ان سے سخت پردہ کرتی تھی۔ بخن میاں اس رشتے

سے بہت خوش تھے اور آج بھی خوش ہیں، اور وہ بیس سال کی رفیق اس کھڑکی کے نیچے بستر پر لیٹی غنودگی کے عالم میں بچے کا گجراتی پالنا جھلا رہی ہے۔ باہر ناریل کے پتے سرسرا رہے ہیں۔ دیوالی آنے والی ہے۔ محلے کے بچے "ایٹم بم" چلاتے چلاتے تھک کر اپنے اپنے گھروں میں سو چکے ہیں۔ رات بڑی سنسان ہے۔ اتنے بڑے بھیانک پرچھائیوں کے شہر کو سانپ سونگھ گیا ہے۔

بجن میاں کے ماموں کی کوٹھی رائے بریلی کی سول لائنز میں تھی۔ (ماموں سب جج تھے اور حال ہی میں تبدیل ہو کر لکھیم پور کھیری سے رائے بریلی آئے تھے) رقیہ نے پردہ کر کر کے بور کر رکھا تھا اور ماموں کے باقی بچے خورد سال تھے۔ بجن میاں جب گھر میں پڑے پڑے اُکتا جاتے تو سائیکل اُٹھا کر سایہ دار سڑکوں پر سے گزرتے دیہات کی طرف نکل جاتے اور سنسان راستوں پر پہنچ کر اونچی آواز میں گانا شروع کر دیتے۔ انہیں موسیقی کی دھت تھی۔ علی گڑھ کی نمائش میں اکثر لاؤڈ سپیکر پر گایا کرتے تھے۔ کلاسیکل میوزک بھی سیکھ رکھی تھی۔

ایک روز بجن میاں اسی طرح سائیکل پر ہوا خوری کرتے، ہشاش بشاش تر و تازہ شہر سے بہت دُور آموں کے باغ میں پہنچ گئے۔ بادل

گھر آئے تھے اور بارش آنے والی تھی۔ بجن میاں سائیکل سے اتر کر ستانے کے لئے باغ کی سمت بڑھے۔ وہاں انہیں ایک پرانی باؤلی نظر آئی۔ باؤلی کی منڈیر پر ایک بہشتی چپ چاپ اکڑوں بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ نزدیک ہی برگد کے نیچے کسی فقیر کا تکیہ تھا اور ایک بزرگ کھاٹ پر بیٹھے کبوتروں کو دانہ ڈال رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر نیا پختہ کنواں تھا اور رہٹ چل رہا تھا۔

باؤلی کے قریب پہنچ کر بجن میاں نے ارادہ کیا کہ بہشتی سے ایک کٹورا پانی مانگیں کہ اچانک آم کے جھنڈ میں سے کوئل کی کوک جیسی ایک آواز بلند ہوئی اور رام پوری چاقو کی طرح سیدھی ان کے دل میں اترتی چلی گئی۔ اور وہ گیت بھی کیا تھا —— دقیانوسی "چھارہی کالی گھٹا..... جی ہاں..... چھارہی کالی گھٹا........ جیا مورا لہرائے ہے۔"

بجن میاں نے مبہوت ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ سوتے سوتے بھیگے بھیگے سناٹے میں باغ کے پتے پتے کو نیند سی آرہی تھی۔ بجن میاں نے آہستہ آہستہ شروع کیا۔ جدھر سے گیت کی آواز بلند ہو رہی تھی —— باؤلی اور پگڈنڈی کے درمیان ایک ہری بھری کھائی سی تھی جس میں جولائی کے پودے اُگ آئے تھے۔ کھائی کی

دوسری طرف سنسان کچی سڑک کے کنارے ایک بھورا مکان کھڑا تھا۔ مکان کے پچھواڑے کی دیوار سڑک کے رُخ پر تھی۔ اس دیوار میں کائی لگے پرنالوں کے درمیان چار ہرے روشندان نظر آرہے تھے۔ باہر سے صرف یہ روشندان ہی دکھائی دیتے تھے —— جس طرح ہمیں کبھی نہیں معلوم ہو سکتا کہ دوسرے انسانوں کی زندگیوں کے اندر کیا کچھ گزرتا رہتا ہے۔

گیت اسی روشندانوں والے کمرے میں گایا جا رہا تھا۔ کمرے کی کھڑکی اور دروازہ پہلو میں ایک شکستہ چبوترے پر کھلتا تھا۔ دروازے پر چق پڑی تھی۔ چبوترے کے برابر آنگن کی اونچی دیوار تھی اور ڈیوڑھی۔ ذرا فاصلے پر احاطے کے کچے، نم صحن کے ایک کونے میں شاگرد پیشہ تھا۔ اس کے صحن کی اینٹوں کی دیوار پر باہر ایک مشک کھونٹی پر ٹنگی تھی۔ دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا۔ صحن کے اندر بٹول کی نارنگیوں کا پیڑ کھڑا تھا۔ احاطے کے پیچھے آم کا گھنا باغ تھا۔

گیت دفعتاً تھم گیا۔ چند لحظوں بعد گانے والی نے ایک اور دقیانوسی غزل شروع کر دی جو ایک زمانے میں گلی کے لونڈے گاتے پھرتے تھے۔ "وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا...... اجی تمہیں

یاد ہو کہ نہ یاد ہو ...... وہی یعنی وعدہ ...... ارے ہاں نباہ کا ...."

بخن میاں ٹھٹھک کر سُنا کیے ۔

"وہ جو مجھ پہ تھے بیشتر، وہ کرم کہ تھا مرے حال پر ـــ مجھے

سب ہے یاد ذرا ذرا ..... تمہیں یاد ہو اجی کہ نہ ....."

گھٹائیں جھوم کر اُٹھیں اور چھما چھم مینہ برسنا شروع ہو گیا۔

بخن میاں گھبرا کر چھتنار درخت کے نیچے ہو لئے۔

"سنو ذکر ہے کئی سال کا کیا ایک آپ نے وعدہ تھا ......

سو نباہنے کا تو ذکر کیا ..... تمہیں یاد ....."

"حق اللہ!" درگاہ کی طرف سے جگر پاش نعرہ بلند ہوا بخن میاں نے چونک کر اس طرف دیکھا، اور پھر بھورے مکان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم میں تم میں بھی راہ تھی..."

بھورا مکان، ہرے روشن دان اندھی آنکھوں کے ایسے، بٹرول کی نارنگیوں کا پیڑ، آم کے جھنڈ، باؤلی اور تکیہ اور برگد ـــ

سب ایک ناقابلِ برداشت نحوست، ویرانی اور الم کی دُھند میں لپٹے پانی میں بھیگا کیے ـــ

"کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو......

جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا......"

بارش کا زور ذرا کم ہوا۔ بجن میاں سر جھکائے سائیکل کی طرف بڑھے اور سول لائنز روانہ ہو گئے۔

رات بھر وہ آواز بجن میاں کے حواس پر چھائی رہی۔ دوسرے روز سہ پہر کو انہوں نے پھر اس گاؤں کا رُخ کیا۔ آدھے راستے میں انہیں بارش نے آلیا۔ بجن میاں بھیگتے بھاگتے باؤلی پر پہنچے۔ سامنے مکان خاموش پڑا تھا۔ نہ بہشتی، نہ کبوتر والے بزرگ۔ نہ وہ اُلوہی کی آواز۔ ہو کا عالم طاری تھا۔ میاں پسینہ پسینہ ہو گئے۔ اب ان پر انکشاف ہوا کہ وہ اس آواز پر عاشق ہو گئے ہیں۔ مُغنّیہ کون ہے۔ اس سے ان کو کوئی غرض نہ تھی۔ گرہستن ؟ پُتریا۔ میراسن یا ڈومنی ؟—— بجن میاں حیران پریشان باؤلی کی منڈیر پر بیٹھے رہے اور گھنٹہ بھر بعد بے نیل و مرام واپس آگئے۔

تیسرے روز سہ پہر کو بجن میاں گانا سُننے کی اُمید میں پھر وہاں جا پہنچے۔ جی میں سوچ لیا تھا کہ اگر کسی نے پوچھا کہ روز کیوں آتے ہو تو کہہ دیں گے درگاہ پر منّت ماننے آتے ہیں۔ اتنے میں گانے کی آواز پھر بلند ہوئی۔ سنگیت کے سچے رسیا بجن میاں بے اختیار کھنچے ہوئے جا کر مکان کی دیوار کے نیچے جا کر کھڑے ہو گئے۔

لڑکی نے انترہ اُٹھایا تو بجن میاں جھنجھلا گئے ——— لڑکی گوڑ سا رنگ کا پٹڑا لئے دے رہی تھی۔ "بی بی ماتیبر لگاؤ ——— تیبرا" انہوں نے ڈپٹ کر کہا۔

اس ڈانٹ پر کھڑکی کا ذرا سا پٹ کھلا، دو بڑی بڑی سیاہ آنکھوں نے درز میں سے جھانکا اور پٹ زور سے بند ہو گیا۔ خاموشی چھا گئی

بجن میاں نے ذرا نڈر ہو کر آہستہ سے دستک دی۔ "بی بی قدرت نے تمہارے گلے میں نور بھر دیا ہے۔ بس ذرا سرگم پر محنت کر ڈالو ———" انہوں نے بڑے خلوص سے مشورہ دیا۔

کوئی جواب نہ ملا۔ بجن میاں چند منٹ تک دیوار کے نیچے کھڑے رہے۔ پھر باؤلی کی سمت چل پڑے۔ ایک بار پلٹ کر دیکھا کھڑکی بدستور بند تھی۔ ٹاٹ کا پردہ اُٹھا کر بہشتی شاگرد پیشے سے نکلا اور باؤلی پر آ کر ڈول اُٹھانے میں مصروف ہو گیا۔

"سلام علیکم"۔ بجن میاں نے کہا۔

"وا لیکم سلام"۔ بہشتی نے جواب دیا۔ اس کی دونوں ہتھیلیاں اور ساری انگلیاں زخمی تھیں اور زخم بہت بھیانک معلوم ہو رہے تھے۔

"تمہارے ہاتھوں کو کیا ہو گیا ہے میاں بہشتی"۔ بجن میاں نے

سگریٹ جلاتے ہوئے پوچھا۔ قریب کے کنویں کا پانی شررشرر کرتا شفاف نالیوں میں سے گزر کر باغ میں جا رہا تھا۔

"ساری عمر رسّے کی رگڑ لگتی رہتی ہے میاں" بہشتی نے چرخی پر سے رسّہ کھینچ کر ڈول باہر نکالتے ہوئے بے نیازی سے جواب دیا، اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو غور سے دیکھا۔ گویا پہلی بار اپنے زخم اسے نظر آئے ہوں۔ اس کے بعد اس نے بجن میاں پر نظر ڈالی "میاں آپ تو کل پرسوں بھی اِدھر آئے تھے۔ کیا کام ہے؟"

"کچھ نہیں ـــــ میں نے سنا تھا یہ ـــــ یہاں درگاہ پر ایک شاہ صاحب رہتے ہیں ـــــ"

"ہاں۔ ہاں ـــــ حاجی کبوتر شاہ۔ وہ سامنے بیٹھے ہیں چھپر تلے ـــــ چلے جائیے۔ مگر آج کون دن ہے ـــــ جمعرات؟ وہ آج کسی سے بولتے چالتے نہیں۔ اذکار کے بعد سیدھے مراقبے میں چلے جائیں گے ـــــ" بہشتی نے مشک بھری۔ اُسے پھرتی سے پیٹھ پر لادا اور سیڑھیاں اُترنے لگا۔ بجن میاں کی ہمت نہ پڑی کہ اس مکان کے باسیوں کا کچھ اتہ پتہ لگا سکیں۔ بہشتی بھورے مکان کی طرف بڑھ گیا۔ بجن میاں جھنجھلاتے ہوئے نکّڑ کی طرف

بڑے۔ شاہ صاحب منڈیر پر بیٹھے تسبیح پھیر رہے تھے۔ بجن میاں قریب جا کر بظاہر بڑی عقیدت سے سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ شاہ صاحب تسبیح پھرایا کئے۔ بجن میاں عاجز آ کر کچھ دیر بعد گھر لوٹ آئے۔

چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں۔ دو تین روز بعد بجن میاں پھر آم کے باغ پہنچے (اس گاؤں کا نام کریم گنج تھا۔) اور مکان کے نیچے جا کر سائیکل کی گھنٹی بجائی۔ کھڑکی ذرا سی کھلی اور پھر بند ہو گئی۔ عجیب بات تھی۔ کیا اس مکان میں بھوت رہتے تھے؟ کوئی آدم زاد نظر ہی نہیں آتا تھا —— بجن میاں آخر علی گڑھ کے کھلنڈرے تھے۔ کھڑکی کے قریب جا کر کہا۔

"بی بی ہم تمہاری آواز کے مرید ہیں۔ ایک گلاس پانی بھجوا دو۔"

"اِدھر دروازے پر آجایئے۔" اندر سے جواب ملا۔

بجن میاں گھوم کر دروازے پر پہنچے۔ کواڑ ذرا سا کھلا۔ مراد آبادی کٹورا سرکا کر باہر رکھ دیا گیا۔ بجن میاں ہاتھ تک کی جھلک نہ دیکھ سکے۔ پانی پی کر انہوں نے پوچھا۔ "گھر میں اور کون کون رہتا ہے؟"

"ابا اماں ہیں —— اور کون ہوتا؟"

"تمہارا نام کیا ہے بی بی؟"

"جمال آرا۔" ساتھ ہی تلخ ہنسی۔

"گانا کس سے سیکھتی ہو؟"

"کسی سے بھی نہیں، مجھے گانا سکھانے کون آئے گا؟"

"گھر میں گراموفون ہے؟"

"ہے ——— ٹوٹا پھوٹا، اللہ مارا۔"

"تمہیں جو ریکارڈ چاہیئے ہوں، بتا دو میں لا دوں گا" ———

"کیا کیجئے گا ریکارڈ لا کر ———"

"تمہارے ابا کیا کرتے ہیں؟"

"ابا ——— ؟ چنگی میں منصرم تھے، فالج گر گیا۔ کھاٹ پر پڑے ہیں۔"

"بہن بھائی ——— ؟"

"دو بھائی تھے۔ خدا گنج گئے۔ بہن کوئی نہیں، بس میں ہی ہوں، خدا ماری۔"

اس ویرانے میں کون جوان لڑکی اپنی زندگی سے نالاں نہ ہوگی بجن میاں نے دل میں سوچا۔ بارش تھمی کھڑی تھی۔ وہ لڑکی کو خدا حافظ کہہ کر اور اس کے چہرے کی ذرا سی جھلک بھی دیکھے بغیر جلدی سے سائیکل سنبھال کر گھر بھاگے۔ دوسرے روز وہ لکھنؤ گئے اور امین آباد سے اپنی پسند کے چند ریکارڈ خرید کر واپس رائے بریلی پہنچے ——— ریکارڈوں کا ڈبہ کیریر سے باندھ کر پہنچے

سیدھے کریم گنج ـــــ منصرم صاحب کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

دروازہ ذرا سا کھُلا۔ چوڑیوں کی جھنکار سُنائی دی۔ بجن میاں نے ریکارڈوں کا ڈبہ اندر سرکا دیا۔ جمال آراء بے حد ممنون معلوم ہوئی ـــــ بجن میاں کو ایسا لگا جیسے اس لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں کیونکہ جب وہ بولی تو اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

"شکریہ" اس نے کہا تھا۔

"تمہارے والدین کچھ کہیں گے تو نہیں؟"

"کچھ نہیں کہیں گے"۔ جمال آراء نے بلا جھجک جواب دیا ـــــ اور بجن میاں کو ذرا تعجب ہوا۔ چند لمحوں تک خاموش رہنے کے بعد انہوں نے پوچھا۔ "تم بے حد سخت پردہ کرتی ہو؟"

"جی ہاں"۔ جمال آراء نے اسی بے حد رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اب ایسا معلوم ہوا جیسے وہ چُپکے چُپکے سسکیوں سے رو رہی ہو۔

"اچھا تو میں کنوئیں پر جا کر بیٹھتا ہوں، تم کچھ گاؤ، میں صرف تمہاری آواز سُننا چاہتا ہوں"۔

"کیا گاؤں؟" جمال آراء نے فرمانبرداری سے پوچھا۔

"جو دل چاہے"۔ بجن میاں نے کہا اور سر جھکائے کنوئیں پر چلے گئے۔

"تجھے ہو سیرِ چمن مبارک، مگر یہ رازِ چمن بھی سن لے
کلی کلی خون ہو چکی تھی شگفتِ گل ہائے تر سے پہلے"

لڑکی نے اس طرح اچانک گانا شروع کر دیا، جیسے گراموفون ریکارڈ پر سوئی رکھ دی جائے۔ برگد تلے کبوتر شاہ آنکھیں بند کر کے جھومنے لگے۔ ان کے دو دیہاتی مرید چولہے پر ان کے افطار کے لئے زردہ تیار کرنے میں مصروف تھے۔ کیونکہ کبوتر شاہ سال کے بارہ مہینے روزہ رکھتے تھے۔ برسات کی بھیگی فضا میں بھیگا بھیگا دھواں اوپر اٹھتا رہا۔ بہشتی نے اپنے دروازے سے سر نکالا اور پھر اندر غائب ہو گیا۔ باغ میں کوئل زور سے کوکی۔ جمال آرا کی آواز ہرے روشندانوں والے کمرے سے بلند ہو کر سارے باغ میں پھیل گئی۔ کڑے کمان کے تیر ایسی آواز موسم برشگال کی دھندلی، سیال آوازوں پر حاوی آ گئی۔

کہاں کہاں اُڑ کے پہنچے شعلے یہ ہوش کس کو یہ کون جانے
ہمیں بس اتنا ہے یاد اب تک لگی تھی آگ اپنے گھر سے پہلے

مرید چولہا سلگاتے آپس میں باتیں کرنے لگے۔

"جمالا بٹیا شاہ صاحب کے لئے کھیر دے گئی ہیں۔" ایک مرید نے تام چینی کی رکابی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"سویرے بجار گئی تھیں۔ بندو خاں کے ساتھ لالہ کی دوکان پر

کھڑی رو رہی تھی۔ لالہ نے ان کا طوق بھی مار لیا۔ دے سود پر سود، دے سود پر سود۔ اللہ کی سان ہے۔"

"ہاں پھجو بھائی۔ اللہ کی سان ہے۔"

بخن میاں غور سے سننے لگے۔ وہ تو کہہ رہی تھی کہ سخت پہرے ہیں رہتی ہے۔ اور نہ جانے یہ لالہ کی دوکان اور سود کا کیا قصہ تھا؟۔

"یہ نالہ کیوں ہے، یہ نغمہ کیوں ہے یہ آہ کیسی یہ واہ کیسی
یہ پوچھ لے آئینے کے دل سے، نہ پوچھ اپنے جگر سے پہلے

دفعتاً بخن میاں کا جی بھر آیا وہ جلدی سے سائیکل کی طرف لپکے اور گھر جاتے ہوئے طے کر لیا کہ اب کریم گنج اور اس المناک ماحول کا رُخ نہ کریں گے۔ آدمی کے لئے اپنی پریشانیاں ہی کیا کم ہیں جو پرائے دکھ بھی سمیٹ لئے جائیں۔ جانے کیا جھمیلا ہے کیا نہیں۔ مگر یہ آواز ہمیشہ یاد رہے گی۔

دوسرے روز بخن میاں کے والدین شادی کی تاریخ مقرر کرنے علی گڑھ سے رائے بریلی آ گئے۔ بڑا ہنگامہ اور چہل پہل رہی۔ ہفتہ بھر بعد علی گڑھ روانہ ہونے سے پہلے وہ آخری بار کریم گنج گئے۔ باغ پر حسبِ معمول سناٹا طاری تھا، جس میں ڈول سے پانی گرنے، رہٹ چلنے اور نالیوں میں پانی بہنے کی مدھم آوازیں سرسرا رہی تھیں

بھورے مکان کی ڈیوڑھی پر یکہ کھڑا تھا۔ ایک چار سالہ بچّی سُرخ غرارہ پہنے بڑے سلیقے سے منڈھا ہے ڈیوڑھی کے اندر جا رہی تھی۔ بہشتی کے دروازے پر چند عورتیں کھڑی تھیں۔

چند منٹ بعد ایک باریش بزرگ میلی سی شیروانی پہنے بھورے مکان کے اندر سے نکلے اور یکہ پر بیٹھ گئے۔ یکہ کچّی سڑک پر ہچکولے کھاتا ہوا بڑھ گیا۔ تو بہشتی ڈیوڑھی سے برآمد ہوا۔ اس کی نظر بجن میاں پر پڑ گئی جو برگد تلے دل گرفتہ سے کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ بہشتی بڑبڑاتا ہوا ان کی جانب آیا۔

"سلامالے کُم" اس نے درشتی سے کہا۔

"سلاں علیکم" بجن میاں نے علی گڑھ کے انداز میں جواب دیا۔

"آیئے بیٹھئے میاں" بہشتی نے اپنے گھر کے سامنے پڑی ہوئی کھاٹ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ بجن میاں اس کے ہمراہ چلتے ہوئے آ کر کھاٹ پر بیٹھ گئے۔

"آپ روج روج جمالا بٹیا کا گانا سُننے اتنی دور سے آتے ہیں" بہشتی نے چلم سلگاتے ہوئے کہا۔ بجن میاں کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ کبوتر شاہ کا ایک مرید سر کھجاتا آ کر کھاٹ کی پائنتی بیٹھ گیا۔ تکیئے کے چھپر پر کبوتروں نے غٹر غوں غٹر غوں کر کے مارے ایک

آفت مچا رکھی تھی۔

"حکیم صاحب کا کہت رہے ہے؟" مُرید نے بہشتی سے پوچھا۔

"حالت ناجک ہے" بہشتی نے جواب دیا اور سر اٹھا کر بٹول کے سنتروں کی ڈالیوں کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے ماتھے پر انگلی دو دفعہ بجائی "مکدر۔ مکدر کے آگے جمن بھائی کسی کی نہیں چلتی"۔

مرید نے لمبا سانس لے کر زور سے نعرہ لگایا "اللہ ہو ———"

بجن میاں لرز گئے۔

"کیا ہوا۔ خیریت ہے؟" انھوں نے بہشتی سے سوال کیا۔

"کھیریت ——— ؟ ارے چل چلاؤ ہے۔

"کس کا؟"

"منھرم صاحب کا۔ اور کس کا۔ اب آگے اللہ کا نام ہے"۔

"چل چلاؤ ہے۔ سب کا چل چلاؤ ہے"۔ مرید نے آنکھیں بند کر کے ذرا جھومتے ہوئے زیرلب دہرایا۔

بہشتی نے دفعتاً سر اُٹھا کر کہا "جائیے میاں۔ آپ اپنے گھر جائیے"۔

"بندو خاں"۔ مکان کے صحن میں سے ایک عورت نے پکارا۔

"اے تم پر اللہ کی سنوار۔ سارے گھڑے خالی پڑے ہیں، اور تم بیٹھ گئے مسکوٹ کرنے"۔

بہشتی نے کھاٹ سے اُٹھ کر دیوار پر ٹنگی ہوئی مشک اُتاری اور بجن میاں پر نظر ڈالے بغیر پھرتی سے باؤلی کی سمت چل دیا۔

بجن میاں نے گھڑی دیکھی ٹرین کا وقت قریب تھا۔ انھوں نے ایک بار بند کھڑکی اور بہرے روشندانوں پر نظر ڈالی اور سائیکل پر سوار ہو گئے —— تم جو کچھ بھی ہو اور جو کوئی بھی ہو۔ بے چاری بچی۔ اللہ کے حوالے۔ انھوں نے دل میں کہا اور تیزی سے سائیکل چلاتے ریلوے بریلی جانے والی سڑک پر آ گئے۔

بجن میاں کو اس وقت یہ احساس اتنی شدت سے نہ ہوا تھا۔ کہ وہ جو کوئی بھی اور جو کچھ بھی اس کی انھوں نے اس سمے کوئی مدد کیوں نہ کی۔ پشیمانی اور جرم کا یہ احساس عمر پختہ ہونے پر، زمانے کے نشیب و فراز دیکھنے کے بعد ان کو ستانے والا تھا۔ بجن میاں کی شادی ہو گئی کچھ عرصے بعد بمبئی میں ملازمت مل گئی اور وہ بیوی سمیت وہاں آ گئے، اور یہاں ہنسی خوشی رہتے ہیں۔ انھوں نے کسی سے اپنے اس احساسِ جرم کا ذکر نہیں کیا۔ رضیہ سے بھی نہیں۔ شریف اور نیک دل ہونا بھی ایک عذاب ہے۔

اتنے عرصے بعد، ایک ہفتے سے بجن میاں کو یہ آواز روزانہ رات کو خواب میں سنائی دے رہی تھی۔ آج رات وہ جاگ اٹھے اور

چونک کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ جہاں خاموش سڑک کی نیلی روشنی میں درختوں کے پتے جھلملا رہے تھے۔ دو رویہ عمارتیں خوابیدہ تھیں دلگشن ہند ریستوران شیریں کھمباٹا ہاؤس، نور بائی بلڈنگ، جیٹ پٹ ڈرائی کلینرز، سارا شہر، لیمپوں کے ان کھمبوں کے نیچے، اکثر رات کو کوچہ گرد گوییے آکر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہارمونیم، دو تارہ اور وائلن بجا بجا کر بھیک مانگتے ہیں۔ بجن میاں بستر سے اٹھ کر کھڑکی میں آ گئے۔ مگر سڑک خاموش پڑی تھی۔ یقیناً یہ گانا میں نے خواب ہی میں سنا ہے۔ انھوں نے سوچا اور واپس آکر پلنگ پر لیٹ رہے۔

کئی مہینے شاید ایک برس گزر گیا۔ وقت بھی عجب مسخری سا ہے۔ ہم اتنے مزے سے کہتے ہیں وقت گزر گیا، حالانکہ وقت گزرنا اس حقیقت کا کھلا ثبوت ہے کہ ہم قبر کے زیادہ نزدیک پہنچ گئے اور کیسی زندگی گذار کے؟ کتنی بے انصافیاں اور ذلتیں سہہ کے؟ زندگی یا قدرت یا قسمت کی کتنی ستم ظریفیوں کا نشانہ بن کے؟ اور جب مر جائیں گے تو سب کی قبریں ایک سی معلوم ہوتی ہیں۔ دکھ سہنے کے لئے بھی تو بار بار تھوڑا ہی پیدا ہوں گے۔

بھڑ بھڑ کے ہیں ہلکان کر دیتا تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے حسب عادت منتظر تھے کہ رقیہ اندر آکر گرم گرم چائے کی پیالی انہیں تھما

دے گی۔ مگر رقیہ پچھلے برآمدے میں دلی والی پڑوسن اور دوسری ہمسائیوں کے ساتھ مل کر کسی بات پر قہقہے لگانے میں مصروف، شاید یہ بھول ہی گئی تھی کہ میاں دفتر سے آگئے۔

اچانک قہقہوں کو پچھاڑتی ہوئی ایک بے حد کڑی آواز نے للکار کر "آئے ہائے بیگم۔ نام بڑا اور درشن۔ آخ تھو۔ اتنے بڑے گھر کی رانی اور در پر آئے سوالی کو کیا دیتی ہیں۔ حاتم کی قبر پر لات مارنے والی۔ اے دیکھنا ایک چونی۔ پاپوش پر مارتی ہوں تمہاری یہ چونی۔ آؤ بندو خاں۔ چلو اٹھو——"

"اے توبہ کیا ہوا سے لڑنے والی لگائی ہے!" دلی والی نے کہا۔ بقیہ خواتین نے ایک اور قہقہہ لگایا۔

کمرے کے اندر بجن میاں بور ہو کر آنکھیں بند کئے چائے کے منتظر رہے۔

"شرم کرو بیگمو۔ تف ہے، تف ہے۔" کڑی آواز چیخی "اب جو یہ بندی ادھر کا رُخ کرے تو"

"اچھا ایک غزل اور سنا دو تو پورا ایک روپیہ دیں گے۔" دلی والی کی بھاوج نے کہا۔

"نہیں غزل نہیں۔ لے گئی دل گڑیا جاپان کی سناؤ۔ دوسری پڑوسن

کی لڑکی نے فرمائش کی۔

بڑا سخت شور مچ رہا تھا۔ محلے کی یہ سب عورتیں اکٹھی ہو جائیں تو کس قدر چائیں چائیں کرتی ہیں۔ بجن میاں نے کروٹ بدلی۔ جہاں ان کا پلنگ بچھا تھا وہاں دروازے میں سے برآمدے میں جمع عورتیں تو نظر آرہی تھیں مگر جس عورت سے وہ سب مخاطب تھیں وہ دیوار کی اوٹ کی وجہ سے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

"اچھا وہ گجل سنا دو جو پہلے سنائی تھی ابھی" گجراتن ہمسائی نے ہاتھ بڑھا کر روپے کا نوٹ سرکایا۔

فوراً کوئل کی سی آواز بلند ہوئی "کبھی ہم میں تم میں بھی..... اجی راہ تھی....."

بجن میاں سُن سے رہ گئے۔ ان کو لگا جیسے ان کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ ان پر ایسا سکتہ طاری ہوا کہ وہ لیٹے لیٹے اپنا سر بھی نہ اٹھا سکے۔

گانا ختم ہوا۔ عورتیں ایسا معلوم ہوتا تھا شاید مسحور سی ہو چکی تھیں۔

ایک دم پھر غُل مچا۔

"اب گڑیا جاپان کی" ایک لڑکی چلائی

"اور تم شادی کس سے کرو گی۔ ذرا یہ تو بتاؤ کوئی ہے نظر میں؟"

ایک اور پڑوسن نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے سوال کیا۔

"اے ہے۔ اللہ کے غضب سے ڈرو لڑکیو۔ کیوں اس غریب کو تنگ کر رہی ہو۔" یہ دلّی والی کی بوڑھی ساس کی آواز تھی جو شور و غل سُن کر اپنے فلیٹ سے نکل کے صحن میں آ گئی تھیں۔

"سلام بیوی ——— سلام۔" گانے والی نے ذرا ممنون آواز میں ضعیفہ کو سلام کیا۔

"سلام۔ سلام۔" دلّی والی کی ساس مونڈھے پر بیٹھ گئیں "اے ہے نگوڑی کمبخت۔ دکھیاری۔ اے لڑکیو۔ تم کو اس کا مذاق اُڑاتے شرم نہ آئی۔ اے تیری کتنی عمر ہوگی بختوں جلی؟"

"بیالیس برس، بیگم صاحب۔"

"بیالیس برس!" خواتین کا حیرت زدہ کورس ہوا۔

"اللہ کی شان ہے!" رقیہ نے کہا۔

"ہاں اللہ کی شان ہے۔" دلّی والی نے کہا۔

"اور نام کیا ہے تمہارا؟" رقیہ نے پوچھا۔

"آنکھوں کے اندھے، نام نین سُکھ۔ میرا نام جمال آراء ہے بیگم صاحب ———"

"بڑا جگرا ہے تمہارا بیوی۔ گلی گلی گھوم کر دنیا بھر کی باتیں سنتی ہو۔

مذاق اُڑواؤ ہو اپنا" دلی والی کی ساس نے کہا۔

"جب قدرت نے میرے ساتھ اتنا بڑا مذاق کیا ہے بیگم، تو میں دنیا والوں کے مذاق اڑانے کی کیا پرواہ کروں؟ اور گلی گلی نہ گھوموں تو کھاؤں کیا اپنا سر؟ ذرا یہ تو بتاؤ؟" عورت نے چمک کر جواب دیا۔

"کہاں کی رہنے والی ہو؟ ادھر کی تو معلوم نہیں ہوتیں"

"ضلع رائے بریلی تھانہ کریم گنج"

"ماں باپ ہیں، مر گئے؟ کیا کرتے تھے؟" عورتوں کی عادت ہے کہ ہر بات کی کرید۔

"مر گئے نگوڑے۔ ذرا زردہ دینا۔ اے ہے، لکھنؤ کا زردہ ہے۔ ابا منصرم تھے ہمارے۔ مانو نہ مانو — مجھے کون پرواہ ہے۔ آجاؤ بندو خاں، چلیں"

"اے ہے۔ ٹھہر تو کم بخت کہاں بھاگی جاتی ہے۔ کون سا تیرے گھر پر تیرا خصم اور بچے انتظار کر رہے ہوں گے۔ ہاں اور بتا اپنے حالات" دلی والی کی بھاوج نے جن کو افسانے پڑھنے کا بڑا شوق تھا، بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

"کیا بتاؤں؟ اپنا کلیجہ؟ اے بندو خاں، اِدھر آجاؤ، اندر۔ سنا دو رام کہانی۔ یہاں بڑی محفل لگی ہے۔ نقشے جمے ہیں"

اب ایک بوڑھے آدمی کی کھنکار کی آواز آئی۔ جو شاید اب تک باہر پھاٹک پر بیٹھا تھا۔ اس نے صحن میں آ کر گلا صاف کیا اور اس میکانکی انداز سے جیسے سینکڑوں مرتبہ یہ داستان دہرا چکا ہو کہنا شروع کیا۔

"بیگم صاحب ان کو تین برس کی عمر میں جبر جست بخار آگیا تھا۔ بخار اتر گیا مگر اس کے بعد قد بڑھنا بند ہو گیا۔ حکیم، بید، اور اس کا نام لیجئے —— داگدر —— اوجھے، سیانے، سب ٹرائی کیئے ان کے باپ نے۔ مگر یہ نصیبوں جلی اتنی بڑی ہی رہ گئی۔ مگدر۔ ابا دیوانی کی عدالت میں ملازم تھے۔ اپنا ذاتی مکان تھا۔ سب کچھ تھا۔ کُل بس قسمت نہیں تھی۔"

"چچ چچ چچ۔" سامعین نے کہا۔

"پھر بیگم صاحب، ان کے باوا کو لقوہ مار گیا۔ وہ مر گئے۔ پھر مہتاری چل بسیں پھر میں اور میری گھر والی ان کو اپنے ہاں لے آئے۔"

"تم کون ہو اس کے۔ ان کے۔؟" رقیہ نے پوچھا۔

"ان کے گھر کا بہشتی ہوں۔ برسوں ان کا نمک کھایا ہے۔"

"چچ چچ۔ ہا۔" دلی والی کی ساس بولیں۔ ان کے لہجے میں سچی ہمدردی کی جھلک محسوس کر کے بوڑھے نے داستان جاری رکھی۔

مکان بیس روپیہ مہینہ کرائے پر اٹھا دیا۔ میں سقّہ ہوں ذات کا۔ میرے لڑکے آوارہ نکل گئے۔ لکھنؤ جا کر وہ تو بن گئے شہدے۔ اِدھر میرے ہاتھوں کے زخم بڑھ گئے تو کام چھوٹ گیا۔ سوچا بٹیا کا مکان بکوا دوں تو دو وقت کی روٹی کا بندوبست ہو جائے۔ مہاجن کا کرجہ منصرم صاحب پر پہلے سے چڑھا ہوا تھا۔ پھر آپ جانو ہندوستان پاکستان ہو گیا۔ مکان کے دام دو کوڑی کے نہیں رہے۔ اجی مکان تو کیا بکتا منصرم صاحب کے مرنے کے بعد مہاجن نے اس کی کرُکی ہی کروا لی مجھے اس کے شاگرد پیشے سے نکلنا پڑا اور صاحب" بوڑھا دم لینے کو رکا۔" پھر ہم سب جا کر کبوتر شاہ کے چھپر تلے پڑ رہے۔ یہ بٹیا جمعرات کی جمعرات نعتیں گاتی تھیں۔ اللہ کے ڈرنے والے چار پیسے دے جاتے تھے۔ پھر صاحب میری گھروالی لڑھک گئی۔ پھر کبوتر شاہ کے تکئے پر جانے کہاں سے آ کر چرسیے مدیکے۔ جمع ہونے لگے۔ تب میں نے کہا۔ میں نے کہا بندہ خاں اب یہاں سے کوچ کرو۔ میں نے بیگم صاحب بٹیا کو کندھے پر بٹھا لا اور بھیک مانگنے نکل پڑے دونوں جنے۔ مگر جس شہر میں باپ منصرم تھے اس میں بٹیا کو بھیک مانگتے لاج آتی تھی۔ ہم لوگ لکھنؤ چلے آئے۔ وہاں کئی برس بھیک مانگی۔ پھر کسی نے بتایا کہ بمبئی بڑے دھنوانوں کا شہر

ہے۔ وہاں چلے جاؤ، تو ٹکٹ کٹا کر یہاں چلے آئے۔ دہلی پر جھگی ڈال لی۔ وہاں سے میونسپلٹی والوں نے اٹھا دیا تو پھر اِدھر اُدھر فٹ پاتھوں پر سونے لگے۔ دن میں دو ڈھائی روپیہ کی آمدنی ہو جاتی ہے۔ کبھی زیادہ کبھی کم۔ چلو اٹھو بٹیا، کیا یہیں سویرا کرو گی۔ رات تھوڑی سوانگ بہت۔ آؤ۔ چلیں۔"

خواتین مبہوت بیٹھی تھیں سب نے کچھ سکے بھکاریوں کی طرف پھینکے جن کے فرش پر گرنے کی آوازیں بجن میاں کو اندر سنائی دیں۔

دفعتاً عورت نے گانا شروع کر دیا "میں نے لاکھوں کے بول سہے۔ میں نے لاکھوں کے بول سہے۔"

گانا ختم ہو گیا تو بجن میاں نے ڈرتے ڈرتے ذرا سا اُٹھ کر کھڑکی میں سے جھانکا۔ ایک بونی بڑا المبوترا سا چہرہ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں قد چار برس کی بچی کے برابر، سفید غرارہ پہنے، گلابی ململ کے دوپٹے سے سلیقے کے ساتھ سر اور ماتھا اس طرح ڈھانپے جیسے عورتیں نماز پڑھتے وقت سر اور ماتھا ڈھانپتی ہیں۔ صحن کے فرش پر سے سکے چن کر اُٹھی۔ لکھنؤا انداز سے جُھک کر اس نے بیگمات کو سلام کیا۔ پھر بچوں کی طرح گودی میں اٹھائے جانے کے لئے بوڑھے کی سمت بانہیں پھیلا دیں۔ بوڑھے نے یا دستگیر کا نعرہ لگایا۔ چُگی سفید داڑھی

والا سیاہ فام دیہاتی سقّہ، جس کی ساری عمر مشک اٹھاتے اٹھاتے کمر جھک گئی تھی۔ اب اپنی آقازادی کا مختصر سا بوجھ کندھوں پر اٹھانے کے لئے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ بونی کو اٹھا کر اس نے کندھے پر بٹھایا۔ بونی نے اپنے منّے منّے ہاتھوں سے اس کا سر پکڑ لیا۔ بوڑھے نے بیگمات کو سلام کیا اور پھاٹک سے باہر نکل گیا۔

صحن میں چند لمحوں کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔ اب اندھیرا چھا چکا تھا۔ سڑک کی روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں۔ گھر گھر ریڈیو پر بے حد اونچی آواز میں فلمی گیت گونج رہے تھے۔ دیوالی آنے والی تھی۔ اور بلیک مارکیٹ کرنے والے سیٹھوں کے بچے سڑک پر "ایٹم بم" چھوڑ رہے تھے جن کے بھیانک سے دل بلیوں اچھل پڑتا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا گویا ساری زندگی میدانِ جنگ میں تبدیل ہو گئی ہے، زندہ لاشوں کے پرخچے اُڑ رہے تھے اُڑ رہے ہیں، انسان اپنی لاشیں خود اپنے کندھوں پر اٹھائے اس جہنم زار میں سرگرداں ہیں۔ گلی میں انار چھوٹ رہے تھے۔ پھلجھڑیاں، پٹاخے اور مزید "ایٹم بم"۔

آتش بازی کے ان دھماکوں کے بعد چند منٹ کے لئے ذرا خاموشی چھائی اور پھر سڑک کے نکڑ پر سے بونی کی آواز بلند ہوئی۔

"وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر۔ وہ کرم کہ تھا مرے حال پر۔ مجھے

سب ہے یاد ذرا ذرا۔ تمہیں یاد ہو اجی کہ نہ یاد ہو" آواز دور ہوتی چلی گئی اور "ایٹم بم" کے لرزہ خیز دھماکوں میں کھو گئی۔

"اے ہے! اس نگوڑی خدائی خوار بونی کے چکر میں چائے کا وقت بھی نکل گیا۔ میرے ہزبینڈ آفس سے آتے ہی تیز گرم سبز چائے پیتے ہیں۔" رقیہ باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے دلّی والی پڑوسن سے کہہ رہی تھی، گجراتن ہمسائی کے لڑکے نے سنجن میاں کی کھڑکی کے عین نیچے ایک اور "ایٹم بم" چھوڑا جس سے کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں لرزنے لگیں۔

پھر سکوت چھا گیا۔

تلاش

کار طویل اور خاموش چترا انجن ایوینیو کے کنارے پر آہستہ سے رُک گئی۔ نروتم بابو نے چاروں طرف دیکھا۔

"وہ آدمی کھڑا ہے اس سے پوچھو۔" ذوالفقار نے صلاح دی۔

ایک رکشا والا بجلی کے کھمبے کے نیچے بیڑی سلگا رہا تھا۔

"سوناگاچی کا راستہ کدھر سے جاتا ہے؟" نروتم بابو نے چوروں کے سے لہجے میں دریافت کیا۔ رکشا والا مسکرایا۔ کیونکہ ایسی اندھیری راتوں میں یہ سوال اس کے سامنے ہزاروں بار دہرایا گیا تھا۔ اس نے راستہ بتا دیا۔ کار پھر آگے بڑھی۔ شہر سنسان ہو چکا تھا کئی میل کا چکر کاٹ کر وہ پھر اسی جگہ آ گئے۔ "کیا مصیبت ہے۔" ذوالفقار نے جھنجھلا کر

کہا۔ "کلکتے کے رہنے والے ہو اور یہاں کی سڑکوں سے اتنے ناواقف"۔

اس مرتبہ انہوں نے ایک سکھ ٹیکسی ڈرائیور سے مدد چاہی۔ اس نے تفصیل سے ان کو سوناگاچی کے راستے سے آگاہ کیا۔ نروتم بابو سڑکوں اور گلیوں کی بھول بھلیوں کا نقشہ ذہن نشین کر کے پھر کار میں آ بیٹھے۔ قافلہ روانہ ہوا۔ ایک گھنٹے تک اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد وہ منزل مقصود کے نزدیک پہنچے۔ گلی کے نکڑ پر پانچ چھ عورتیں سستی رنگین ساریاں پہنے بے تحاشا پاؤڈر سُرخی چہروں پر تھوپے ایک قطار میں کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک نے نقلی موتیوں کا تاج سا پہن رکھا تھا سب کی سب سگریٹ کا دھواں اڑا رہی تھیں۔ کار اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگیں۔ کار گلی میں داخل ہوئی۔ ہر رنگ اور ہر عمر کی عورتیں اپنے دروازوں کے آگے سیڑھیوں پر بیٹھی تھیں۔ یا دیواروں سے لگی کھڑی تھیں اور اپنی کاجل اور سرمے سے مزیّن پھٹی پھٹی آنکھوں سے آنے جانے والوں کو گھور رہی تھیں۔ پندرہ سالہ عورتیں اور پینتیس سالہ بوڑھیاں گلی کے اینٹوں کے اونچے نیچے فرش پر سے چھکڑے رکشائیں اور سائیکلیں گزر رہی تھیں۔ نروتم بابو نے گھبراتے ہوئے بڑی مشکل سے کار بھیڑ میں سے نکال کر آگے بڑھائی۔ ان کے ساتھیوں نے بے حد اشتیاق سے جھانک کر گلی

کی عورتوں کو دیکھا۔

کار سوناگاچی سے آہستہ آہستہ گذر رہی تھی۔ گلی کی عورتیں بے حد امید سے کار پر نظریں جمائے تھیں۔ بہت سی عورتوں نے آوازیں بھی دیں لیکن جب نوواردان کے سامنے نہ ٹھہرے تو انہوں نے بنگالی یا آسامی یا اڑیہ میں گالیاں دینا شروع کر دیں۔ گلی میں گاہکوں کا مجمع نہ تھا۔ عجیب ڈراؤنا سا سناٹا طاری تھا۔ میلی کچیلی کٹھ پتلیوں جیسی عورتیں۔ بار برداری کے چھکڑے۔ بجلی کے مدھم لیمپ اور ان سب کے درمیان ٹہلتا ہوا ایک زرد سا پولیس کا سپاہی۔

کار ایک لمحے کے لئے ایک دروازے کے سامنے رُکی۔ ایک عورت لپک کر قریب آگئی۔ مگر وہ لوگ پھر آگے بڑھ گئے۔ وہ مایوس اور کھسیانی سی ہو کر اپنی ساتھیوں سے جا ملی۔ ساتھیوں نے طنزیہ قہقہہ لگایا۔

کار والے اس نظارے سے اب شاید اُکتا چکے تھے۔ "چلو واپس چلیں"۔ کسی نے کہا۔ نروتم بابو نے گاڑی موڑی مگر دفعتاً گلی کے عین وسط میں انجن بند ہو گیا۔

"غضب ہو گیا۔ اگر ہم لوگ یہاں پھنس گئے تو کیا ہو گا؟" نروتم بابو نے انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سراسیمگی سے

کہا۔

"ہونا ہی کیا ——" پچھلی سیٹ پر سے کسی نے بشاشت سے جواب دیا۔ "صبح کو سارے اخباروں میں جلی سُرخیوں میں خبر شائع ہو گی کہ شری ذوالفقار احمد اور شری نروتم ہیترجی کل رات سونا گاچی میں پائے گئے —— ہاہاہا"

"واقعی یہ خبر چھپ گئی تو ——؟" نروتم بابو نے دُہرایا اور اس تصور سے ان کا دل دہل گیا

پولیس کے سپاہی نے قریب آ کر کار کے اندر جھانکا اور آگے چلا گیا۔

"اب خدا کے لئے اسٹارٹ کر چکو بھئی ——" ذوالفقار نے بے انتہا گھبراہٹ کے ساتھ کہا۔

"کوشش تو کر رہا ہوں" نروتم بابو نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔

دو تین مدقوق شکل اور چُندھی چُندھی آنکھوں والے دلال چرس کی سگرٹوں کا دم لگاتے ہوئے کار کے آس پاس منڈلانے لگے۔

انجن یک لخت زور کی گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ اسٹارٹ ہوا۔

"اب لوٹ چلو ——" ذوالفقار نے التجا کی۔

"واقعی ———" نروتم بالبوث نے پیچھے مڑ کر کہا۔ "آپ کے مطلب کے لئے یہ جگہ ٹھیک نہیں۔ مگر میرا ایک دوست یہاں کی چند ہائی کلاس جگہیں جانتا ہے۔ وہاں بھی قوم بڑے بڑھیا فلیٹوں میں رہتی ہے، بے حد کلچرڈ اور شاندار۔ اگلے اتوار کو وہاں چلیں گے۔" کار آہستہ آہستہ گلی طے کر رہی تھی۔

کہ اچانک ایک دروازے میں بیٹھی ہوئی وہ نظر آ گئی۔ وہ ایک سترہ اٹھارہ سالہ نازک اندام، چمپئی رنگت والی حسین لڑکی تھی۔ اس نے سرخ رنگ کی ساری پہن رکھی تھی اور اس کا بھولا بھالا دل کش چہرہ سرخی پاؤڈر سے عاری تھا۔ وہ ڈیوڑھی میں دیوار سے لگی غلیظ فرش پر بیٹھی تھی۔ اوپر مدھم سا بلب جل رہا تھا۔ ڈیوڑھی اندر جا کر ایک تاریک گلیارے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ لڑکی سر جھکائے چھوٹی سی پیڑھی پر بیٹھی اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے کھیل رہی تھی، اور اس قدر مسرور اور مطمئن اور شانت نظر آتی تھی جیسے اپنے چھوٹے سے گھر کے آنگن میں بیٹھی اپنے شوہر کا انتظار کر رہی ہو، یا کسی ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھی ریڈیو گرام پر اپنی پسندیدہ سنگیت سننے میں مصروف ہو...... یا کسی راج محل کے سنگھاسن پہ بیٹھی ہو۔

"خداوندا ——— کیسا عجیب نظارہ ہے ———" کار میں کسی نے

مسحور اور مبہوت ہو کر کہا۔ نرد تم نے کار ڈیوڑھی کے ساتھ روک لی۔

"اسے بلالو" ذوالفقار نے کہا۔

"کیسے بلائیں؟"

"خود اُتر کر جاؤ۔"

"ہمت نہیں پڑتی۔"

"تو پھر یہاں آنا کیا ضروری تھا؟"

لڑکی نے جھک کر کار والوں کو دیکھا اور بے حد اخلاق سے مسکرا کر نمسکار کیا۔ اس کی ولالہ ایک چڑیل ایسی سفید بالوں والی بڑھیا دہلیز پر بیٹھی تھی۔ وہ زور زور سے بنگالی میں کچھ بولی۔

"بلالو نہ اُسے" ذوالفقار نے پھر کہا۔

"مگر اس سے بات کیسے شروع کریں؟"

"بات کرنا کیا مشکل ہے؟"

"نہیں نہیں —— بھئی ——"

نرد تم بابو نے جھنجھلا کر کار آگے بڑھا دی "تم لوگ اس قدر ڈرپوک ہو تو مجھے آدھی رات کو گھسیٹ کر کیوں لائے۔ ہونہہ ——"

کار میں باتوں کا شور بڑھ گیا۔ اس لڑکی کا پر سکون اور معصوم حسن لرزہ خیز تھا۔

"اچھا ــــ تو پھر اگلے ہفتے وہیں چلیں گے ــــ وہ ہائی کلاس فلیٹ ــــ" نروتم بابو نے کہا۔ پھر دفعتاً سب خاموش ہو گئے۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ اس لڑکی کے متعلق سوچ رہے تھے۔ گلی کے اختتام تک پہنچ کر نروتم بابو نے کار واپس موڑ لی۔ جب وہ لوگ اس دروازے کے سامنے سے دوبارہ گزرے تو لڑکی نے مسکرا کر سر نیہوڑایا اور ہاتھ جوڑ کر گویا انہیں خدا حافظ کہا۔ وہ لوگ سوناگاچی سے باہر آ گئے۔

سڑک کی دوسری طرف کمار ٹولہ کے جھونپڑوں میں تیز روشنی ہو رہی تھی۔ درگا پوجا کا تہوار قریب تھا۔ اور درگا کی حسین، سفید، سبک مورتیاں تندہی سے گھڑی جا رہی تھیں۔ ہر رنگ اور ہر سائز کی مورتیاں پیڑھیوں پر رکھی تھیں۔ دیوار کے سہارے کھڑی تھیں، اپنی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں سے خلا کو تک رہی تھیں۔ دیوی کی مورتیاں۔ دیوی جو کائنات کی ماں ہے جس نے دنیا سے ظلم اور بدی اور نفس کی عفریتوں کا خاتمہ کیا۔ دیوی، جسے لاکھوں انسان اگلے ہفتے اپنی ساری عقیدت، سارے جذبے اور جوش اور ولولے کے ساتھ پوجیں گے۔ اُسے بیش قیمت ساڑیوں اور خوب صورت گہنوں اور چمکیلے مکٹوں سے آراستہ کیا جائے گا۔ دیوی، بیلور مٹھ کے مرمریں مندر سے لے کر شہر کے سارے گلی کوچوں کے جھلگاتے پنڈالوں کے نیچے

جس کی پرستش کی جائے گی —— خدا کی شکتی جو عورت کے روپ میں ظاہر ہوئی۔

کمار ٹولے کے جھونپڑے پیچھے رہ گئے۔ اب وہ لوگ آدھی رات کو شہر کی سنسان سڑکوں پر سے گزرتے بہت دُور، خوب صورت، پُرسکون۔ فیشن ایبل علی پور کی سمت واپس جا رہے تھے، جہاں ان کے محفوظ، خوب صورت، فیشن ایبل گھر اور آرام دہ خواب گاہیں ان کی منتظر تھیں۔

چائنا ٹاؤن کے پُراسرار اور خستہ حال مکانوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے نروتم بابو نے کار کو پھر چترانجن ایونیو کی طرف موڑا ہیڈ لیمپ کی روشنی میں ایک پٹھان دفعتاً ان کے سامنے آ گیا۔ اس کا نیلا صافہ، سنہری کلاہ، مخملی واسکٹ اور خشمگیں نیلی آنکھیں ایک لمحے کے لئے روشنی کے سیلاب میں جھلملائیں۔ اس نے رات کے یاتریوں کو غور سے دیکھا اور مسکرایا اور چائنا ٹاؤن کی سنسان پرچھائیوں میں غائب ہو گیا۔

وہ خاموشی سے علی پور پہنچے۔

"جانے وہ لڑکی کون تھی؟ ذوالفقار نے بہت دیر بعد پہلی بار بات کی۔

وہ لڑکی ـــــ اس کی شادی ہو سکتی تھی۔ وہ کسی تنگ و تاریک فلیٹ میں، بستی کے کسی جھونپڑے میں، کسی چھوٹے سے کوارٹر میں اپنے شوہر اور اپنے بچّوں کے ساتھ خوش خوش رہ سکتی تھی۔ یا وہ کسی اسکول میں پڑھ سکتی تھی۔ کسی دفتر میں ملازمت کر سکتی۔ اس وقت وہ ماں باپ کے آنگن، شوہر کی رسوئی، یا اسکول ہوسٹل کے کمرے کی بجائے آدھی رات کو خوف ناک سوناگاچی کی غلیظ ڈیوڑھی میں سکون اور خاموشی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اور جانے کیا سوچ رہی تھی کون تھی وہ؟ وہ کیا ہو سکتی تھی اور کیا بن گئی؟ زندگی کے اسرار، زندگی کے مظالم سمجھ میں آنے والی چیز نہیں۔

"کیوں بھئی ـــــ" جب وہ لوگ اپنے مکان کے سامنے پہنچے تو ذوالفقار نے پیچھے مڑ کر اپنی بیوی حمیدہ کی چھوٹی بہن شاہین سے پوچھا "تم کو کہانی کی تلاش تھی اور تم سوناگاچی دیکھنے کے لئے اس قدر مصر تھیں۔ دیکھ لی سوناگاچی؟"

"ہاں" شاہین نے آہستہ سے جواب دیا۔

"کچھ لکھ پاؤ گی اس کے متعلق؟"

"نہیں ـــــ"

"اور اس قدر پروگریسو اور بہادر بنتی ہو۔ مگر وہاں پہنچ کر گھگھی بندھ

گئی! میں برابر کہہ رہا ہوں کہ بھئی کرلو اس کا انٹرویو—کار کے پاس بلاکر بات کرلو۔ مگر ڈر کے مارے دونوں کی حالت خراب—! ذوالفقار نے کہا۔

اور حمیدہ نے برساتی میں اترتے ہوئے جواب دیا—"مگر میں تو اب بھی یہی سوچ رہی ہوں کہ اگر کار وہیں پھنس گئی ہوتی تو صبح اخباروں میں کیا چھپتا—!!

نظارہ درمیان ہے

تارا بائی کی آنکھیں تاروں ایسی روشن ہیں اور وہ گرد و پیش کی ہر چیز کو حیرت سے تکتی ہے۔ دراصل تارا بائی کے چہرے پر آنکھیں ہی آنکھیں ہیں۔ وہ قحط کی سوکھی ماری لڑکی ہے جسے بیگم الماس خورشید عالم کے ہاں کام کرتے ہوئے صرف چند ماہ ہوئے ہیں اور وہ اپنی مالکن کے شاندار فلیٹ کے ساز و سامان کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھتی رہتی ہے کہ ایسا عیش و عشرت اس نے پہلے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ وہ گورکھپور کے ایک گاؤں کی بال ودھوا ہے، جس کے سسر اور ماں باپ کے مرنے کے بعد اس کے ماما نے، جو بمبئی میں دودھ والا بھیا ہے اُسے یہاں بلا بھیجا تھا۔

الماس بیگم کے بیاہ کو بھی ابھی تین چار مہینے ہی گذرے ہیں سان کی منگلورین آیا جو ان کے ساتھ میکے سے آئی تھی "ملک" چلی گئی تو ان کے بے حد منتظم خالہ بیگم عثمانی نے، جو ایک نامور سوشل ورکر ہیں۔ ایمپلائمنٹ ایکس چینج فون کیا اور تارا بائی پٹ، کی طرح آنکھیں جھپکاتی کمبالا ہل کے "اسکائی اسکریپر" گل نسترن کی دسویں منزل پر آن پہنچیں۔ الماس بیگم نے ان کو ہر طرح قابل اطمینان پایا، مگر جب دوسرے ملازموں نے انہیں تارا بائی کہہ کر پکارا تو وہ بہت بگڑیں "ہم کوئی پتریا ہوں!" انہوں نے احتجاج کیا۔ مگر اب ان کو تارا بائی کے بجائے تارا دائی کہلانے کی عادت ہو گئی اور وہ چپ چاپ کام میں مصروف رہتی ہیں اور بیگم صاحب اور ان کے صاحب کو آنکھیں جھپکا جھپکا کر دیکھا کرتی ہیں۔

الماس بیگم کا اگر بس چلے تو وہ طرح دار شوہر کو ایک لمحے کے لئے اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں اور وہ جوان جہان آیا کو ملازم رکھنے کی ہرگز قائل نہیں۔ مگر تارا بائی جیسی بے جان اور سگھڑ خادمہ کو دیکھ کر انہوں نے اپنی تجربہ کار خالہ کے انتخاب پر اعتراض نہیں کیا۔

تارا بائی صبح بیڈ روم میں چائے لاتی ہے۔ بڑی عقیدت سے

صاحب کے جوتوں پر پالش اور کپڑوں پر استری کرتی ہے۔ ان کے شیو کا پانی لگاتی ہے۔ جھاڑ پوچھ کرنے وقت وہ بڑی حیرت سے ان خوب صورت چیزوں پر ہاتھ پھیرتی ہے جو صاحب اپنے ساتھ پیرس سے لائے ہیں۔ ان کا وائلن وارڈ روب کے اوپر رکھا ہے جب پہلی بار تارا بائی نے بیڈ روم کی صفائی کی تو وائلن پر بڑی دیر تک ہاتھ پھیرا کی۔ مگر پرسوں صبح جب وہ حسب معمول بڑی نفاست سے وائلن صاف کر رہی تھی تو نرم مزاج اور شریف صاحب (بیگم صاحب "نتیبا مرچ ہیں") اسی وقت کمرے میں آ گئے ہیں اور اس پر برس پڑے کہ وائلن کو ہاتھ کیوں لگایا اور تارا بائی کے ہاتھ سے چھین کر اسے الماری کے اوپر پٹخ دیا۔ تارا بائی سہم گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور صاحب ذرا شرمندہ سے ہو کر باہر برآمدے میں چلے گئے، جہاں بیگم صاحب بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ ویسے بیگم صاحب کی صبحیں عموماً ہیر ڈریسر کے ہاں اور بیوٹی سیلون میں گزرتی ہیں۔ مینی کیور، پیڈی کیور، مساج، فیشل ——— ایک سے ایک بڑھیا ساڑھیاں، درجنوں رنگ برنگے سلیکس اور عطر کے ڈبے اور گہنے ان کی الماریوں میں بھرے پڑے ہیں۔ مگر تارا بائی سوچتی ہے "بھگوان نے میم صاحب کو دولت بھی، اجت بھی اور ایسا سندر پتی بھی۔ بس شکل دیتے میں

کنجوسی کر گئے!

صاحب سُنا ہے میم صاحب مس صاحب لوگ کی سوسائٹی میں بے حد مقبول تھے۔ مگر بیاہ کے بعد سے بیگم صاحب نے ان پر بہت سی پابندیاں لگادی ہیں۔ دفتر جاتے ہیں تو دن میں کئی بار فون کرتی ہیں۔ شام کو کسی کام سے اکیلے باہر جائیں تو بیگم صاحب کو پتہ رہتا ہے کہ کہاں کہاں گئے ہیں اور ان جگہوں پر بھی فون کرتی رہتی ہیں۔ شام کو سیر و تفریح یا ملنے ملانے کے لئے دونوں میاں بیوی باہر جاتے ہیں تب بھی بیگم صاحب بڑی نگرانی رکھتی ہیں۔ مجال ہے جو وہ کسی دوسری لڑکی پر بھی نظر ڈال لیں۔

صاحب نے یہ سارے قاعدے قانون ہنسی خوشی قبول کر لئے ہیں۔ کیوں کہ بیگم صاحب بہت امیر ہیں اور صاحب کی نوکری بھی ان کے دولت مند سُسر ہی نے دلوائی ہے ورنہ بیاہ سے پہلے صاحب بہت غریب آدمی تھے۔ اسکالرشپ انجینئرنگ پڑھنے فرانس گئے تھے۔ واپس آئے تو روزگار نہیں ملا۔ پریشان حال گھوم رہے تھے جب ہی بیگم صاحب کے گھر والوں نے انہیں پھانس لیا۔

بڑے لوگوں کی دنیا کے یہ عجیب و غریب قصے تارا بائی فلیٹ کے مستری (باورچی) حمال اور دوسرے نوکروں سے سنتی ہے اور

اس کی آنکھیں اچنبھے سے جھلملاتی رہتی ہیں۔

خورشید عالم بڑے اچھے وائلن نواز بھی تھے، مگر جب سے بیاہ ہوا ہے، بیوی کی محبت میں ایسے کھوئے ہیں کہ وائلن کو ہاتھ نہیں لگایا۔ کیوں کہ الماس بیگم کو اس ساز سے دلی نفرت ہے۔ خورشید عالم بیوی کے بے حد احسان مند ہیں، کیوں اس شادی سے ان کی زندگی بدل گئی اور احسان مندی ایسی شے ہے کہ ایک سنگیت کار اپنی سنگیت کی قربانی بھی دے سکتا ہے۔ خورشید عالم شہر کی ایک خستہ عمارت میں پڑے تھے۔ اور برسوں پر مارے مارے پھرتے تھے۔ اب لکھ پتی کی حیثیت سے کمبالا ہل پر فروکش ہیں۔ مرد کے لئے اس کا اقتصادی تحفظ غالباً سب سے بڑی چیز ہے۔

خورشید عالم اب وائلن شاید کبھی نہیں بجائیں گے

یہ صرف ڈیڑھ سال پہلے کا ذکر ہے۔ الماس اپنے ملک التجار باپ کی عالی شان کوٹھی میں مالا بارہل پر رہتی تھی۔ وہ سوشل ورک کر رہی تھیں اور عمر زیادہ ہو جانے کے کارن شادی کی امید سے دست بردار ہو چکی تھیں۔ جب ایک دعوت میں ان کی ملاقات خورشید عالم سے ہوئی اور ان کی جہاں دیدہ خالہ بیگم عثمانی نے مکلنات بھانپ کر اپنے "جاسوسوں" کے ذریعہ معلومات فراہم کیں——

لڑکا یو پی کا ہے۔ یورپ سے لوٹ کر تلاش معاش میں سرگرداں ہے۔ مگر شادی پر تیار نہیں، کیوں کہ فرانس میں ایک لڑکی چھوڑ آیا ہے اور اس کی آمد کا منتظر ہے۔ بیگم عثمانی فوراً اپنی مہم میں جٹ گئیں۔ الماس کے والد نے اپنی فرم میں خورشید عالم کو پندرہ سو روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔ الماس کی والدہ نے انہیں اپنے ہاں مدعو کیا اور الماس سے ملاقاتیں خود بخود شروع ہو گئیں۔ مگر پھر بھی "لڑکے" نے "لڑکی" کے سلسلہ میں مطلق گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا۔

دفتر سے لوٹ کر بیشتر وقت انہیں الماس کے ہاں گزارنا پڑتا اور اس لڑکی کی سطحی گفتگو سے اکتا کر وہ اس پر فضا بالکنی میں جا کھڑے ہوتے جس کا رخ سمندر کی طرف تھا۔ پھر وہ سوچتے۔ ایک دن "اس" کا جہاز آ کر اس ساحل سے لگے گا۔ اور "وہ" اس پر سے اترے گی۔ اسے ہمراہ ہی آجانا چاہیئے تھا۔ مگر پیرس کے کالج میں ابھی اس کا کام ختم نہیں ہوا تھا۔ "اس" کا جہاز اس ساحل سے آن کر لگے گا —— وہ بالکنی کے جنگلے پر جھکے افق کو تکتے رہتے۔ الماس اندر سے نکل کر شگفتگی سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھتی "کیا سوچ رہے ہیں" وہ ذرا جھینپ کر مسکرا دیتے۔

رات کے کھانے پر الماس کے والد کے ساتھ ملکی سیاست سے

وابستہ ہائی فنانس پر تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد وہ فقط کے ہارے اپنی جائے قیام پر پہنچے اور وائلن نکال کر وہ دھنیں بجانے لگتے جو "اس" کی سنگت میں پیرس ہی میں بجایا کرتے تھے۔ وہ دونوں ہر تیسرے دن ایک دوسرے کو خط لکھتے تھے، اور پچھلے خط میں انہوں نے "اُسے" اطلاع دی تھی کہ انہیں بمبئی ہی میں بڑی عمدہ ملازمت مل گئی ہے۔ اس ملازمت کے ساتھ جو خوفناک شاخسانے بھی تھے اس کا ذکر انہوں نے خط میں نہیں کیا تھا۔

ایک برس گزر گیا، مگر انہوں نے الماس سے شادی کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا۔ آخر بیگم عثمانی نے طے کیا کہ خود ہی ان سے صاف صاف بات کر لینا اب عین مناسب ہے۔ مگر تب ہی پرتاب گڈھ سے تار آیا کہ خورشید عالم کے والد سخت بیمار ہیں اور چھٹی لے کر وطن روانہ ہو گئے۔ ان کو پرتاب گڈھ گئے ہوئے چند روز ہی گزرے تھے کہ الماس جو اب ان کی طرف سے ناامید ہو چکی تھی ایک شام اپنی سہیلیوں کے ساتھ ایک جرمن پیانسٹ کا کونسرٹ سننے تاج محل گئی کرسٹل روم میں حسبِ معمول بوڑھے پارسیوں اور پارسنوں کا مجمع تھا اور ایک بے حد حسین آنکھوں والی پارسی لڑکی کونسرٹ کا پروگرام بانٹتی پھر رہی تھی۔ ایک شناسا خاتون نے الماس کا تعارف اس لڑکی سے

کرایا" مس پیروجا جہانگیر دستور ——" اور خود آگے چلی گئیں۔

الماس نے حسبِ عادت بڑی ناقدانہ اور تنکیھی نظروں سے اس اجنبی لڑکی کا جائزہ لیا۔ لڑکی بے حد حسین تھی۔

"آپ کا کیا نام بتلایا مسز رستم جی نے؟ الماس نے ذرا مشفقانہ انداز میں سوال کیا۔

"پیروجا دستور" لڑکی نے سادگی سے جواب دیا۔

"میں نے آپ کو پہلے کبھی کونسرٹ وغیرہ میں نہیں دیکھا۔"

"میں سات برس بعد پچھلے ہفتے ہی پیرس سے واپس آئی ہوں۔"

"سات برس پیرس میں! اب تو آپ فرنچ خوب فرفر بول لیتی ہوں گی؟" الماس نے ذرا ناگواری سے کہا۔

"جی ہاں ——" پیروجا ہنسنے لگی۔

اب خاص خاص مہمان جرمن پیانسٹ کے ہمراہ سی لاؤنج کی سمت بڑھ رہے تھے۔ پیروجا الماس سے معذرت چاہ کر ایک انگریز خاتون سے اس پیانسٹ کی موسیقی پر بے حد ٹکنیکل قسم کا تبصرہ کرنے میں منہمک ہو گئی۔ لیکن سی لاؤنج میں پہنچ کر الماس پھر اس لڑکی سے ٹکرا گئی۔ کمرے میں چائے کی گہما گہمی شروع ہو چکی تھی۔

"آئیے یہاں بیٹھ جائیں۔" پیروجا نے مسکرا کر الماس سے کہا۔ وہ

دونوں دریچے سے لگی ہوئی ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔

"آپ تو ویسٹرن میوزک ایکسپرٹ معلوم ہوتی ہیں" الماس نے ذرا رکھائی سے بات شروع کی، کیونکہ وہ خوبصورت اور کم عمر لڑکیوں کو ہرگز برداشت نہ کر سکتی تھی۔

"جی ہاں" میں پیرس پیانو کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ہی گئی تھی"۔

الماس کے ذہن میں کہیں دور خطرے کی گھنٹی بجی۔ اس نے باہر سمندر کی شفاف اور بے حد نیلی سطح پر نظر ڈال کر دفعتاً بڑے اخلاق اور بے تکلفی سے کہا: "ہاؤ انٹرسٹنگ ——— پیانو تو ہمارے ہاں بھی موجود ہے کسی روز آ کر کچھ سناؤ"۔

"ضرور ———" پیروجا نے مسرت سے جواب دیا۔

"سنیچر کے روز کیا پروگرام ہے تمہارا؟ میں اپنے ہاں ایک ہین پارٹی (HEN PARTY) کر رہی ہوں، میری سہیلیاں تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی"۔

"آئی وڈ لو ٹو کم ——— تھینک یو!"

"تم رہتی کہاں ہو پیروجا؟"

پیروجا نے تاردیو کی ایک گلی کا پتہ بتایا۔ الماس نے ذرا اطمینان کی سانس لی۔ تاردیو مفلوک الحال پارسیوں کا محلہ ہے۔

"میں اپنے چچا کے ساتھ رہتی ہوں۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ میرے بھائی بہن بھی نہیں۔ مجھے چچا ہی نے پالا ہے۔ وہ لاولد ہیں۔ چچا ایک بینک میں کلرک ہیں۔" پیرو جا سادگی سے کہتی رہی۔ پھر اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد سمندر کی پُرسکون سطح کو دیکھتے ہوئے اس نے اچانک کہا "کیسی عجیب بات ہے۔ پچھلے ہفتے جب میرا جہاز اس ساحل کی طرف بڑھ رہا تھا تو میں سوچ رہی تھی کہ اتنے عرصے کے بعد اجنبیوں کی طرح بمبئی واپس پہنچ رہی ہوں۔ یہ بڑا کٹھور شہر ہے۔ تم کو تو معلوم ہی ہوگا الماس! مخلص دوست یہاں بہت مشکل سے ملتے ہیں۔ مگر میری خوش قسمتی دیکھو کہ آج ہی تم سے ملاقات ہو گئی۔

الماس نے دردمندی کے ساتھ سر ہلایا۔ بی لاؤنج میں باتوں کی دھیمی دھیمی بھنبھناہٹ جاری تھی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے پوچھا۔

"تم پیرس گئی تھیں؟"

"مجھے اسکالرشپ مل گیا تھا۔ وہاں پیانو کی ڈگری لینے کے بعد چند سال تک ایک میوزک کالج میں ریسرچ کرتی رہی۔ میں وہاں بہت خوش تھی۔ مگر میرے چچا چچی یہاں اکیلے تھے۔ وہ دونوں بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ چچی بیچاری تو ضعیف العمری کی وجہ سے بالکل

بہری بھی ہو گئی ہیں۔ میں ان کی خاطر واپس آ گئی اور اس کے علاوہ ..."

"ہلو الماس! تم یہاں بیٹھی ہو! چلو جلدی۔ مسز ملگاؤں کر تم کو بلا رہی ہیں" ایک خاتون نے میز کے پاس آ کر کہا۔ پیرو جا کی بات ادھوری رہ گئی۔ الماس نے اس سے یہ کہتے ہوئے معذرت چاہی کہ وہ سنیچر کو صبح گیارہ بجے اس کے لئے کار بھیج دے گی۔ وہ میز سے اُٹھ کر مہمانوں کے مجمع میں کھو گئی۔

سنیچر کے روز پیرو جا الماس کے گھر پہنچی۔ جہاں مرغیوں کی پارٹی اپنے عروج پر تھی۔ بیٹلز ریکارڈ بج رہے تھے چند لڑکیاں جنہوں نے چند روز پہلے ایک فیشن شو میں حصّہ لیا تھا، زور شور سے اس کے واقعات پر تبصرہ کر رہی تھیں۔ یہ سب لڑکیاں جن کی ماتر بھاشائیں اردو ہندی، گجراتی اور مراٹھی تھیں انگریزی اور صرف انگریزی بول رہی تھیں اور انہوں نے بے حد چست پتلونیں یعنی "اسٹریچ پینٹس" پہن رکھی تھیں —— پیرو جا کو ایک لمحے کے لئے محسوس ہوا کہ وہ ابھی ہندوستان واپس نہیں آئی ہے۔ اس کا اپنا فرقہ بے حد مغرب پسند تھا مگر برسوں یورپ میں رہ کر اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اجنتا کی زندہ تصویروں کی بجائے ان مغربیت زدہ ہندوستانی خواتین کو دیکھ کر اہل یورپ کو سخت افسوس اور مایوسی ہوتی ہے۔

چنانچہ پیرو جان جہانگیر دستور پیرس اور روم میں اپنی ٹھیٹھ ہندوستانی وضع قطع پر بڑی نازاں رہتی تھی۔ بمبئی کی اِن نقلی امریکن لڑکیوں سے اکتا کر وہ بالکنی میں جا کھڑی ہوئی، جس کے سامنے سمندر تھا اور پہلو میں برج خموشاں کا جنگل نظر آرہا تھا۔ وہ چونک اٹھی، گھنے جنگل کے اوپر کھلتی فضاؤں میں چند گدھ اور کوّے منڈلا رہے تھے اور چاروں طرف بڑا ڈراؤنا سناٹا طاری تھا۔ وہ گھبرا کر واپس پلٹی اور زندگی سے گونجتے ہوئے کمرے میں آکر ایک صوفے پر ٹک گئی۔

کمرے کے ایک کونے میں غالباً بطور آرائش اسٹین وے کا گرینڈ پیانو رکھا ہوا تھا۔ لڑکیاں اب ریڈیو پروگرام پر میری بیلا فونٹے کا پرانا کلپسو "جمیکا فیرویل" بجا رہی تھیں ——— مغنی کی دل کش آواز گٹار کی جان لیوا گونج کے ساتھ ساتھ کمرے میں پھیلنے لگی۔

الماس چپ چاپ جا کر بالکنی میں کھڑی ہو گئی۔ ریکارڈ ختم ہوا تو اس نے اندر آکر پیرو جا سے کہا "ہم لوگ سخت بدمذاق ہیں ایک ماہر پیانسٹ یہاں بیٹھی ہے اور ہم ریکارڈ بجا رہے ہیں! چلو بھائی ——— اٹھو ——"

پیرو جا مسکراتی ہوئی جا کر پیانو کے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

"کیا سناؤں؟ میں تو صرف کلاسیکی میوزک ہی بجاتی ہوں ——"

"ہائے ——پوپ (POP) نہیں !" لڑکیوں نے غُل مچایا —— "اچھا کوئی انڈین فلم سانگ بجاؤ۔"

"فلم سانگ بھی مجھے نہیں آتے —— مگر —— مگر ایک غزل یاد ہے —— جو مجھے —— جو مجھے —— وہ جھینپ کر ٹھٹھک گئی۔

"غزل —— ؟ اوہ! آئی لو اردو پوئٹری ——" ایک مسلمان لڑکی نے جس کے والدین اہل زبان تھے، بڑے سرپرستانہ انداز میں کہا۔ پیرو جانے پردوں پر انگلیاں پھیریں اور اسے ایک انجانی مسرور سی پھریری سی آئی، پھر اس نے آہستہ آہستہ ایک دلکش دھن بجانا شروع کی۔

"گاؤ بھی ساتھ ساتھ۔" لڑکیاں چلائیں۔

"بھئی میں گا نہیں سکتی۔ میرا اردو تلفظ بہت خوفناک ہے۔"

"اچھا اس کے الفاظ بتادو —— ہم لوگ گائیں گے ——"

"وہ کچھ اس طرح ہے ——" پیرو جانے کہا۔

"تو سامنے ہے اپنے بتلا کہ تو کہاں ہے
کس طرح تجھ کو دیکھوں نظارہ درمیان ہے

چند لڑکیوں نے ساتھ ساتھ گانا شروع کر دیا۔ —— نظارہ درمیان ہے۔ نظارہ درمیان ہے۔"

غزل ختم ہوئی تالیاں بجیں۔

"اب کوئی ویسٹرن چیز بجاؤ ـــــ ایک لڑکی نے فرمائش کی۔

شوپاں کی میڈنز فینسی (MAIDEN'S FANCY) بجاؤں؟ یہ نغمہ میں اور میرا منگیتر ہمیشہ اکٹھے بجاتے تھے پیرس میں وہ وائلن پر میری سنگت کرتے تھے ـــــ"

"تمہارے منگیتر بھی میوزیشین ہیں؟" ایک لڑکی نے پوچھا۔

"پروفیشنل نہیں۔ شوقیہ ـــ" پیروجا نے جواب دیا اور نغمہ بجانے میں محو ہو گئی۔

اگلے دو ہفتوں میں الماس نے پیروجا سے بڑی پکّی دوستی گانٹھ لی۔ اس دوران میں پیروجا کو ایک کانونٹ کالج میں پیانو سکھانے کی ملازمت مل چکی تھی جو تعطیلات کے بعد کھلنے والا تھا۔ ہفتے میں تین بار ایک امریکن کی دس سالہ لڑکی کو پیانو سکھانے کا ٹیوشن بھی مل گیا تھا۔ امریکن کی بیوی کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا اور وہ اپنا غم بھلانے کے لئے اپنے بچّوں کے ہمراہ بغرض سیاحت ہندوستان آیا ہوا تھا اور جُوہُو میں سن اینڈ سینڈ، مقیم تھا۔ تار دیو سے جُوہُو تک کا سفر خاصا طویل تھا مگر امریکن پیروجا کو اچھی تنخواہ دینے والا تھا اور بڑی شفقت سے پیش آتا تھا۔

پیروجا اپنی زندگی سے فی الحال بہت خوش تھی۔ چند روز بعد "وہ" اپنے وطن سے واپس آنے والا تھا۔ پیروجا نے اسے بمبئی آتے ہی ملازمت اور ٹیوشن ملنے کی اطلاع نہیں دی تھی کہ وہ "اسے" ایک اچانک "سرپرائز" دینا چاہتی تھی۔

ایک روز وہ الماس کے ساتھ اس کی کوٹھی کے باغ میں ٹہل رہی تھی کہ فوارے پر پہنچ کر الماس نے اس سے دفعتاً سوال کیا "تم نے وہ غزل کہاں سے سیکھی تھی؟ — وہی جو تم اس روز گا رہی تھیں۔"

"اوہ — وہ — ؟ پیرس میں!"

"پیرس! ہاؤ انٹرسٹنگ! کس نے سکھائی؟"

"میرے منگیتر نے —"

"اوہ پیروجا — یو ڈارک ہورس — ! چار سو بیس! مجھ کو بتایا بھی نہیں اب تک!"

"تمہاری ہی کمیونٹی کے ہیں وہ"

"اوہ — واقعی — ؟" الماس فوارے کی منڈیر پر بیٹھ گئی۔

"میرے باپ دادا دستور رہے تھے۔ مگر میرے چچا بہت روشن خیال ہیں۔ انہوں نے اجازت دے دی ہے۔"

"کیا نام ہے صاحبزادے کا؟"

یہ ناموں کا بھی عجیب قصّہ تھا، خورشید عالم اس کی نرگسی آنکھوں پر عاشق ہوئے تھے۔ جب پیرس کے ہندوستانی سفارت خانے کی ایک تقریب میں پہلی ملاقات ہوئی اور کسی نے اس کا تعارف "پیروجا" کہہ کران سے کرایا تو انہوں نے شرارت سے کہا تھا، لیکن آپ کا نام تو نرگس ہونا چاہیئے تھا! —— "اوہ —— نرگیش؟ نرگیش تو میری آنٹی کا نام ہے۔"

"لاحول ولاقوۃ —— "خورشید عالم نے ایسی بے تکلفی سے کہا تھا جیسے اسے جانتے ہوں —— نرگیش، کھورشیٹ، پیروجا۔ آپ لوگوں نے حسین ایرانی ناموں کی کیا ریڑھ ماری ہے۔ میں آپ کو فیروزہ پکاروں تو کوئی اعتراض ہے؟" —— ہرگز نہیں ——"

پیروجا نے ہنس کر جواب دیا تھا —— اور پھر ایک بار خورشید عالم نے دریا کے کنارے ٹہلتے ہوئے اس سے کہا تھا "یہ تمہاری بہادر آنکھیں —— ہفت آنکھیں، جگنو ایسی شہاب ثاقب ایسی، ہیرے جواہرات ایسی، روشن دھوپ اور جھلملاتی بارش ایسی آنکھیں —— نرگس کے پھول جو تمہاری آنکھوں میں تبدیل ہو گئے۔"

"میں نے پوچھا کیا نام ہے ان صاحب کا؟ الماس کی تیکھی آواز پر وہ چونکی۔

"کھورشیٹ عالم"۔ اس نے جواب دیا۔ چند لحظوں کے سکوت کے بعد اس نے گھبرا کر نظریں اُٹھائیں سیاہ ساری میں ملبوس، کمر پر ہاتھ رکھے، سیاہ اونٹ کی طرح اس کے سامنے کھڑی الماس اس سے کہہ رہی تھی "کیسا عجیب اتفاق ہے پیروجا ڈیر! میرے منگیتر کا نام بھی خورشید عالم ہے۔ وہ بھی وائلن بجاتے ہیں، وہ بھی پیرس سے آئے ہیں اور ان دنوں اپنے والد سے ملنے وطن گئے ہوئے ہیں۔

اگست کے آسمان پر زور سے بجلی چمکی مگر کسی نے نہیں دیکھا کہ وہ کڑکتی ہوئی بجلی آن کر پیروجا دستور پر گر گئی۔ وہ کچھ دیر تک ساکت بیٹھی رہی، پھر اس نے اس عالیشان عمارت پر نظر ڈالی اور اپنے تاردیو کے تاریک فلیٹ کا تصور کیا، بجلی پھر چمکی اور مالابار ہل کے اس منظر کو روشن کر گئی، چشم زدن میں ساری بات پیروجا کی سمجھ میں آگئی اور یہ بھی کہ اپنے خطوں میں خورشید عالم نے الماس کا ذکر کیوں نہیں کیا تھا اور کچھ عرصے سے شادی کے تذکرہ کو وہ اپنے خطوط میں کس وجہ سے ٹال رہے تھے، وہ آہستہ سے اٹھی اور اس نے آہستہ سے کہا "اچھا بھئی الماس، منگنی مبارک ہو۔ خدا حافظ"

جا رہی ہو پیروجا؟ ٹھہرو میری کار تم کو پہنچا آئے گی۔ ڈرائیور" الماس نے سکون کے ساتھ آواز دی۔

"نہیں الماس۔ شکریہ۔" وہ تقریباً بھاگتی ہوئی پھاٹک سے نکلی۔ سڑک کی دوسری طرف اسی وقت بس آن کر رُکی وہ تیزی سے سڑک پار کر کے بس میں سوار ہو گئی۔

فوآرے کے پاس کھڑی الماس پھاٹک کی طرف دیکھتی رہی۔ بارش کی زبردست بوچھار نے پام کے درختوں کو جُھکا جُھکا دیا۔ وہ جلدی سے قدم اٹھاتی، کیچڑ سے بچتی برساتی کے اندر چلی گئی۔

اس واقعہ کے تیسرے روز خورشید عالم کا خط الماس کے والد کے نام آیا جس میں انہوں نے اپنے ابّا میاں کی شدید علالت کی وجہ سے رخصت کی میعاد بڑھانے کی درخواست کی تھی۔ انہوں نے الماس کے والد کو یہ نہیں لکھا کہ اس خبر سے کہ ان کا اکلوتا لڑکا کسی مسلمان رائیس زادی کی بجائے ایک غریب پارسن سے شادی کر رہا ہے ــــــ ان کے کٹر مذہبی ابّا جان صدمے سے جاں بلب ہو چکے ہیں۔ خورشید عالم کے خط سے ظاہر تھا کہ وہ بے حد پریشان ہیں جواب میں الماس نے خود انہیں لکھا:

"...... آپ جتنے دن چاہیں وہاں رہیئے۔ ڈیڈی آپ کو غیر تو نہیں سمجھتے ـ ہم سب آپ کی پریشانی میں شریک ہیں۔ آپ ابا میاں کو علاج کے لئے یہاں کیوں نہیں لے آتے۔

بربیلِ تذکرہ ——— کل میں سوئمنگ کے لئے سن اینڈ سینڈ گئی تھی۔ وہاں ایک بڑی دل چسپ پارسن مس پیرو جا دستور سے ملاقات ہوئی، جو پیانو بجاتی ہے اور پیرس سے آئی ہے، اور شاید کسی امریکن کی گرل فرینڈ ہے اور شاید اسی کے ساتھ "سن اینڈ سینڈ" میں ٹھہری ہوئی ہے۔ میں نے آپ کو اس لئے خط لکھا کہ غالباً آپ بھی اس سے کبھی ملے ہوں پیرس میں۔

اچھا ——— اب آپ آبا میاں کو لے کر آجایئے تار دے دیجئے۔ تاکہ یہاں بریچ کینڈی ہسپتال میں ان کے لئے کمرہ رزرو کر لیا جائے

آپ کی مخلص۔ الماس"

شام پڑے تاردیو کی خستہ حال عمارت کے سامنے ٹیکسی آن کر رُکی اور خورشید عالم باہر اُترے۔ جیب سے نوٹ بک نکال کر انہوں نے پتے پر نظر ڈالی اور عمارت کے لب سڑک برآمدے کی دھنسی ہوئی سیڑھی پر قدم رکھا۔

سامنے ایک دروازے کی چوکھٹ پر چونے سے جو "چوک" صبح بنایا گیا تھا، وہ اب تک موجود تھا۔ اندر نیم تاریک کمرے کے سرے پر کھڑکی میں ایک بوڑھا پارسی صدرا اور میلی سفید پتلون پہنے

سر پر گول ٹوپی اوڑھے، کمر میں بندھی "کُستی" کھول کر اس میں گرہیں لگاتے ہوئے زیرِ لب دعائیں پڑھ رہا تھا۔ ایک طرف میلی سی آرام کرسی پڑی تھی۔ وسطی میز پر رنگین موم جامہ بچھا تھا۔ دیوار پہ زرتشت کی بڑی سی تصویر آویزاں تھی۔ کمرے میں ناریل اور مچھلی کی تیز باس اڈ رہی تھی۔ ایک بوڑھی پارسن سُرخ جارجٹ کی ساری پہنے، سر پر رومال باندھے منڈیا ہلاتی اندر سے نکلی۔

"مس دستور ہیں؟"

"پیر وجا؟ پارسن نے دھندلی آنکھوں سے خورشید عالم کو دیکھتے ہوئے جواب دیا" جو ہو گئی ہے ——— سن اینڈ سینڈ ———"

"کیا؟ کیا مس دستور سن اینڈ سینڈ میں منتقل ہو گئی ہیں؟"

بہری پٹ ضعیفہ نے اقرار میں سر ہلایا۔

"کس کے ——— کس کے ساتھ ———؟" خورشید عالم نے ہکلا کر پوچھا۔

بوڑھی غڑاپ سے اندر گئی اور ایک وزٹنگ کارڈ لا کر خورشید عالم کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ کارڈ پہ کسی امریکن کا نام درج تھا۔

"تم مسٹر کھورشیڈ عالم ہو؟ پیروجا نے کہا تھا کہ تم آنے والے ہو۔ اگر اسے ڈھونڈتے ہوئے یہاں آؤ تو میں فوراً اُس کو فون کر

دوں۔ اور تم کو یہ نہ بتاؤں کہ وہ کہاں گئی ہے!" اس نے بلاوز کی جیب سے پچیس پیسے نکالے۔

خورشید عالم نے ہکا بکا ہو کر بوڑھی کو دیکھا۔

"آپ کو اس صورت حال پر کوئی اعتراض نہیں؟"

بہری بھنڈ ضعیفہ نے نفی میں سر ہلایا" ہم بہت غریب لوگ ہیں مگر اب پیروجا کو ایک امریکن ——"

دفعتاً مسز دستور کو یاد آیا کہ انہوں نے مہمان کو اندر ہی نہیں بلایا ہے اور انہوں نے ہیٹھ جھجکا کہ کہا" آؤ —— اندر آجاؤ ——"

خورشید عالم مبہوت کھڑے رہے۔ پھر تیزی سے پلٹ کر ٹیکسی میں جا بیٹھے۔

"بائی بائی ——" ضعیفہ نے ہاتھ ہلایا۔

بوڑھا پارسی دعا ختم کر کے باہر لپکا، مگر ٹیکسی جا چکی تھی۔

جس روز الماس اور خورشید عالم کی منگنی کی دعوت تھی، ایسی ٹوٹ کے بارش ہوئی کہ جل تھل ایک ہو گئے۔ ڈنر سے ذرا پہلے بارش تھمی اور خورشید عالم اور الماس کے والد کے دوست ڈاکٹر صدیقی جو حال ہی میں تبدیل ہو کر بمبئی آئے تھے، بالکنی میں جا کھڑے ہوئے جس سے کچھ فاصلے پر برج خموشاں کا اندھیر جنگل بھیگی ہوئی ہوا میں

سائیں سائیں کر رہا تھا۔

اندر ڈرائنگ روم میں قہقہے گونج رہے تھے اور گرینڈ پیانو پر رکھے ہوئے نقرئی شمعدان میں موم بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ بڑا سخت رومینٹک اور پرکیف وقت تھا۔ اتنے میں گیلری میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ایک ملازم نے آکر الماس سے کہا۔ خورشید صاحب کے لئے فون آیا ہے۔"

دلہن بنی ہوئی الماس لپک کر فون پر پہنچی۔ ایک مقامی ہسپتال سے ایک نرس پریشان آواز میں دریافت کر رہی تھی "کیا مسٹر عالم وہاں موجود ہیں؟"

"آپ بتایئے۔ آپ کو مسٹر عالم سے کیا کام ہے؟" الماس نے درشتی سے پوچھا۔

"مس پیرو جا دستور ایک مہینے سے یہاں سخت بیمار پڑی ہیں۔ آج ان کی حالت زیادہ ——— زیادہ نازک ہو گئی ہے۔ انہوں نے کہلوایا ہے کہ اگر چند منٹ کے لئے مسٹر عالم یہاں آسکیں..."

"مسٹر عالم یہاں نہیں ہیں۔"

"آر یو شیور؟"

"یس آئی ایم ویری شیور۔" الماس نے گرج کر جواب دیا "کیا آپ

سمجھتی ہیں جھوٹ بول رہی ہوں؟ اور کھٹ سے ٹیلیفون بند کر دیا اور ذرا سراسیمگی سے مہمانوں میں آشامل ہوئی۔

دو گھنٹے بعد پھر فون آیا۔

"ڈاکٹر صدیقی آپ کی کال ——" گیلری میں کسی نے آواز دی "آپ کو فوراً ہسپتال بلایا گیا ہے۔"

ڈاکٹر صدیقی جلدی سے ٹیلیفون پر گئے۔ پھر انہوں نے الماس کو آواز دی "بھئی معاف کرنا مجھے بھاگنا پڑ رہا ہے۔"

الماس دروازے تک آئی "کل ضرور آیئے گا ہم لوگ ویک اینڈ کے لئے پونا جا رہے ہیں۔"

ضرور —— ضرور —— گڈ نائٹ ——" ڈاکٹر صدیقی نے کہا اور باہر نکل گئے۔

بریچ کینڈی کے ہسپتال میں صحت یاب ہو کر، خورشید عالم کے ابا میاں خوش خوش پرتاپ گڈھ واپس جا چکے تھے۔ جب تک کمبالا ہل والا فلیٹ تیار نہیں ہوا جو دلہن کو جہیز میں ملا تھا، شادی کے بعد دولہا میاں سسرال ہی میں رہے۔ اکثر وہ صبح کو دفتر جانے سے قبل بالکنی میں جا کر کھڑے ہوتے۔ نیچے پہاڑ کے گھنے باغ میں سے گذرتی بل کھاتی سڑک برج خموشاں کی طرف جاتی تھی۔ دفعتاً

فوقتاً سفید براق کپڑوں میں ملبوس پارسی "نسبار" سفید رومالوں کے ذریعہ ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے قطار بنائے جنازہ اٹھائے دور پہاڑی پر چڑھتے نظر آتے۔ کوّے اور گدھ درختوں پر منتظر بیٹھے رہتے برج خموشاں کے احاطے کا پھاٹک، دور کیمپس کارنر پر کھلتا۔ پھاٹک پر ایک جھاڑ جھنکاڑ داڑھی والا خوفناک بوڑھا پھونس پارسی دربان ساکت بیٹھا رہتا تھا۔ سفید ساریوں اور سفید کپڑوں میں ملبوس سوگوار پارسی "میت چڑھانے" کے بعد سرسبز پہاڑی سے اتر کر اپنی اپنی موٹروں میں بیٹھ جاتے۔ پھاٹک کے باہر زندگی کا پُرجوش سمندر اسی طرح ٹھاٹھیں مارتا رہتا۔ مقابل کی عمارت پر ایر انڈیا کے "مہاراجہ" کا اشتہار نت نئے پُر لطف الفاظ میں ان زندہ انسانوں کو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ایک سے ایک دلچسپ شہروں تک سفر کرنے کی دعوت میں مصروف رہتا۔

"اس" نے ایک بار خط میں لکھا تھا' ذہن کی ہزاروں آنکھیں ہیں۔ دل کی آنکھ صرف ایک ہے۔ لیکن جب محبت ختم ہو جائے تو ساری زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

سمندر کی موج پل کی پل میں فنا ہو گئی، آسمان پر سے گزرنے والے بادل فضا میں تحلیل ہو چکے۔

جب وہ مری ہو گی تو کوّوں اور گدھوں نے اس کا کس طرح سواگت کیا ہو گا؟

اس طوفانی رات کو ہسپتال کے وارڈ سے نکل کر اس کی روح جب آسمانوں پر پہنچی ہو گی اور عالم بالا کے گھپ اندھیرے میں کسی دوسری روح نے اس سے ٹکرا کر پوچھا ہو گا ——

"تم کون ہو؟" —— تو اس نے جواب دیا ہو گا "پتہ نہیں —— میں کل ہی تو مری ہوں ——"

اب تک اس کی روح کہاں سے کہاں نکل گئی ہو گی مرے ہوئے انسان زیادہ تیزی سے سفر کرتے ہیں۔

تارا بائی اپنی روشن آنکھوں سے صاحب کے گھر کی ہر چیز کو ارمان اور حیرت سے دیکھتی ہے۔ وہ صاحب کو حیرت سے تکا کرتی ہے۔

الماس بیگم اب امید سے ہیں۔ بہت تارا بائی کا کام دُگنا بڑھ جائے گا۔

آج صبح آئی اسپشلسٹ ڈاکٹر صدیقی آئے تھے۔ جب تارا بائی ان کے لئے چائے لئے برآمدے میں گئی تو وہ چونک پڑے اور خوشی سے پوچھا "ارے تارا دائی! —— تم یہاں کام کر رہی ہو؟"

"جی ڈاگدر صاحب ——" تارا بائی نے شرما کر جواب دیا۔

"اب صاف سجھائی دیتا ہے؟"

"جی ڈاگدر صاحب ــــ اب سب کچھ بہت صاف سجھائی دیت ہے۔"

"گڈ ــــ" پھر وہ مسٹر اور مسز خورشید عالم سے مخاطب ہوئے۔"

"بھئی یہ لڑکی دس سال کی عمر میں اندھی ہو گئی تھی۔ مگر خوش قسمتی سے اس کا اندھا پن عارضی ثابت ہوا۔ تمہیں یاد ہے الماس تمہاری انگیجمنٹ پارٹی کی رات مجھے ہسپتال بھاگنا پڑا تھا۔ وہاں ایک خاتون مس پیر وجا دستور کا انتقال ہو گیا تھا۔ انہوں نے مرنے سے چند روز قبل اپنی آنکھیں آئی بنک کو ڈونیٹ کرنے کی وصیت کی تھی۔

لہذا ان کے مرتے ہی مجھے فوراً بلایا گیا۔ کہ ان کی آنکھوں کے ڈیلے نکال لوں۔ بے حد نرگسی آنکھیں تھیں بے چاری کی نہ جانے کون تھی غریب ــــ ایک بہری بھنڈ پارسن پلنگ کے سرہانے کھڑی بُری طرح روئے جا رہی تھی۔

بڑا المناک منظر تھا ــــ خیر۔ تو چند روز بعد اس تارا دائی کا ماموں اسے میرے پاس لایا۔ اسے کسی ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ نیا کورنیا لگانے سے اس بچی کی بینائی واپس آسکتی ہے۔

میں نے وہی مس دستور کی آنکھیں ذخیرے میں سے نکال کر ان کا کورنیا اس لڑکی کی آنکھوں پر گرافٹ کر دیا۔

دیکھو کیسی تارا ایسی آنکھیں ہو گئیں اس کی واقعی میڈیکل آج کل معجزے دکھا رہی ہے۔"

ڈاکٹر صدیقی نے بات ختم کر کے اطمینان کا سانس لے کر اطمینان سے سگریٹ جلا لیا ہے۔

مگر الماس بیگم کا چہرہ بھیانک ہو گیا ہے۔ خورشید عالم لڑکھڑاتے ہوئے اٹھ کر جیسے اندھوں کی طرح ہوا میں کچھ ٹٹولتے ٹٹولتے اپنے کمرے میں چلے گئے ہیں۔

تارا بائی ان کی یہ کیفیت دیکھ کر بھاگی بھاگی اندر جاتی ہے، تو صاحب پلٹ کر باؤلوں کی طرح تکنے لگتے ہیں۔

تارا بائی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا ـــــ وہ بوکھلائی ہوئی باورچی خانہ میں جا کر برتن دھونے میں مصروف ہو جاتی ہے ـــــ ڈور برج خموشاں پر اسی طرح گدھ اور کوّے منڈلا رہے ہیں۔

کاگا سب تن کھائیو چُن چُن کھائیو ماس
دو ئی نیناں مت کھائیو پیا ملن کی آس

آوازیں

بلّیاں رات بھر چلاتے رہنے کے بعد تھک کر سو گئی ہیں۔ کوڑے کے ٹین پر سے دبے پاؤں اُتر کر مٹیالی بلّی، جس کی ایک آنکھ کسی جنگ میں ضائع ہو چکی ہے ڈرین پائپ کے پیچھے جا بیٹھی ہے، برستی شبنم کی آواز سمندر کی پیہم سائیں سائیں میں ڈوب گئی۔ دور چاندی کی سی سطح آب پر مچھیروں نے اپنے سیاہ جال سمیٹ لیے۔ گلابی، سرمئی اور نیلی عمارتیں ابھی خوابیدہ سی ہیں۔ ان کے احاطے کا مشترکہ پھاٹک پہلو کی خوش منظر سڑک پر کھلتا ہے جو ڈھلوان پر جا کر سامنے کی بڑی سڑک سے مل جاتی ہے۔ ڈھلوان کے خاتمے پر سمندر ایک تصویر کی مانند اچانک سامنے آجاتا ہے۔ عمارتوں کے درمیان سیمنٹ کے فرش پر موٹروں کی قطار کھڑی ہے۔ احاطے کی گلابی دیوار پر جھکا ہوا تاڑ کا بلند درخت

پچھلے پہر کی ہوا میں سرسرا رہا ہے۔ بک چشم بتی جو اب تک شکار کی تاک میں چوکس ٹہل رہی تھی اب اس نے بھی اپنی آنکھ بند کر لی ہے۔ گلابی عمارت کا ہیڈ جمعدار بالٹی اُٹھائے رات کی پرچھائیوں میں سے نمودار ہوتا ہے۔ کونے کا نل کھول کر اس نے احاطے کا فرش دھونا شروع کر دیا ہے۔ دیوار کے ادھر بچھی ہوئی کھاٹ پر سے اُٹھ کر کوئی حسبِ معمول کیرتن الاپ رہا ہے۔

تم پورن برہم ہو پربھو تم انتریامی
پار برہم پرمیشور اگھٹ گھٹ کے سوامی

ادم جے جگدیش ہرے —— پربھو جے —— جگدیش ہرے

کُلّی کرنے اور کھنکارنے کی آواز —— دودھ والے کی کھڑکھڑاتی جھنجھناتی سائیکل —— صبح کے پانچ بج گئے۔ فرش دھلنے کی چھپ چھپ چھپ لال جمعدار کی جھاڑو کی سرک —— سرک —— نیچے بڑی سڑک پر اولیں بسوں کے رکنے اور چلنے کی گھڑگھڑاہٹ۔ سکھ بحری افسر کی موٹر سائیکل کا شور ملازموں کی مدھم چیخ پکار۔ گورکھا —— لالہ —— راما —— گنگا —— بھیّا —— زوں زوں زوں۔ لفٹ چلنا شروع ہو گیا۔ سمندر پر بکھرے تارے ڈوب چکے۔ چاند غائب ہو گیا۔ سرمئی عمارت کی دوسری منزل کے دریچے میں مس گُل بانو کمپاڈیا

آہستہ سے پکارتی ہے "میری —— میری ——"

"یس میم صاحب ——" میری کا باریک سا جواب۔

"ہوشنگ —— خورشید —— ہومائے ——" گلابی عمارت کی پہلی منزل میں مسز رستم واچا گاندھی کی للکار

تین بچوں کے کھٹ کھٹ کرتے چھوٹے چھوٹے قدم۔ پھاٹک پر اسکول بس کا ہارن —— "فرانسس ——" گلابی عمارت کی تیسری منزل پر مسز جولی کی ڈپٹ۔

نیچے احاطے میں موٹریں اسٹارٹ ہو رہی ہیں۔ مختلف مانوس گڑگڑاہٹیں آکاش وانی کا ٹائم سگنل۔

"یہ ریڈیو سیلون ہے۔"

"حلیمہ —— خدیجہ —— رقیہ ——" گلابی عمارت کی دوسری منزل پر مسز فاطمہ بائی، عبدالرحمٰن مورے کی نحیف سی آواز۔

"بائی بائی ممی ——" اسکول جاتی ہوئی تین بچیوں کا بشاش جواب۔

سمندر پر روشنی، بھیڑیں کے سُروں کی طرح پھیلتی جا رہی ہے۔ پارک کے سبزے، مندر کے کلس اور دکانوں پر بارش کی دچانگ پھوار۔ رنگ برنگی پلاسٹک کی برساتیوں کی چپ چپاہٹ۔ خلقت اپنے اپنے کام پر چلی۔

دھوپ تیز ہو رہی ہے۔

آیائیں سودا سلف لے کر لوٹ رہی ہیں۔ خواتین خریداری کے لئے نکلیں۔ لڑکیاں بالوں کے اونچے اونچے پہاڑ سنوار کر کالج اور دفتر روانہ ہوئیں۔ گلابی عمارت میں سے مسز جوکی ٹرانز سسٹر کندھے سے لٹکائے پنڈلیوں پر پھنسی ہوئی اونچی ساہ پتلون اور نارنجی امریکن چولی پہنے نیچے اُتریں۔ ان کا بیرہ فرانسس پکنک کی ٹوکری، فلاسک، سمندری غسل کے لباس کا تھیلہ اور تولئے سنبھال کر کار کی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا۔ مسز جوکی نے انجن اسٹارٹ کیا اور کسی دور کے ساحل کی سمت روانہ ہو گئیں۔ فرانسس کی نوجوان بیوی مارتھا گلابی دیوار کے نیچے سے اُچک کر مسکراتی ہے اور اپنے شوہر کو خدا حافظ کہتی ہے۔ فرانسس کار کے پچھلے شیشے میں سے اُسے دیکھ کر خوشی سے ہنستا ہے۔

اب صبح کے گیارہ بجے کے سناٹے میں عمارتوں کی گنگائیں اور گھانٹنیں ٹولیاں بنا بنا کر اِدھر اُدھر بیٹھی ہیں۔ بھکاریوں کا پھیرا شروع ہوتا ہے: "اے میری ماں سن میرے بھائی کا سوال —— یا حاجی ملنگ دو لیے —— اللہ کے نام پر —— رسولؐ کے نام پر ——

ہارمونیم بجا کر گانے اور ناچنے والے بچے: "اے سان ترا ہو گا مجھی پر۔ دل جلتا ہے تو جلنے دو۔ مجھے تم سے محبتی ہو گئی ہے۔ مجھے

پلکوں کی چھاؤں میں رہنے دو —— " ہارمونیم والے کی اکتاہٹ۔ گانے والوں کے چہروں کی اکتاہٹ۔ ساری زندگی کی اکتاہٹ
" کچھ ہیلپ کریں گا میم صاحب " لڑکا گاتے گاتے اوپر دیکھ گھگیاتا ہے۔ جہاں ایک بالکنی میں مسز رکمنی مینن بچّے کا فراک پام کے گملے پر پھیلا کر اندر چلی جاتی ہیں۔ لڑکا اور اس کی بہن فوراً دوسرا گانا تندہی سے شروع کر دیتے ہیں —— " میرے محبوب تجھے میری محبت کی قسم " " بھاگ جاؤ —— کائے کو بوم مارتا —— " سرمئی عمارت کے نیلی آنکھوں اور سرخ داڑھی والے پٹھان لالہ کی گرج۔
کرناٹک سنگیت کی ماہر مسز رکمنی مینن بالکنی سے اندر جا کر کمرۂ نشست سے گزرتی باورچی خانے میں چلی جاتی ہیں۔ مسز رکمنی مینن کا کمرۂ نشست کیرالا کی تہذیب کا دل کش نمونہ ہے۔ دروازے کے نزدیک کتھا کلی اسٹیج پر جلنے والے پیتل کے اونچے لیمپ میں نیک شگون کے لئے گیہوں بھرے ہیں۔ کونوں میں سرسوتی وینا اور تان پورے اور مردنگم رکھے ہوئے ہیں۔ دیواروں پر کتھا کلی رقاصوں کی تصویریں آویزاں ہیں۔ نٹ راج اور مینا کشی اماّ کی مورتیوں کے سامنے لوبان سلگ رہا ہے۔ الماریوں میں لوک کلا کے نمونے سجے ہیں۔
سرمئی عمارت کے دریچے میں سے گل بانو کمپاڈیا کو مسز رکمنی مینن

کے اس پُرسکون اور خوبصورت گھر کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اور وہ ایک بار پھر یہ طے کرتی ہے کہ وہ ہر مزجی اور اس کی دولہن کے کمرے کو آج کل کے فیشن کے مطابق اسی خالص ہندوستانی آرٹسٹک ڈھنگ سے سجائے گی۔

گھنشیام سندرا سری دھرا

گیلری کے ادھر ہونہار موسیقار کماری للتا راناڈے نے مراٹھی بھجن شروع کر دیا ہے۔

گھنشیام سندرا سری دھرا

اردن اودے جھالا اٹھی لوکری

دن مالی اودے۔ چنی منترالا

اے بن مالی ـــــ سورج نکل آیا ـــــ صبح ہو گئی ـــــ صبح شام۔ صبح شام ـــــ دن رات۔ ہر وقت۔ ہر گھڑی بھانت بھانت کی زبانوں کے الفاظ گل بانو کمپاڈیا کے کانوں کے کمزور پردوں سے ٹکرایا کرتے ہیں۔ اب سامنے مسز رکمنی بیمن روزانہ کے ریاض کے لئے تیاگ راج کا ایک تیلگو گیت الاپ رہی ہیں۔ پہلو کی نیلی عمارت میں مس چندرا موہنی کا فلیٹ ارتھاکٹ کی آواز سے گونج رہا ہے ـــــ "آئی ایم این اولڈ فیشن گرل ـــــ"

بھری دوپہر۔ سناٹا زمین پر اترتا ہے۔ دھوپ کی چلچلاہٹ۔ فضا کی اُمس۔ برسات کا حبس۔ ویرانی۔ خلاء اور اس خاموش چلچلاہٹ میں وہ آواز بلند ہوتی ہے جس نے گل بانو کمپاڈیا کے کمزور اعصاب کو پاش پاش کر دیا ہے۔ ان ساری آوازوں نے گل بانو لمپاڈیا کے کمزور اعصاب کو پاش پاش کر دیا ہے۔

"موگرا ـــــ موگرا ـــــ" موگرے کے ہار بیچنے والا تیز تیز قدم رکھتا احاطے میں گھستا ہے۔ "موگرا، موگرا" کی دہاڑ دماغ پر موگری کی طرح گرتی ہے۔ (اور نوجوان لڑکیاں بالوں میں یہ پھول سجا کر شام کو کیسی اتراتی ہوئی نکلتی ہیں۔)

"راکھ لے لو ـــــ" رکھ والی گھاٹن کی بھیانک صدا۔ "جوتا پھیر، چوپٹری، باٹلی والا۔" کباڑی کی جگر خراش چیخ۔ "موگرا ـــــ موگرا ـــــ"

"ارے کاہے کو خالی پیلی بوم مارتا۔ کئی بار بولا اس ٹیم ادھر بوم مت مارو، میم صاحب لوگ کے سونے کا ٹیم ہے۔" گورکھا کی ڈانٹ۔

گل بانو کروٹ بدلتی ہے۔ "موگرا ـــــ موگرا ـــــ" وہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتی ہے۔ "میری ـــــ"

"یس میم صاحب ـــــ"

"کچھ نہیں ـــــ جاؤ ـــــ"

"یس میم صاحب۔" میری باہر گیلری میں آجاتی ہے۔

"تمہارا بابائی کیسا ہے؟" شری متی رانا ڈے کی آیا کا سوال۔

"اس کا مگج۔ میری انگلی اپنی کنپٹی پر رکھ کر معنی خیز انداز میں گھماتی ہے۔

"پچھتر اسی برس کا ایج ہے اور دولہن کا مافک سجا رہتا ہے، منہ پہ لالی لگاتا ہے۔" آیا ہنسی۔

"بڈھا بچہ ایک برابر گنگو بائی۔" میری جواب دیتی ہے۔

اندر کمرے میں گل بانو کے سرہانے ادسنا کی جلد ادھ کھلی پڑی ہے جس کے پہلے صفحہ پر دھندلی روشنائی میں لکھا ہے:۔

"میری پیاری چھوٹی بچی گل بانو کے لئے۔ تمہارے پاپا کی طرف سے۔
بمبئی ۵ جولائی ۱۸۹۸ء"

بارش پھر برسنے لگی۔ رم جھم۔ رم جھم۔ "نہ کوئی منزل نہ ہے کوئی محفل۔ مجھے لے چل قیدی اکیلا کہیں بھی——" اب گل بانو وکٹورین صوفے پر لیٹے لیٹے اس شربتی آنکھوں اور جھبرے بھورے بالوں والی نوجوان بھکارن کی آواز پر کان لگاتی ہے جو نیچے مینہ میں بھیگتی غلط سلط متواتر گائے جا رہی تھی۔ اپنا شیر خوار بچہ پانی سے بچانے کے لئے اس نے اپنے میلے اور تار تار دوپٹے میں چھپا لیا ہے۔ گل بانو

صوفے سے اُٹھ کر جھکی جھکی پھر دریچے میں جاتی ہے۔ ”ارے ادھو کری۔“
بھکارن فوراً گانا بند کرکے پر امید شربتی آنکھوں سے اوپر دیکھتی ہے۔
”کچھ ہیلپ کرونا میم صاحب۔ ایک جونا ساری دونا میم صاحب۔“
(کھٹ دریچہ زور سے بند ہوجاتا ہے۔)

بھکارن چند منٹ بعد ایک اور فلمی غزل شروع کر دیتی ہے۔ گل بانو دریچہ کے پاس رکھی ہوئی بید کی آرام کرسی پر ٹک جاتی ہے۔“

یہ پچھلے پچیس برس سے گل بانو کمپاڈیا اس مکان میں رہ رہی ہے پچھلے پچیس برس میں یہ علاقہ ایک خاموش ساحلی خطے سے ایک پُر رونق آبادی میں تبدیل ہو گیا۔ پچھلے دس برس میں آبادی اونچی اونچی جھلملاتی عمارتوں کے مہیب جنگل میں بدل چکی ہے۔ جس طرح خالی اسٹیج پل کے پل میں دوسرے منظر کے لئے سج جاتا ہے اور ڈرامے کا نیا ایکٹ شروع ہو جاتا ہے اپنا گم نام اور غیر اہم رول ادا کرنے کے بعد پچھلے پچیس برس سے گل بانو کمپاڈیا ایک پرانے آسیب کی مانند اسٹیج کے ایک ونگ میں پردے کے پیچھے چھپی بیٹھی ہے۔ گل بانو اس محلے کی قدیم ترین عمارت کی مالکہ ہے بہت جلد اس کی موت کے بعد یہ عمارت ڈھا دی جائے گی اور یہاں ”لکثرری فلیٹ“ بن جائیں گے۔ برس ہا برس سے وہ سر پر سفید ململ کا رومال باندھے، شوخ رنگ کی جارجٹ

کی ساری پر ہیرے کا بروچ لگائے انتہائی بیش قیمت سچے موتی کی مالا سے مزیّن، نفیس ترین لیس کے بلاوز اور مخمل کی سبک سلیپر پہنے اپنے ایڈورڈین وضع کے مرصع کمرے میں چپ چاپ بیٹھی باہر کی زنّاٹے سے بدلتی ہوئی دنیا کا نظارہ کر رہی تھی۔ اس کا فلیٹ بیش قیمت "گوان پر لگاتی" فرنیچر، چینی کے مغربی مجسموں اور انگلستان کے شاہی خاندان کی تصویروں سے سجا ہوا ہے اور خود مس گل بانو کمپاڈیا آج سے ساٹھ برس قبل کے انگلستان کی ایک لینڈ لیڈی معلوم ہوتی ہے۔ آج کی دنیا میں وہ بہت مضحکہ خیز اور خبطی اور بے تکی لگتی ہے لیکن وہ کسی کو نہیں بتا سکتی کہ جب وہ ایک اٹھارہ سالہ لڑکی تھی اس وقت مضحکہ خیز اور خبطی اور بے تکی نہیں لگتی تھی۔ گل بانو کے اکلوتے مرحوم بھائی کے اکلوتے لڑکے نے جسے اس نے اپنے بیٹے کی طرح پالا تھا اسی کمرے میں آکر کہا تھا کہ وہ بمبار پائلٹ کی حیثیت سے مغربی محاذ پر جا رہا ہے —— گل بانو کو اس کی گمشدگی کی سرکاری اطلاع ملے بیس سال ہو چکے تھے۔ لیکن اسے اطمینان ہے کہ یہ اطلاع گمشدگی کی تھی موت کی نہیں۔ چنانچہ وہ اس ٹیکسی کی آواز پر کان لگائے بیٹھی رہتی ہے جو ہرمزجی کو بندرگاہ سے گھر لائے گی۔ گل بانو نے دل ہی دل میں ہرمز کے لئے بہت سی لڑکیاں بھی سوچ رکھی ہیں جن میں سے ایک

سے وہ ہر مز جی کا بیاہ کرے گی۔ لیکن بہت ممکن ہے ہر مز جی اپنے ساتھ کوئی انگریز امریکن یا یورپین بیوی لے آئے گا جو اور بھی زیادہ خوشی کی بات ہوگی۔ کیونکہ خود گل بانو کی پرورش یورپ میں ہوئی تھی اور وہ انگریز قوم کی دل وجان سے پرستار ہے۔

نیچے بارش کی آواز کے ساتھ سانخر بھکارن کی آواز بھی تیز ہوگئی ہے جو چلا چلا کر گا رہی ہے۔ "تیری پیاری پیاری صورت کو کسی کی نظر نہ لگے چشم بددور ——————"

"اری چشم بددور کی بچی جاتی ہے کہ نہیں یہاں سے۔" گورکھا اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔

پچپن سال —— گل بانو بارش کی پھوار سے بچنے کے لئے دریچے کے پٹ بند کرتی ہے اور سامنے کی دیوار پر اس کی نظر پڑ جاتی ہے۔ جہاں ایک دھندلی سی پیلی تصویر میں وہ پیرس کے باغ میں فرانسیسی گاؤن پہنے کانوں میں موتیوں کے آویزے لٹکائے بالوں کا جوڑا سر پر سجائے جھالر دار سفید چھتری سنبھالے ہلکی ہلکی بارش میں کھڑی مسکرا رہی ہے۔ پچپن سال قبل ——————

بارش تھم گئی۔ دفتروں سے موٹریں واپس آرہی ہیں، گل بانو اب دریچے میں جا کر نیلی عمارت پر نظر ڈالتی ہے۔ بالکنی میں چندرا موہنی

کھڑی ہے۔ اس نے نہایت نفیس ہاؤس گاؤن پہن رکھا ہے، بالوں میں کرلر لگے ہیں۔ وہ ابھی ابھی "بیوٹی سلیپ" لے کر اٹھی ہے، اب وہ ایک گھنٹے تک ایک طویل و عریض جھلملاتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر سنگار کرے گی جس کی بلوریں سطح شو روم کا کاونٹر معلوم ہوتی ہے، ابھی مارواڑی سیٹھ آئے گا جس نے اسے یہ فلیٹ خرید دیا ہے۔

امپالا کے رکنے کی دبیز آواز۔ مارواڑی سیٹھ اوپر پہنچتا ہے۔ چندرا موہنی فوراً کمرے میں جاتی ہے۔ "ہائی فائی" کی گونج تیز ہو گئی ہے چندرا موہنی اس کے لئے کاکٹیل بنا رہی ہے۔ پھر وہ گھڑی دیکھتی ہے۔

لفٹ نیچے جاتا ہے۔ امپالا سرمئی بھیگی ہوئی سڑک پر تیرتی کسی نائٹ کلب کی طرف نکل جاتی ہے۔

یک چشم بلی آہستہ آہستہ چلتی ڈرین پائپ پر سے کود کر شاگرد پیشے کے گلیارے میں گھس جاتی ہے۔ گلابی عمارت میں سے الٹرا فیشن ایبل لڑکیوں کے پرے۔ ہوا خوری کے لئے باہر نکل رہے ہیں۔ مسز جوبی نہا کر واپس آتی ہے، کار تیزی سے اپنے کونے میں کھڑی کر کے سرعت سے اوپر چلی جاتی ہے، سکھ بحری افسر اپنی موٹر سائیکل پر واپس آچکا ہے، بچے اسکولوں سے لوٹ کر احاطے میں بے پناہ ہلڑ مچا رہے ہیں۔ مسز فاطمہ بائی موررے کے شوہر بھی گھر آ گئے۔ وہ دونوں اپنے بیڈ روم کے دریچے

میں کھڑے حسب معمول بُری طرح جھگڑ رہے ہیں۔

"آہستہ بولو —— آواز باہر تک سنائی دے رہی ہے ——" مسٹر مورے نے جھنجھلا کر کہا۔

دریچے کا پٹ زور سے بند ہو جاتا ہے۔ مسز مورے کے رونے کی آواز۔

"مبری ——" گل بانو آہستہ آہستہ پکارتی ہے۔ "یس میم صاحب"۔ ادھر سات نمبر کا بابا بہت رو رہا ہے۔ کیا بات ہے؟" ابھی پتہ کرتا ہے میم صاحب"۔ "کھٹ —— کھٹ ——"

"یس کم ان ——" "آنٹی" —— "یس —— ہلو ڈیر ——"

فاطمہ بائی کی دس سالہ لڑکی حلیمہ دروازے میں سہمی کھڑی ہے۔

"آنٹی —— ہم ادھر سات نمبر میں رہتا ہے۔ ممی بولا ہے آپ کے پاس سیریڈون ہوگی ——؟"

گل بانو جلدی سے اٹھ کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سارا گھر چھان ڈالتی ہے۔ سیریڈون نہیں ملتی۔ "آئی ایم سو سوری مائی ڈیر" وہ ایک شفیق بڑھیا میم کی طرح کہتی ہے۔

"اٹس آل رائٹ آنٹی"۔

آسمان کالا نیلا ہو گیا۔ تاڑ کے پتوں کے پیچھے۔ قطب ستارہ تیزی سے

جگمگا رہا ہے۔ سمندر کا رنگ کاسنی ہے۔ فضا کاسنی ہے درختوں پر کوّے بسیرا لے رہے ہیں۔ شام خاموش ہے۔ جھٹ پٹا وقت ہے۔ بہتا ہوا دریا ٹھہرا۔

نیچے سڑک پر فاطمہ بائی مودی سے سر جھکائے تیز تیز قدم اُٹھاتی نکڑ کے اسٹور کی طرف جا رہی ہیں۔۔۔۔ ڈھلوان پر پہنچ کر وہ ٹھٹکتی ہیں اور نظریں اُٹھا کر تنہا قطب ستارے کو دیکھتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں وحشت ہے۔۔

سیریڈون خرید کر وہ اسٹور سے باہر نکل جاتی ہیں اور پارک میں پہنچتی ہیں جہاں بچے آیائیں اور بھیل پوری والے شور کر رہے ہیں۔ مسز فاطمہ بائی ریت پر جا کھڑی ہوتی ہیں۔ نوجوان جوڑے چٹانوں پر بیٹھے سرگوشیوں میں مصروف ہیں۔ جارجٹ کی دقیانوسی ساریوں میں ملبوس گل بانو کمپاڈیا سے زیادہ بوڑھی پارسین اور پارسی بنچوں پر ساکت بیٹھے ہیں، لہریں چٹانوں پر اپنا نشان چھوڑ کر واپس جا رہی ہیں۔۔۔۔ سمندر کا پیغام جسے کوئی نہیں جانتا۔

اندھیرا گہرا ہو گیا۔ عمارتوں کے پھاٹک پر ایک عیسائی گٹار بجا بجا کر دل دوز آواز میں انگریزی گیت گا رہا تھا۔۔۔۔ وہ مہینے میں ایک بار رات کو ادھر آتا ہے۔

دنیا زندہ ہے سڑک سے پرے شہر جگمگا رہا ہے ۔ بے رحم ، بے پروا ، بے نیاز ، دیوزاد ، مصروف شہر ، تھیٹر ، ریستوران ، دوکانیں ، کھچا کھچ بھری ہیں ۔ جھونپڑوں اور کھولیوں میں چراغ جل چکے ہیں ۔ عورتیں کارخانوں سے لوٹ کر اپنے اپنے چولہوں پر چاول اُبال رہی ہیں ۔ ان چاولوں کی کانجی اپنے بچّوں کو پلا کر وہ کل تک کے لئے ان کے پیٹ بھریں گی ۔ ہر طرف زندگی اور موت دکھ اور سکھ ، افلاس اور تو انگری کی جنگ جاری ہے ۔

چاند تارے کے نیچے سے نمودار ہوتا ہے سمندر پھر جھلملا اُٹھا ۔

گلابی عمارت میں کاٹھیاواڑ کی ایک مختصر سی سابق ریاست کے دربار صاحب کے فلیٹ میں قوالی شروع ہو گئی ہے ۔ اجمیر شریف سے آئی ہوئی قوال پارٹی میں کمسن لڑکا اپنی باریک آواز میں ساتھ ساتھ گا رہا ہے ۔ گل بانو کمپاڈیا اب غور سے قوالی سنتی ہے ۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا ۔ یہ تیزی سے بدلتا ہوا نیا ہندوستان اس کی سمجھ میں نہیں آتا اور وہ اپنے ایڈورڈین ڈرائنگ روم میں قلعہ بند بیٹھی سہا کرتی ہے کبھی کبھار وہ اپنی دقیانوسی کار میں بیٹھ کر پرنس آف ویلز میوزیم چلی جاتی ہے جہاں وہ فنون لطیفہ پر لیکچر سن لیتی ہے یا تھیوسوفیکل ہال جا کر مزید لیکچر سنتی ہے ۔ مگر اس کا دل اب اس اجنبی دنیا میں نہیں لگتا ۔

اب تینوں عمارتوں کے مکین سینما گھروں اور دعوتوں سے واپس آ رہے ہیں، احاطہ پھر موٹروں سے بھر گیا۔ قہقہے لگاتے اور زور زور سے باتیں کرتے ہوئے سب اپنے فلیٹوں کی طرف رواں ہیں۔ یہ سب برسوں سے ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں مگر کوئی کسی کا واقف یا پرسانِ حال نہیں یہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے بھی نہیں۔ یہ لوگ اپنی شادیاں اور دعوتیں بڑے بڑے ہوٹلوں میں کرتے ہیں۔ چھٹیاں قرب و جوار کی ساحلی اور پہاڑی تفریح گاہوں میں گذارتے ہیں۔ اور جب ان میں سے کسی ایک کا ستارہ گردش میں آتا ہے تو وہ خاموشی سے اس محلے سے کہیں اور چلا جاتا ہے اور کسی کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

رات بھیگ چلی۔ کہیں کہیں روشن کمروں میں چست پوش لڑکیاں اور لڑکے ابھی تک ٹوئیسٹ ناچنے میں مصروف ہیں۔

باہر بڑی سڑک کے فٹ پاتھ پر بستر بچھا دیئے گئے ہیں۔ ایک آدمی بڑے اہتمام سے گھسا ہوا پلنگ پوش اینٹوں پر بچھاتا ہے۔ بڑی نفاست سے اس کی سلوٹیں نکالتا ہے۔ پھر دوکان کی روشنی میں کتاب لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ برابر کے بستر پر تاش شروع ہو چکا ہے۔ اس کے آگے بہت سارے کنبوں نے اپنی اپنی رات کی کائنات آباد کر لی ہے۔ بارش کا ریلا آئے گا تو یہ اپنی اپنی گدڑیاں سمیت کر دوکانوں

کے تختوں کے نیچے اور کونوں کھدروں میں پناہ لیں گے۔

چاند پر سے ایک کالا بادل گزر گیا۔

گلابی عمارت کے شاگرد پیشے سے ایک عورت کی چیخ بلند ہوتی ہے وہ زور زور سے بین کر رہی ہے۔

"میم صاحب ـــــ میم صاحب ـــــ" بیرہ کی پھولی ہوئی سانس کے ساتھ اندر آتی ہے۔" وہ نیچے فرانسس بیرہ رہتا تھا نا۔ اس کا ڈیتھ ہو گیا۔ اس کا ڈیڈ بوڈی آیا ہے ـــــ وہ مورننگ میں اپنی میم صاحب کے ساتھ باہر گیا تھا۔ ادھر میم صاحب کے ایک فرینڈ نے اسکو دوسرا سے ہوچ (خانہ ساز، غیر قانونی شراب) لانے کو بولا۔ ادھر ہوچ والوں نے آپس میں دادا گیری کیا اور فرانسس کو بھی چاقو مار دیا ـــــ اب اس کا بی بی ـــــ"

"سب کھڑکیاں بند کر دو میری ـــــ"

"یس میم صاحب ـــــ"

گلابی عمارت میں مسز جولی ٹیلیفون پر جھکی ہوئی ہیں۔ ان کے شوہر ہانگ کانگ میں تجارت کرتے ہیں۔ وہ اپنے ایک پولیس افسر دوست کو سرگوشی کے انداز میں فون کر رہی ہے ـــــ "جم کل میرے ساتھ کے لارڈ میں لنچ کھاؤ گے۔"

رات کا سناٹا۔ ریڈیو پر جن من گن بج رہا ہے۔ ایک اور دن ختم ہوا۔ ایک قدم برج خموشاں کے بالکل قریب وہ گدھ اس وقت مالا بار ہل کے درختوں پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں جو بہت جلد ایک دن مجھے کھا جائیں گے۔

گل بانو کا دل اب بہت تیزی سے دھڑک رہا ہے وہ آہستہ سے اوستا کی جلد اٹھاتی ہے اور پڑھنا شروع کرتی ہے۔

بانام یزداں اہورمزدہ خدائے۔
اہرمن ادا و شاں دور آوازہ داشتار زد شکستے باد
اہرمن دیواہ، گنبہ کارداں، دشمناز د شکستے باد
از ہمہ گناہ ثبت پشیمانم —— سروش شگفتہ زیں زیں ادنا ——
سالار داماں اہو نہ مردہ بر سر۔
بنام یزد بخشندہ بخشازگارے مہرباں یا باری خدا ——

نیچے نائٹ ڈیوٹی کا گورکھا کرخت آواز میں نیپالی زبان کی رامائن پڑھ رہا ہے۔

فاطمہ بائی اپنے کمرے میں کروٹیں بدل رہی ہیں اور چپکے چپکے رو رہی ہیں، دوسرے کمرے میں مسٹر مورے اپنے کاروبار کا حساب کتاب کرتے کرتے سو چکے ہیں۔

نیلی عمارت کے نیچے امپالا آن کر رکتی ہے۔ مسز چندرا موہنی اور مارواڑی سیٹھ اوپر پہنچتے ہیں۔ گیلری میں کھڑے ہو کر بے حد موٹا سیٹھ طمانیت سے چاروں طرف نگاہ دوڑاتا ہے "کمبخت واقعی آرٹسٹ ہے۔ کس خوبصورتی سے گھر سجاتا ہے۔ اس فلیٹ پر ستّر ہزار خرچ ہو گئے۔ مگر سالا اِٹ از ورتھ اِٹ بیڈ روم ایک خنک۔ روپہلی جنّت ہے۔ سفید پلنگ پوش۔ سفید قالین۔ سفید پردے۔ گلدان میں جاپانی انداز سے سجے ہوئے بڑے بڑے سُرخ پھولوں نے کمرے کو مدھم جگمگا رہا ہے۔

آدھی رات جوار بھاٹا کی لہریں پارک تک آ آکر لوٹ رہی ہیں۔ چندرا موہنی بالکنی میں جا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ آٹھ سال قبل بھی یہی سمندر ہوگا۔ یہی لہریں، یہی چاند، مگر وہ خود ایک مختلف لڑکی تھی۔ وہ فلم اسٹار بننے کے شوق میں یہاں آئی تھی۔ مگر یکے بعد دیگرے اس کی ساری فلمیں فیل ہو گئیں۔ کیونکہ اس کا نام شہنازہ بانو رکھا گیا تھا۔ پھر اسے للی ادبرائن بنایا گیا۔ جب یہ نام بھی راس نہ آیا تو وہ چندرا موہنی بنی۔ اس کی پبلسٹی اس طرح کی گئی کہ وہ ایک ریاست کی راج کماری ہے جو آرٹ کی خدمت کی لگن اپنے دل میں رکھتی ہے۔ اس کی تصویریں یوں چھپیں کہ وہ اپنے السیشین کو پیار کر رہی ہے۔ گل دان میں پھول سجا رہی ہے۔

درخت کی شاخ سے جھول رہی ہے "آؤٹ ڈور گرل" کی حیثیت سے سمندر کے کنارے صحت اور شگفتگی کا مجسمہ بنی کھڑی ہے۔ انگریزی کے فلمی رسالوں میں اس کے نام سے اس کے فلسفۂ حیات کے متعلق مضمون بھی شائع ہوئے ہیں جن میں شیکسپیئر، ملٹن اور غالب کے حوالے دیئے گئے تھے اور جنھیں ایک فاقہ کش صحافی نے لکھا تھا مگر کامیاب فلم اسٹار بننا اس کی قسمت میں نہ تھا۔ چنانچہ وہ "سوسائٹی گرل" بن گئی۔ اس کے حلقۂ احباب میں سابق مہاراجگان اور نوابین، اعلیٰ حکام۔ دیسی اور بدیسی تاجر اور فلم ایکٹر شامل تھے۔ شروع شروع میں کچھ عرصہ ماڈل اور محبوبہ کی حیثیت سے مصوروں کے حلقے میں بھی رہی تھی۔ مگر ان مصوروں کے پاس پیسہ نہ تھا۔ لہٰذا مجبوراً وہ اپنے پرانے سرکٹ واپس آ گئی۔ ان مہاراجگان اور تجار اور حکام کے عادات و خصائل طرزِ گفتگو اور ذہنیت اس کے لئے جان لیوا تھے۔ لیکن غالب اور امپالا جب اس کے سامنے آئے تو اس نے امپالا کا انتخاب کیا۔

چندرا موہنی بالکنی میں کھڑے کھڑے ایک نظر مسز فاطمہ بائی کے دریچے پر ڈالتی ہے۔ کتنی خوش نصیب بیوی ہیں۔ اپنے گھر کی رانی۔ اپنے بچوں کی ماں اپنے پتی کی دلاری۔ جب وہ اپنے پتی اور بچوں کے ساتھ باہر نکلتی ہیں تو کتنی مسرور، مطمئن اور گمبھیر نظر آتی ہیں۔ ایک میں ہوں۔

یہ چاند اسی سمے جبلپور کے ایک گھر کے چھوٹے سے آنگن پر جھکا ہوگا۔ جہاں اس کے سیدھے سادے بھولے بھالے گھر والے سو رہے ہوں گے۔ جو سمجھتے ہیں کہ انکی ہونہار بیٹی بمبئی میں آرٹ کی خدمت میں مصروف ہے۔ وہ چھوٹا سا، گم نام سا گھر۔ جب میں اس محل نما فلیٹ میں براج رہی ہوں۔۔۔۔شادی۔۔۔؟۔۔۔عزت؟۔۔۔

شادی میں کیا رکھا ہے۔ اور عزّت بڑی اضافی چیز ہے۔ چندرا موہنی چھنگلیا سے آنسو پونچھتی ہے۔ اور خشک روپہلی جنّت میں واپس آجاتی ہے۔ جہاں سیٹھ جی کے خراٹے اونچے ہو جاتے ہیں۔

نیچے شاگرد پیشے میں مارتھا فرانسس کی لاش کے صندوق کے نزدیک اوندھی پڑی کراہ رہی ہے۔ سیاہ تابوت کے سرہانے اور پائینتی پر جلتی ہوئی اونچی موم بتی کی لَو مدھم اور خوفناک ہے۔ فادر دعا مانگ کر اور مارتھا کو صبر کی تلقین کر کے واپس جا چکا ہے۔ مارتھا اتنے بڑے شہر کے اس لرزہ خیز جنگل میں بالکل تنہا ہے۔ میم صاحب نے آیا کے ہاتھ اسے دو سو روپے بھجوائے ہیں۔ فرانسس کی زندگی کی قیمت۔ وہ اپنے گلے میں لٹکی ہوئی، چاندی کی ننھی سی صلیب کو مٹھی میں زور سے بھینچ لیتی ہے۔

اپنے ڈرائنگ روم میں مسز جوگلی نے دوسرا سگرٹ سلگا لیا ہے۔

ڈیم ــــ ڈیم ـــــ اس گدھے ردبن چوپڑا کی وجہ سے ان کو خواہ مخواہ اس مرد ڑا اور پولیس کے لفڑے میں پھنسنا پڑا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ کل صبح پہلے ہوائی جہاز سے ہانگ کانگ چلی جائیں گی۔

گل بانو کمپاڈیا نے رات کی مکمل خاموشی میں اب دور کی آوازوں پر کان لگا دیئے ہیں۔ سمندر کی سنسناہٹ جو یک لخت بہت نزدیک معلوم ہوتی ہے۔ دور سڑک پر گذرتی ہوئی اکا دکا موٹر ـــــ کسی عمارت میں ٹرنک کال کی گھنٹی متواتر بجے جا رہی ہے۔ فضا خاموش، سمندر روشن، آب نقرئی، بارش نقرئی۔ ہوا اطلسی، میری بھی سو گئی۔ کس مزے سے فرش پر ٹانگیں پھیلائے پڑی ہے ـــــ اب بلیاں تینوں عمارتوں کے کونوں کھدروں سے نکل کر گلابی دیوار تلے جمع ہو گئی ہیں ـــــ یک چشم بلی کیچڑ میں لت پت، ڈرین پائپ پر سے کود کر کوڑے کے ڈرم پر آ گئی ہے۔ ان سب نے روز رات کی طرح اونچی اونچی بھیانک آوازوں میں رونا شروع کر دیا۔

بلیاں عورتوں کی طرح رو رہی ہیں۔

حسب نسب

لمبے چوڑے پھیلے ہوئے غسلخانے میں دن کو بھی اندھیرا رہتا تھا۔ پیپل کے چھال پال تیتر ٹرے، اونچا حمام، مٹکے، چوکی، رنگ برنگی صابن دانیاں، بیلین، ابٹن، جھانوے، لوٹے، آفتابے، لگے، کھونٹیوں پر غراروں اور میلے دوپٹوں کا انبار، آنولوں، ریٹھوں سے بھری طشتریاں۔ اندھیرا خندوس مولا علی بابا چالیس چور کا غار! لیکن یہی غسلخانہ چھمی بیگم کی دکھی زندگی میں وقت بے وقت جائے پناہ کا کام دیتا تھا۔ اسی کی ہرے شیشوں والی بند کھڑکی کا رخ چنبیلی والے مکان کی طرف تھا۔ اس کے ایک شیشے کا رنگ ناخون سے ذرا سا کھرچ کر چھمی بیگم نے باہر جھانکنے کا انتظام بھی کر رکھا تھا کہ چھمی بیگم کے لاڈلے ابنِ عم اچھو

بھائی چنبیلی والے مکان میں رہتے تھے۔ پہروں وہ اس شیشے میں سے سامنے والے گھر کو اس طرح تکتیں جیسے شاہجہان اپنے قید خانے میں تاج محل کو دیکھا کرتا تھا۔

اوسط درجے کے اس زمیندار خاندان کے آبائی گھر کے دو حصے تھے۔ باہر والا مردانہ جس کے صحن چمن میں چنبیلی کی گھنی جھاڑیاں تھیں "چنبیلی والا مکان" کہلاتا تھا۔ زنانے حصے کے آنگن میں املی کا سایہ دار درخت کھڑا تھا اس لئے سارے محلے میں اس کا نام "املی والا مکان" پڑ گیا تھا۔ دونوں آنگنوں کی درمیانی دیوار میں آمد و رفت کے لئے ایک کھڑکی تھی۔

چھمی بی کے ابا اور اچو بھائی کے ابا ایک ساتھ رہتے تھے۔ چھمی بی کے پیدا ہوتے ہی اچو بھائی سے منگنی ہو چکی تھی۔ نو دس سال کی عمر میں منگیتر سے کا ناپردہ کرا دیا گیا تھا۔ اچو بھائی بلا کے خوبصورت اور کھلنڈرے تھے۔ اکلوتے بیٹے اور دو بھائیوں کے گھر کا واحد چراغ تھے۔ اس لئے وہ تو جی بھر کے بگڑے۔ پتنگ بازی، کبوتر بازی، یہ بازی، وہ بازی۔ لیکن بڑے ابا کو اطمینان تھا کہ بیاہ ہوتے ہی سدھر جائیں گے۔ چھمی بیگم تو ہوش سنبھالتے ہی انہیں اپنا مجازی خدا سمجھنے لگی تھیں۔ ماں باپ کی اکلوتی وہ بھی تھیں۔ ان کے ناز بھی کم نہ اٹھائے جاتے۔ ضدی غصیلی اور ٹھنکنے والی چھمی بیگم سولہ سال کی ہوئیں تو شادی کی تاریخ مقرر

کر دی گئی۔ دونوں طرف دھوم دھام سے تیاریاں ہونے لگیں کہ اچانک خدا نے اس سکھی اور خوش حال گھرانے کی بساط ہی الٹ دی۔ اس سال شاہجہان پور میں جو ہیضہ کی وبا پھیلی اس میں پندرہ دن کے اندر اندر چھمی بیگم کے ابا اور اماں دونوں چٹ پٹ ہو گئے۔ چھمی بیگم پر قیامت گزر گئی لیکن ابھی تایا تائی کا سایہ سر پر سلامت تھا سب سے بڑی بات یہ کہ اچھو بھائی سے بیاہ ہونے والا تھا۔ چھمی بیگم ماں باپ کا سوگ منانے کے بعد پھر مستقبل کے سہانے خواب دیکھنے میں مصروف ہو گئیں۔

شادی کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کر دی گئی تھی لیکن اس سے پہلے کہ بڑے ابا نئی تاریخ مقرر کریں ان کا بیٹھے بٹھائے ہارٹ فیل ہو گیا۔ بڑے ابا کے مرتے ہی اچھو بھائی نے کہا کہ وہ چند مقدموں کے معاملات سنبھالنے لکھنؤ جا رہے ہیں اور صاحبوں کے ساتھ اڑنچھو ہو گئے۔ اب املی والے مکان میں رہ گئیں بڑی اماں جو بالکل باؤلی ہو رہی تھیں اور چھمی بیگم۔ مردانہ سونا ہو گیا۔ ڈیوڑھی پر پرانے ملازم دھموں خاں ڈنڈا سنبھالے بیٹھے رہ گئے۔ اندر سلامت بوا اور ان کی لڑکیاں روتی ناک سنکتی کھانا پکانے میں جٹی رہتیں گھر کی حفاظت کے لئے بڑی اماں نے ایک بوڑھے رشتے دار رحمٰن خاں کو بریلی سے بلوا بھیجا جو چنبیلی والے دالان میں کھٹیا ڈال کر پڑ رہے۔

اچّو بھائی لکھنؤ گئے تو وہیں کے ہو رہے ہر خط میں اماں کو لکھ بھیجتے کہ مقدمے کی تاریخ پڑ گئی ہے۔ مہینے دو مہینے میں آجاؤں گا۔ پورے چھ مہینے بعد آئے تو اماں نے شادی کا ذکر چھیڑا۔ بولے جب تک زمینوں کے معاملات نہیں سدھرتے میں شادی وادی نہیں کرنے کا۔

اس کے بعد پھر لکھنؤ!

جبھی سے چھمّی بیگم تاریک غسلخانے کے کونے میں میلے کپڑوں کے ڈھیر پر بیٹھ کر چپکے چپکے رونے لگیں۔

اب چھمّی بیگم انیس سال کی ہو چکی تھیں۔ اچّو بھائی نے شاید طے کر لیا تھا کہ لکھنؤ ہی میں رہیں گے۔ لوگوں نے آکر بتایا تھا کہ وہاں خوب رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ چھمّی بیگم بھی نہ جانے کیسا نصیب لے کر آئی تھیں۔ ایک دن بڑی اماں پر دل کا دورہ پڑا۔ اور وہ بھی چل بسیں۔

اب چھمّی بیگم تن تنہا حق حیران رہ گئیں۔ آنگن میں الّو بولنے لگا۔ مزید حفاظت کے لئے اندھے دھندے ملّن خاں چنبیلی والے مکان سے املی والے مکان میں منتقل ہو گئے۔ ادھر دالان میں پڑے وہ کھانسا کرتے۔ ڈیوڑھی میں دھمّہ خاں کھانستا رہتا۔

اچّو بھائی ماں کے مرنے میں آئے تھے۔ تیجا کرتے ہی واپس چلے گئے کس طرح انہوں نے بیچ منجدھار میں چھمّی بیگم کا ساتھ چھوڑا۔ اللہ

اللہ! جب وہ یہ سب سوچتیں تو کلیجہ پھٹنے لگتا۔ مہینے کے مہینے لکھنؤ سے دو سو روپے کا منی آرڈر آ جاتا یا کبھی کبھار للّن خاں کے نام خیر خیریت پوچھنے کا خط۔

للّن خاں کی بیوی اور بیٹی بھی بریلی سے آ گئی تھیں لیکن اپنی تنک مزاجی کی وجہ سے چھمّی بیگم کی ان دونوں سے ایک دن نہ بنی۔ دن بھر ان رشتہ داروں سے لڑنے جھگڑنے یا آپ ہی آپ تلملانے اور کلپنے کے بعد چھمّی بیگم پھر غسلخانے میں گھس جاتیں اور روتیں یا "شاہجہانی شیشے" میں سے چنبیلی والے مکان کو تکا کرتیں۔ یہ زندگی بھی کیسی زندگی ہے! ابھی سب کچھ ہے ابھی کچھ بھی نہیں! کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ اس گھر میں کتنی رونق تھی۔ دالان میں آرام کرسیاں پڑی ہیں۔ صحن میں مونڈھے بچھے ہیں، گیس کے ہنڈے سنسنا رہے ہیں۔ ابا اور بڑے ابا کے دوستوں کی محفل جمی ہے، مشاعرے ہو رہے ہیں، قوال گا رہا ہے۔ جب اجو بھائی کے دوست احباب آتے تو اجو آنگن والی کھڑکی میں آ کر کھنکارتے اور ایک مخصوص آواز میں آہستہ سے پکارتے "ارے بھئی چھمّو! ذرا چائے تو بھجوا دو۔"

اس بھرے پُرے گھر کو کس کی نظر کھا گئی۔

اپنی اس شدید یاس اور نا اُمیدی کے باوجود چھمّی بیگم کو یقین تھا کہ

ایک نہ ایک دن اجو واپس آئیں گے۔ چنبیلی والا مکان پھر آباد ہو گا۔

جمعے کے جمعے وہ مردانے مکان میں جاتیں۔ دھمو خاں اور سلامت بوا کی لڑکیوں کے ساتھ مل کر باغ کے جھاڑ جھنکاڑ کی صفائی کرواتیں۔ دالان کے جالے صاف کئے جاتے۔ اندر کے کمرے مقفّل تھے۔ دروازے کے شیشوں میں سے جھانک کر وہ بڑے ابا، ابا اور اجو کے کمرے پر نظر ڈالتیں اور سر ہلاتی، ٹھنڈی آہیں بھرتی واپس آجاتیں۔

چھمی بیگم تیس سال کی ہو گئیں۔ بال وقت سے پہلے سفید ہو چلے۔ اب انہوں نے چنبیلی کے باغ کی دیکھ بھال بھی چھوڑ دی۔ دل دُنیا سے اچاٹ سا ہو گیا۔ لیکن غصّے اور طنطنے کا عالم وہی رہا۔ بلکہ اب عمر کی پختگی کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

ان کی اس تمکنت اور طنطنے کے لئے وجوہات کچھ کم نہ تھیں۔ ماں باپ خالص اصل نسل روہیلے پٹھان۔ دادا، پردادا ہفت ہزاری نہ سہی ایک ہزاری دو ہزاری (یا نگوڑے جو کچھ بھی وہ ہوتے تھے) ضرور ہی رہے ہوں گے۔ سارے کنبے کا سُرخ و سپید رنگ اور پٹھانی خودداری اور غصّہ اس حقیقت کا کھلا ثبوت تھا کہ اس خاندان میں کھیل کبھی نہ ہوئی۔ ماضی کے اُن جُغادری روہیلہ سرداروں کے نام لیوا اس کنبے کے حسب نسب پر کوئی آنچ نہ آنے پائے! اس فکر میں وہ بالکل قلعہ

بند ہو کر بیٹھ رہیں۔ محلّے کی عورتوں سے بھی ملنا جلنا بند کر دیا۔ بیواؤں کے سے سفید کپڑے پہننے لگیں۔ اُن کا زیادہ وقت مصلّے پر گذرتا۔ اکثر دوپہر کے سنّاٹے میں سلامت بُوا آنگن کی کھڑکی میں بیٹھ کر زردہ پھانکتے ہوئے بڑی ڈراؤنی آواز میں آپ سے آپ بڑبڑاتیں ——

"باری تالا فرماتا ہے مجھے دو وخت اپنے بندوں پر ہنسی آتی ہے۔ ایک جب جسے میں بنا رہا ہوں اُسے بگاڑنے کی کوشش کرے اور دوجب جسے میں بگاڑ رہا ہوں۔ وہ اپنے آپ کو بنانے کی کوشش کرے۔ بس دو وخت" اور چھمّی بیگم دہل کر ڈانٹتیں "اے سلامت بوا! نحوست کی باتیں مت کرو" لیکن سلامت بُوا اطمینان سے اسی طرح بڑبڑاتی رہتیں۔

اس روز نوچندی جمعرات تھی۔ چھمّی بیگم غسلخانے میں نہا رہی تھیں۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ حمام کے نیچے سلگتے انگارے کب کے بجھ چکے تھے اور چھمّی بیگم کو کپکپی سی چڑھ رہی تھی۔ جلدی سے بال تولیہ میں لپیٹ کر کھڑاؤیں پہن رہی تھیں۔ جب باہر سے سلامت بُوا کی سڑیل نواسی نے زور سے غسلخانے کے دیمک لگے کواڑ کی کنڈی کھڑکھڑائی "آپا! جلدی نکلو"

"ارے کیا ہے باؤلی!" چھمّی بیگم نے جھنجھلا کر آواز دی۔

"آپا چنبیلی والے مکان میں آپ سے کہا ہے کہ چار پانچ جنوں

کے لئے چائے بھجوا دو جلدی!"

"کیا؟ ——— کیا؟" چھمی کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ انہوں نے جلدی سے "شاہجہانی شیشے" سے آنکھ لگا دی۔

صحن کا پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ باہر دو تانگے کھڑے ہوئے تھے۔ دو تین اُلٹے سیدھے سامان اتروا رہے تھے۔ ایک سیاہ فام لیکن تیکھے نقشے والی عورت سُرخ جارجٹ کی ساڑی پہنے ہری بنارسی شال میں لپٹی دالان میں مونڈھے پر بیٹھی اطمینان سے گھٹنے ہلا ہلا کر نوکروں کو احکام دے رہی تھی۔ ایک اس کی ہم شکل تیرہ چودہ سالہ ٹری شکل والی اُچھال چھکا سی لڑکی کاسنی شلوار قمیض پہنے فرش پر اکڑوں بیٹھی ایک بکس کھولنے میں مشغول تھی۔ اتنے میں اندر سے اجّو بھائی ——— جی ہاں۔ ہمیشہ کی طرح بانکے چھبیلے اجّو بھائی دالان میں آئے۔ جھک کر اس لال چڑیل سے کچھ کہا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔ چھمّی بیگم کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ نیم تاریک غسلخانہ اب بالکل ہی اندھیرا کنواں بن گیا۔ انہوں نے جلدی سے ایک کھونٹی پکڑی، لڑکھڑاتی ہوئی باہر آئیں اور بے سدھ ہو کر اپنے بستر پر گر گئیں۔

بات یہ تھی کہ اجّو بھائی جنہوں نے برسوں سے لکھنؤ والی کلّو کو گھر ڈال رکھا تھا۔ اب باقاعدہ نکاح کر کے اسے اپنے ساتھ لے آئے

تھے۔ کاسنی شلوار والی لڑکی اشرفی گلو اپنے ساتھ لائی تھی۔ اجو بھائی کی بہن تھی۔

شام کو اجو بھائی پردہ کروائے بغیر دھڑدھڑاتے زنانے میں چلے آئے اور دالان میں پہنچ کر پکارا "ارے بھئی چھمو۔ آؤ اپنی بھابی سے مل لو!"

چھمی بیگم کانپ کر رہ گئیں۔ پلنگ سے اٹھ کر پھر غسلخانے میں جا گھسیں اور زور سے چٹخنی چڑھا دی۔ اجو بھائی ذرا چور سے بنے دالان کے ایک در میں کھڑے رہے گلو ان کے پیچھے کھڑی تھی۔ دونوں میاں بیوی چند منٹ تک اسی طرح چپ چاپ کھڑے رہے۔ اور پھر سر جھکائے چنبیلی والے مکان واپس چلے گئے۔

اس دن کے بعد سے چھمی بیگم کی دنیا بدل گئی اب وہ سارا دن قرآن شریف ہی پڑھا کرتیں۔ اجو بھائی نے انہیں اتنے برسوں ہوا میں معلق رکھ کے ان کی زندگی تباہ کر کے کسی اور سے شادی کر لی۔ اس ناقابل برداشت صدمے سے زیادہ دہشت انہیں اس بات کی تھی کہ انہوں نے گلو بائی طوائف سے نکاح کر کے خاندان کا حسب نسب برباد کر دیا!۔

چھمی بیگم اس جرم کے لئے انہیں مرتے دم تک معاف نہ کر سکتی تھیں۔ گلو نے کئی بار ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اکثر وہ آنگن کی کھڑکی میں آکر آہستہ سے کہتیں "بیٹا کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیجئے۔" کبھی کوئی

خاص کھانا پکتا تو نوکر کے ہاتھ بیلنی بھجواتیں۔ لیکن چھمی بیگم نے دھمو خاں کو حکم دے رکھا تھا کہ چنبیلی والے مکان سے کوئی چڑیا کا بچہ بھی اس طرف آئے تو اس کی ٹانگیں توڑ دو۔ گھر واپس آنے کے دوسرے مہینے اچو بھائی نے ملن خاں کے ہاتھ دو سو روپے بھجوائے جو اب تک لکھنؤ سے بھیجا کرتے تھے۔ لیکن اب صورت حال بدل چکی تھی۔

چھمی بیگم کھڑکی میں جا کر للکاریں "جمعہ خاں مرحوم کی بیٹی اور شبو خاں مرحوم کی بھتیجی چکلے سے آیا ہوا ایک پیسہ بھی اپنے اوپر حرام سمجھتی ہے! ملن خاں غیرت والے پٹھان ہو تو جا کر یہ دو سو روپئے بھیجنے والوں کے منہ پر دے مارو!" یہ رجز پڑھ کر انہوں نے کھڑکی کا دروازہ بند کیا اور اس میں یہ موٹا قفل ڈال دیا۔

اب چھمی بیگم اپنے زیور بیچ کر گذر بسر کرنے لگیں۔ زیور ختم ہو گئے تو گھر کا قیمتی پرانا سامان کباڑی کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔ لیکن بھوک ایک دائمی مرض ہے۔ جس کا وقتی علاج کافی نہیں اور چھمی بیگم کو دھمو خاں، ملن خاں، سلامت بوا اور ان کے چلنگڑ لونڈوں کا پیٹ بھی بھرنا تھا۔ انہوں نے گھر میں قرآن شریف اور اردو پڑھانے کے لئے بچیوں کا مکتب کھول لیا۔ محلے والوں کی سلائی کرنے لگیں۔ جب محنت کرتے کرتے بیمار پڑ گئیں اور پہلا کر بخار چڑھ آیا تو سلامت بوا

ہڑبڑا گئیں اور غصّے سے بولیں "بی بی! کیا آن پر جان دیدو گی۔ ایسی بھی کیا نگوڑی آن!" لیکن چھمّی بیگم پہ غنودگی طاری تھی۔ سلامت بھاگی بھاگی چنبیلی والے مکان پہنچیں۔

کلّو فوراً سر پر برقعہ ڈال کر گلی کے راستے اندر آئی۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ کلّو ساری رات نند کی پٹی سے لگی بیٹھی رہی۔ اجّو بھائی نے کئی بار آکر دکھیاری چچازاد بہن کی حالت دیکھی۔ لیکن شاید اب بھی اس بے انصافی کا احساس انہیں نہ ہوا جو انہوں نے چھمّی بیگم کے ساتھ کی تھی کیونکہ بقول سلامت بُوا۔ اس کالی کلوٹی کلّو نے انہیں اُلّو کا گوشت کھلا رکھا تھا۔

چھمّی بیگم کو جونہی ہوش آیا، آنکھیں کھولیں اور کلّو کا متفکر چہرہ سامنے دیکھا تو ان پر غم و غصّے کا بھوت پھر سوار ہو گیا۔ کلّو ان کے پٹھانی جلال سے بے حد خوف زدہ تھی۔ فوراً کان دبا کر اپنے گھر واپس بھاگ گئی۔

بیشتر طوائفوں کی طرح جو شادی کر کے بے حد وفا شعار بیویاں ثابت ہوتی ہیں، کلّو بھی بڑی پتی ورتا عورت تھی۔ اس کی سب سے بڑی تمنا یہی تھی کہ چھمّی بیگم اسے کُنبے کی بہو اور اپنی بھاوج سمجھ کر اونچی والے مکان میں داخل کر لیں۔ اس کی یہ تمنا کبھی پوری نہ ہوئی۔

دس سال نکل گئے۔ اجّو بھائی کو چھمّی بیگم کے رشتے کی فکر بھی تھی۔ لیکن چھمّی بیگم ادھیڑ ہو چکی تھیں۔ اب ان سے شادی کون کرے گا!۔

چھمی بیگم ان سے اور کلو سے اسی طرح شدید پردہ کرتی تھیں۔ اسی طرح مدرسہ چلا کر گزر کر رہی تھیں کہ ملک تقسیم ہوگیا۔ آدھا شاہجہان پور خالی ہوگیا ان کے مکتب کی ساری لڑکیاں اپنے اپنے ماں باپ کے ساتھ پاکستان چلی گئیں۔ چھمی بیگم کے ہاں روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ اسی زمانے میں شامت اعمال کہ کسی کام سے اچھو بھائی دلی گئے اور فسادوں میں وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ جب ان کی سنائی آئی ہے کلو پچھاڑیں کھانے لگی۔ چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ آنگن کی کھڑکی پر مکّے مار مار کر ہاتھ لہولہان کر لئے۔ "بٹیا! ۔ بٹیا! دروازہ کھولئے۔ ہائے بٹیا۔ بٹیا۔ ارے میں کہیں کی نہ رہی!"

چھمی بیگم دالان کے تخت پر بے خبر سو رہی تھیں۔ بین سن کر جاگ اٹھیں۔ گھبرا کر دیوار کی کیل سے ٹنگی کنجی اتاری تالا کھولا۔ کلو بال بکھرائے بھتنی کی طرح کھڑی چیخ رہی تھی "ارے لوگو! میرا سہاگ لٹ گیا۔۔۔۔ ہائے بٹیا میری مانگ اجڑ گئی!!" اس نے آگے بڑھ کر چھمی بیگم سے لپٹنا چاہا۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔ نیند سے بوجھل آنکھیں ملیں اور اچانک ان کی سمجھ میں بات آگئی۔ تب وہ کھڑکی میں بیٹھ گئیں۔ سفید دوپٹہ منہ پہ رکھ لیا اور سسک سسک کر رونے لگیں اور روتے روتے بولیں "اری مردار! تو تو آج بیوہ ہوئی ہے، میں بدبخت تو سدا کی بیوہ

ہوں !"

اچو بھائی کے چہلم کے بعد ہی گلّو نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ اس اس کی لڑکی اشرفی جس کا چند سال پہلے اچو بھائی مرحوم نے اپنے کسی مصاحب سے نکاح کروا دیا تھا، لکھنؤ سے آئی۔ چنبیلی والے مکان کے ساز و سامان پر قبضہ کیا اور سب چیزیں چھکڑوں پر لدوا کر چلتی بنی۔ چھمّی بیگم غسلخانے کے شیشے میں سے بے نیازی کے ساتھ فانی دنیا کے یہ سارے تماشے دیکھتی رہیں۔

چنبیلی والے مکان پر کسٹوڈین کا تالا پڑ گیا۔ کیونکہ چھمّی بیگم عدالت میں یہ کسی طرح ثبوت نہ کر پائیں کہ اچو بھائی پاکستان نہیں گئے۔ بلوے میں مارے گئے ہیں۔ خود کسی پرانے آسیب کی طرح وہ املی والے مکان میں موجود رہیں۔ ملّن خاں اور دمّو خاں دونوں بڑھاپے اور فاقہ کشی کی وجہ سے مر گئے۔ سلامت بُوا پر فالج گر گیا۔ ان کی لڑکیاں اور داماد پاکستان چلے گئے۔ چھمّی بیگم سلائی کر کے پیٹ پالتی رہیں۔ تن تنہا مکان میں رہتے اب انہیں ڈر نہیں لگتا تھا۔ کیونکہ سر سفید ہو چکا تھا۔ بہت جلد محلّے کی بڑی بوڑھی کہلائیں گی۔

کچھ عرصہ بعد چنبیلی والے مکان میں ایک سکھ شرنارتھی ڈاکٹر آن بسے۔ کبھی کبھار سردارنیاں آنگن کی کھڑکی میں آ بیٹھتیں اور وہ اور چھمّی

بیگم اپنے اپنے دکھ سکھ کی باتیں کرتیں۔ ڈاکٹر صاحب کی لڑکی چمن جیت کی شادی نئی دہلی میں کسی سرکاری افسر سے ہوئی تھی۔

اب کی بار میکے آئی تو اس نے اپنی ماں سے کہا کہ اس کے شوہر کے مسلمان افسر اعلیٰ کی بیگم کو استانی کی ضرورت ہے جو گھر پر رہ کر ان کے بچوں کو اردو اور قرآن پڑھائے "میں تو چھمی ماسی سے کہتے ڈرتی ہوں۔ انہیں جلال آجائے گا۔ آپ کہہ کر دیکھیے۔"

بڑی سردارنی نے چھمی بیگم سے اس ملازمت کا ذکر کیا۔ سمجھایا بجھایا۔ "بہن جی! اس تنگ دستی اور تنہائی میں کب تک بسر کرو گی۔ دلّی چلی جاؤ۔ صبیح الدین صاحب کے ہاں عزت و آرام سے بڑھاپا کٹ جائے گا۔"

چھمی بیگم کا غصہ کب کا دھیما پڑ چکا تھا جوش و خروش، طنطنے اور جلال میں کمی آ گئی تھی۔ ان کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی کہ کل کلاں کو مر گئیں تو آخر وقت میں لیٰسین شریف پڑھنے والا تو کوئی ہونا چاہیے۔

قصہ مختصر یہ کہ چھمی بیگم برقع اوڑھ صرف ایک بکس اور بستر اور لوٹا ساتھ لے کر گھر سے نکلیں جو اب تک بالکل کھنڈر ہو چکا تھا اور جس کے کھنڈر ہونے کا [illegible] قطعی غم نہ تھا۔ کیونکہ وہ تیاگ اور سنیاس کے اسٹیج پر پہنچ چکی تھیں۔ و[illegible]یل میں بیٹھ کر دلّی پہنچیں۔ جہاں ریلوے اسٹیشن پر بے چاری بیگم [illegible]رین چمن جیت سندر سنگھ کا خط ملنے پر

کار ہے کر خود انہیں گھر لے جانے کے لئے آ گئی تھیں۔

اس روز چھمی بیگم بنتِ جمعہ خاں زمیندار شاہجہان پور "مغلانی بی" بن گئیں۔

چھمی بیگم نے پورے بارہ سال سفید براق دوپٹہ ماتھے پہ لپیٹے صبیح الدین صاحب کے گھر میں گزار دیئے۔ بچے جنہیں وہ اُردو اور قرآن شریف پڑھانے آئی تھیں بڑے ہو گئے۔ بڑا لڑکا بی اے کے بعد اپنے چچا کے پاس پاکستان بھیج دیا گیا۔ منجھلی لڑکی بھی کراچی چلی گئی۔ چھوٹی لڑکی کالج پہنچ گئی۔ اب بیگم صبیح الدین کو چھمی بیگم کی ضرورت نہ تھی۔ صبیح الدین صاحب ریٹائرڈ ہو کر اپنے وطن مرزا پور جانے والے تھے۔ دہلی سے روانہ ہونے کے پہلے بیگم صبیح الدین نے چھمی بیگم کو اپنی دوست بیگم راشد علی کے ہاں رکھوا دیا۔ راشد علی صاحب بھی حکومت ہند کے اعلیٰ افسر تھے۔

چھمی بیگم صبیح الدین صاحب کے ہاں بہت سکھ چین سے رہی تھیں۔ ان سے گھر کے بزرگوں کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ انہیں تینوں بچوں سے بے حد محبت ہو گئی تھی۔ غصہ بھی بہت کم آتا تھا۔ اگر آتا بھی تو اپنی مجبوریوں کا خیال کر کے پی جاتی تھیں اب وہ تیہا دکھائیں بھی کس پہ۔ ناز اٹھانے، خفگی برداشت کرنے والے سب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ کبھی کبھی انہیں کلو کا خیال بھی آ جاتا اور سوچتیں نہ جانے کمبخت اب کہاں اور

کس حال میں ہوگی یا شاید وہ بھی مر کھپ گئی ہو۔ آج کل زندگیوں کا کیا بھروسہ ہے۔

بیگم راشد علی بیگم صبیح الدین کی طرح دردمند اور دیندار خاتون تو نہ تھیں۔ آج کل کی ماڈرن لڑکی تھیں۔ لیکن عزت انہوں نے بھی چھمی بیگم کی بہت کی۔ یہاں بھی وہ گھر کے فرد کی حیثیت سے رہتیں۔ راشد علی صاحب ان کا بہت خیال رکھتے۔ ان کی بارعب، پروقار شکل وصورت اور اعلیٰ نسبی سے سب ہی متاثر تھے۔ بیگم راشد اکثر سہیلیوں سے کہتیں۔ "بھئی واقعی زندگیوں میں کیسے کیسے انقلاب آتے ہیں۔ پل کے پل میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ ہماری مغلانی بی کا قصہ سنا ہے آپ نے؟ یہ شاہجہان پور کے فلاں خاندان۔" اور سننے والی خواتین سر ہلا کر ٹھنڈی سانس بھرتیں اور دوسرے اسی طرح کے عبرت انگیز نصیحت آموز واقعات سناتیں۔

بیگم راشدہ علی کے بچے بہت خورد سال تھے۔ ان پر حیدر آبادی "آپا اماں" مامور تھیں۔ چھمی بیگم ہاؤس کیپر بن گئیں۔ گھر سنبھالنے کیلئے بیگم راشدہ کو چھمی بیگم کی بے حد ضرورت تھی۔ کیونکہ ان کا اپنا وقت زیادہ تر کلبوں، پارٹیوں اور سرکاری تقریبات میں گزرتا تھا۔

پانچ برس چھمی بیگم نے راشد علی صاحب کے گھر میں بھی کاٹ دیئے۔ جب راشد صاحب کا تبادلہ ہندوستانی سفارت خانہ واشنگٹن کا ہونے

لگا۔ ان کی بیگم کو فکر ہوئی کہ چھمی بیگم کا کہیں اور ٹھکانہ بنائیں۔

ایک دن وہ اپنے ایک الوداعی لنچ کے لئے روشن آرا کلب گئی ہوئی تھیں اور چھمی بیگم سے کہتی گئی تھیں کہ فلاں وقت کار لے کر منی کو میرے پاس لے آیئے گا۔

جب چھمی بیگم روشن آرا کلب پہنچیں ابھی لنچ ختم نہ ہوا تھا۔ چھمی بیگم بچی کی انگلی پکڑے سبزے پر ٹہلتی رہیں۔

چھمی بیگم اب پردہ نہیں کرتی تھیں۔ اور ساری پہنتی تھیں۔ اس نگوڑی دلی میں انہیں پہچاننے والا کون رکھا تھا۔ سامنے برآمدے میں ایک طرف رمی کی محفل جمی ہوئی تھی۔ اور ایک بے حد فیشن ایبل چالیس پینتالیس سالہ حقاقہ دقاقہ خاتون پانچ چھ مردوں کے ساتھ قہقہے لگا لگا کر تاش کھیلنے میں مصروف تھیں۔

سترہ برس نئی دہلی میں رہ کر چھمی بیگم اس نئی اعلیٰ سوسائٹی اور جدید ہندوستانی خواتین کی الٹرا ماڈرن طرز زندگی کی بھی عادی ہو چکی تھیں۔ اس لئے چھمی بیگم اطمینان سے گھاس پر ٹہلا کیں۔

چند منٹ بعد خاتون نے سر اٹھا کر چھمی بیگم کو غور سے دیکھا۔ کچھ دیر بعد پھر نظر ڈالی اور اپنے ایک ساتھی سے کچھ کہا۔

تب چھمی بیگم نے دیکھا، ایک مرد وانا تاش کی میز سے اٹھ کر لمبے لمبے

ڈگ بھرتا ان کی طرف آرہا ہے۔

قریب آکر اس نے کہا "بڑی بی ذرا ادھر آیئے"

چھمی بیگم متانت سے برآمدے ہی میں پہنچیں۔ اجنبی خاتون نے پوچھا یہ بچی کس کی ہے اور وہ کس کی ملازمہ ہیں؟ چھمی بیگم نے بتایا۔ خاتون نے کہا کہ بمبئی میں رہتی ہیں اور آج کل انہیں بھی ایک قابل اعتبار بڑی بی کی تلاش ہے اگر وہ اپنی جیسی کسی بڑی بی کو جانتی ہوں تو بتائیں۔ چھمی بیگم فوراً دل میں اس رب کریم کا لاکھ لاکھ شکر بجا لائیں جو رزق کا ایک دروازہ بند کرتا ہے اور دوسرا کھول بھی دیتا ہے۔ پھر انہوں نے اسی وقار سے جواب دیا کہ وہ خود بہت جلد اپنی موجودہ ملازمت سے سبکدوش ہونے والی ہیں "میری بیگم ابھی باہر آتی ہوں گی ان سے بات کر لیجئے" اتنا کہہ کر وہ بیگم راشد کے انتظار میں وہیں برآمدے کے در میں ٹک گئیں۔

جب بیگم راشد لنچ روم سے نکلیں تو میز سے اٹھ کر اجنبی خاتون نے فوراً اپنا تعارف کرایا۔ اپنا نام مسز رضیہ بانو بتایا اور چھمی بیگم کے متعلق ان سے بات کی۔ بیگم راشد بھی بہت خوش ہوئیں اور وعدہ کیا کہ واشنگٹن روانہ ہونے سے پہلے وہ چھمی بیگم کو خود بمبئی کے لئے ریل میں بٹھال دیں گی۔ رضیہ بانو نے بتایا کہ وہ آج شام ہی بمبئی واپس جا رہی ہیں۔ اپنے

گھر کا پتہ لکھ کر انہوں نے چھمی بیگم کو دے دیا۔ لیکن بیگم راشد نے ذرا متفکر ہو کر چھمی بیگم سے پوچھا "خالہ تم اکیلی اتنی دور کا سفر کر لوگی ؟" چھمی بیگم نے فوراً اقرار میں سر ہلا دیا۔ چھمی بیگم کو اب زندگی میں کسی بات کے لئے "نہیں" کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ انہوں نے رضیہ بانو سے تنخواہ کا فیصلہ بھی نہ کیا۔ کیونکہ انہوں نے ہمیشہ کے لئے اپنی ایک تنخواہ مقرر کر لی تھی۔ چالیس روپے ماہوار اور کھانا۔ یہ چالیس روپے ان کی ذاتی ضروریات کے لئے ضرورت سے زیادہ تھے۔ کپڑے ہمیشہ انہیں اپنی بیگموں سے مل جاتے تھے۔ عرصہ ہوا انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ کپڑے لتے، گہنے پاتے، جائیداد املاک، رشتے ناطے، دوستی محبت سب بے معنی اور فانی چیزیں ہیں۔

بیگم راشد علی اور چھمی بیگم برآمدے سے اترنے لگیں تو رضیہ بانو نے بیگ کھول کر فوراً ڈیڑھ سو روپے کے نوٹ نکال کر چھمی بیگم کے حوالے کر دیئے "سفر خرچ اور دوسرے اخراجات۔" انہوں نے ذرا بے پروائی سے کہا۔ بیگم راشد کو ان کی اس دریا دلی پر حیرت ہوئی لیکن انہیں خود معلوم تھا کہ بمبئی میں ایک بڑی بیٹھائی لستی ہے۔ چھمی بیگم نے خاموشی سے نوٹ صدری کی جیب میں اڑس لئے۔ انہوں نے اب زندگی کے انوکھے واقعات پر متعجب ہونا بھی چھوڑ دیا تھا۔

مسٹر و مسز راشد علی کے امریکہ روانہ ہونے سے دو دن پہلے چھمّی بیگم نے بھی ٹرین میں سوار ہو کر بمبئی کا رُخ کیا۔

بمبئی سنٹرل پہنچ کر وہ پہلی بار ذرا گھبرائیں کیونکہ نئی دہلی کی پر سکون کوٹھیوں میں انہوں نے اب تک بہت محفوظ اور مامون زندگی گزاری تھی۔ اللہ کا نام لے کر پلیٹ فارم سے باہر نکلیں۔ قلی کے سر سے اپنا ٹین کا بکسا اور دری میں لپٹا بستر اتروایا۔ اپنا لوٹا، دستی پنکھا اور پندنیا ہاتھوں میں سنبھال کر ٹیکسی کی۔ سردار جی کو پتہ بتایا "گلزار۔ جارڈن روڈ"

چند منٹ میں ٹیکسی ایک بلند و بالا نئی عمارت کی برساتی میں جا رکی۔ چھمّی بیگم نے بوڑھے سردار جی کو کرایہ دیا جو راستے میں ان سے دنیا کے حالات پر تبادلۂ خیالات کرتے آئے تھے۔

اسی وقت دو بے حد اسمارٹ لڑکیاں لفٹ سے نکل کر سردار جی کی ٹیکسی میں بیٹھ گئیں۔ سردار جی نے خاموشی سے فلیٹ گرایا اور پھاٹک سے باہر نکل گئے۔ کس قدر غیر شخصی، منظم اور میکینکل زندگی اس شہر کی تھی!

چھمّی بیگم نے صدری کی جیب سے میلا کاغذ کا ٹکڑا نکال کر پھر آنکھیں چندھیائیں اور پتہ پڑھا۔ گیارہویں منزل۔ فلیٹ نمبر ۳۔ اسٹول پر بیٹھے چوکیدار نے اکتائے ہوئے انداز میں خاموشی سے اٹھ کر ان کا سامان لفٹ میں رکھ دیا۔ لفٹ آٹومیٹک تھا۔ چھمّی بیگم بہت گھبرائیں۔ چوکیدار جلدی

سے اندر آیا اور انہیں گیارہویں فلور تک پہنچا کر واپس نیچے چلا گیا۔ اب چھمّی بیگم اپنے سامان بمعیت طویل گیلری میں اکیلی کھڑی تھیں۔ پھر ان کی نظر ایک نزدیکی دروازے پر پڑی جس کے اوپر نمبر ۳ لکھا ہوا تھا۔ دروازے پر ایک اور آہنی جالی دار دروازہ چڑھا تھا جو اندر سے مقفل تھا۔ جیسے بنکوں کے دروازے ہوتے ہیں۔ چھمّی بیگم نے آگے بڑھ کر گھنٹی بجائی۔ چند لمحوں بعد ایک بھوری آنکھ نے اندرونی کواڑ کے جالی دار سوراخ کا پٹ ہٹا کر جھانکا۔ چھمّی بیگم کو دفعتاً برسوں بعد اپنے غسلخانے کی کھڑکی کا کھرچا ہوا شیشہ یاد آگیا۔ جس میں سے انہوں نے پہلی بار اس منحوس لال چڑیل کو دیکھا تھا۔ جو ان کے بھرے پُرے کنبے کو چٹ کر گئی۔ مزید توقف کے بعد دونوں دروازے کھلے اور ایک غصیلا سا گورکھا باہر نکلا۔ اس نے مشکوک اور بے رحم نظروں سے چھمّی بیگم کو دیکھا۔ چھمّی بیگم ڈر سی گئیں۔ لیکن پھر یاد آیا۔ وہ بھی پٹھان ہیں۔ سر اٹھا کر وقار سے کہا "بیگم صاحب سے کہو چھمّی بیگم دلّی سے آگئی ہیں۔"

"مالوم ہے، تم دلّی سے آیا ہے۔ اندر آجاؤ۔" گورکھے نے خشکی سے جواب دیا اور باہر نکل کر ان کا بکس بستر اٹھا لیا۔ اس کے پیچھے پیچھے چھمّی بیگم اندر گئیں تو اس نے کھٹ سے دونوں دروازے مقفل کر دیئے۔

اب چھمّی بیگم ایک تاریک، ایرکنڈیشنڈ، بے حد عالی شان ڈرائنگ روم میں کھڑی تھیں۔ ایسا شاندار ڈرائنگ روم نہ بیچارے صبیح الدین صاحب

کا تھا اور نہ راشد علی صاحب کا۔ ایک طرف کی دیوار پر سیاہ پردہ پڑا تھا جو ذرا سرکا ہوا تھا۔ اور اس کے پیچھے دیوار میں نصب سینما کی چھوٹی سی اسکرین نظر آ رہی تھی۔ کمرے کے دوسرے حصّے میں بار تھی۔

"بیگم صاحبہ ہیں؟" چھمی بیگم نے دونوں ہاتھوں میں لوٹا، پندنیا اور پنکھا اٹھائے اٹھائے دریافت کیا۔

"میم صاحبہ سو رہا ہے۔"

"اور صاحب؟" ملازمت شروع کرنے سے پہلے گھر کے صاحب کے انٹرویو سے وہ ہمیشہ جھجکتی تھیں۔

گورکھے نے کوئی جواب نہ دیا اور ڈرائنگ روم سے نکل کر ایک گیلری کی طرف چلا۔ چھمی بیگم اس کے پیچھے پیچھے دونوں طرف دیکھتی ہوئی گیلری میں دور رویہ چار دروازے تھے جو سب اندر سے بند تھے یہ بہت بڑا اور پُرشکوہ فلیٹ تھا۔

آگے جا کر گیلری بائیں طرف مڑ گئی۔ یہاں باورچی خانہ اور نوکروں کے دو مختصر کمرے تھے جن کے باہر بالکنی تھی۔ نوکروں کے استعمال والے زینے میں بھی اندر سے تالا پڑا تھا۔ ایک صاف ستھری اور روشن خالی کوٹھڑی میں جا کر گورکھے نے بکس بستر دھم سے زمین پر رکھ دیا اور اسی طرح چپ چاپ باہر چلا گیا۔

چھمی بیگم نے پندنیا بڑے طاق پر رکھ کر اپنی نئی جائے پناہ، نئے ٹھکانے پر نظر ڈالی۔ کونے میں لوہے کا ایک پلنگ پڑا تھا۔ انہوں نے دل میں سوچا یہ بہت چبھے گا۔ دیواروں پر پچھلے شوقین مزاج ملازم کی چپکائی ہوئی فلم ایکٹرسوں کی تصویریں مسکرا رہی تھیں۔ کوٹھڑی میں حبس طاری تھا۔ چھمی بیگم نے کھڑکی کھولی تو اچانک سمندر آنکھوں کے سامنے آگیا۔ نیلا وسیع، بیکراں سمندر ٹھاٹھیں مارتا، غیر متوقع زندگی کے واقعات کی مانند اچانک۔ انہوں نے سمندر پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ دفعتہً خیال آیا اس کارساز کے قربان جاؤں سمندر تک پہنچ گئی اب انشاءاللہ حج بھی کر آؤں گی۔ اس سمندر کے اُس پار مکہ مدینہ ہے۔ یہ سوچ کر ان کا جی بھر آیا۔

کوٹھڑی سے ملحق نوکروں کا غسلخانہ تھا۔ چھمی بیگم نے بکسا کھولا، کپڑے نکالے، غسلخانے میں گئیں۔ اپنے آبائی مکان کا وہ طویل وعریض نیم تاریک غسلخانہ، بابائیں ابیلیں وہ برسوں کی کوشش کے بعد بھلا چکی تھیں کہ انسان زندگی کی پیہم تبدیلیوں کا عادی ہوتا چلا جاتا ہے ورنہ مر جائے۔

نہا دھو کر کپڑے بدل وہ پھر اپنی کوٹھری میں آئیں۔ سارا گھر سنسان پڑا تھا۔ نوکر نہ چاکر۔ صاحب دفتر گئے ہوں گے۔ بچے اسکول۔ میم صاحب سو رہی تھیں دوپہر کا وقت تھا۔ اب انہیں چائے کی طلب

ستانے لگی۔ ساری عمر شدید ذہنی اور جذباتی صدمے سہتے رہنے سے چھمی بیگم کی تیزی اور طراری کب کی ہوا ہو چکی تھی اور ـــــــ۔ وہ بڑھاپے کی وجہ سے ستری بہتری بھولی بھگی ہو کر بھی رہ گئیں تھیں۔ سادگی سے سوچا اب کچن میں جا کر چائے بنا لوں۔

سنسان باورچی خانے میں پہنچیں تو وہاں گیس کے چولہے نظر آئے جو استعمال کرنا نہ جانتی تھیں۔ ذرا جھنجھلا کر گیلری میں آئیں جس کے چار دروازوں میں سے ایک اب کھل چکا تھا۔ اور اس پر بڑا بیش قیمت پردہ دکھائی دے رہا تھا۔

ان کے قدموں کی چاپ سن کر پردے کے پیچھے سے کسی نے آواز دی

"کون ہے؟"

"چھمی بیگم ـــــــ دلی سے آئی ہوں۔" انہوں نے امی سادگی سے جواب دیا۔

"اوہ۔ آگئیں۔ آؤ۔ آؤ۔"

یہ پردہ سرکا کر اندر گئیں۔ ایک بالکل شاہانہ خوابگاہ میں ڈبل بیڈ وغیرہ امریکن چھپر کھٹ پر رضیہ بانو گلابی رنگ کا نائیلون کا نائٹ گون پہنے نیم دراز تھیں۔ انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ چھمی بیگم کو ان کا یہ ننگا پہناوا ذرا بھی پسند نہ آیا۔ لیکن سوچا بھئی اپنا اپنا دستور ہے اس شہر

کے یہی ڈھنگ ہیں۔ رضیہ بانو کا سگریٹ بھی انہیں اچھا نہ لگا۔ بیگم صبیح الدین اور بیگم راشد دونوں سگریٹ نہیں پیتی تھیں۔ بہرحال انہوں نے بردباری سے کہا "سلام علیکم"۔

"آؤ۔ بُوا۔ بیٹھو"۔ رضیہ بانو نے فرش کی طرف اشارہ کیا۔

جب سے چھمی بیگم برقع سر پر ڈال کر حق حلال کی روزی کمانے باپ دادا کی دہلیز سے باہر نکلیں تھیں آج تک انہیں کسی نے بُوا نہیں کہا تھا۔ صبیح الدین صاحب اور راشد صاحب دونوں کے ہاں انہیں چھمی خالہ یا صرف خالہ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ وہ تمکنت سے دیوان کے کنارے ٹک گئیں۔

رضیہ بانو کے سرہانے دو ٹیلی فون رکھے تھے۔ ایک سفید، ایک سُرخ سفید والے کی گھنٹی بجی۔ رضیہ بانو نے رسیور اٹھا کر انگریزی میں آہستہ آہستہ کچھ باتیں کیں۔ ہاتھ بڑھا کر سائڈ ٹیبل سے ایک بڑی سی مجلد نوٹ بک اٹھائی۔ اس میں کچھ لکھا۔ پھر رسیور رکھ کر سُرخ رنگ کے ٹیلیفون کا ایک نمبر ملایا اور آہستہ سے کہا "مادھر ـــــ چار نمبر۔ نائن تھرٹی" اور فون بند کر دیا۔ چھمی بیگم خاموش بیٹھی کمرے کی آرائش دیکھتی رہیں۔ مرمریں مجسمے، بڑی بڑی تصویریں، ریڈیو گرام۔ طول طویل سفید رنگ کا وارڈروب۔ اتنے میں پردہ سرکا کر ایک طرحدار لڑکی ہاؤس کوٹ پہنے

اندر آئی۔ گیلری کے بند دروازوں میں ایک کھلا۔ کمرے میں زور سے "ہائی فائی" (HI-FI) کی آواز سنائی دی لڑکی نے رضیہ بانو سے کچھ گٹ پٹ کی۔ الٹے پاؤں واپس گئی اور گیلری والا دروازہ پھر بند ہو گیا۔

"اللہ رکھے کتنے بچے ہیں؟" چھمی بیگم نے دریافت کیا۔

"میرے ہاں کوئی اولاد نہیں ہے۔ یہ میری بھانجیاں میرے ساتھ رہتی ہیں۔" رضیہ بانو نے مختصراً جواب دے کر پھر مجلّد نوٹ بک کھول لی۔

"کالج میں پڑھتی ہوں گی۔" چھمی بیگم نے کہا۔

"کون؟" رضیہ بانو نے بے خیالی سے پوچھا۔

"بھانجیاں آپ کی۔"

"ہوں!"

"اللہ رکھے آپ کے میاں بزنس کرتے ہیں؟" چھمی بیگم کو معلوم تھا کہ بمبئی میں سب لوگ بزنس کرتے ہیں۔

"ہیں؟ — کیا؟" رضیہ بانو نے نوٹ بک سے سر اٹھا کر ذرا ناگواری سے پوچھا "میاں؟ میاں مر گئے۔"

"اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون۔" چھمی بیگم کے منہ سے نکلا۔ لحظے بھر کے لئے آجو بھائی اللہ بخشے کی موت کا زخم پھر ہرا ہو گیا۔ ہر موت کی

خبر پر ہرا ہو جاتا تھا۔ کوئی کیا جان سکتا تھا کہ چھمی بیگم نے اپنی ساری عمر کیسے بے پایاں اندوہ میں مبتلا رہ کر اسے کس طرح ضبط کر کے گزار دی۔ صبر شکر، صبر شکر!

چوڑی دار پاجامہ پہنے ایک اور مجسم قیامت نوجوان لڑکی لہراتی بل کھاتی کمرے میں آئی۔ رضیہ بانو نے اس سے انگریزی میں کچھ کہا۔ لڑکی اسی طرح لہراتی مسکراتی باہر چلی گئی۔ اب رضیہ بانو چھمی بیگم کی طرف متوجہ ہوئیں۔ جنہیں چائے کی طلب میں جمائیاں آنے لگی تھیں۔ رضیہ بانو نے ایک تکیہ کہنیوں کے نیچے دبا کر کہنا شروع کیا" بوا! (چھمی بیگم پھر کلبلائیں) آپ نے بہت اچھا کیا جو میرے ہاں آ گئیں۔ میں نے پہلی نظر میں اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ بے سہارا اور دکھی ہیں اب آپ اس گھر کو اپنا گھر سمجھیئے۔ میں ہمیشہ یہ چاہتی ہوں کہ کوئی بزرگ بی بی میرے ہاں رہیں۔ بڑا سہارا سا رہتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ کوئی بزرگ بی بی میرے گھر میں نماز، قرآن پڑھتی رہا کریں۔ برسوں سے میرے پاس ایک حیدر آبادی بڑی بی تھیں۔ وہ پچھلے سال بے چاری حج کرنے گئیں۔ وہیں انتقال ہو گیا ـــــ اچھا" رضیہ بانو نے پہلو بدل کر بات جاری رکھی۔ "میں اب آپ کو بتانا یہ چاہتی ہوں بوا کہ یہ بمبئی شہر میدان حشر ہے۔ طرح طرح کی باتیں، طرح طرح کے لوگ۔ آپ کسی بات پر کان نہ

دھرئیے۔ بس اپنے کام سے کام رکھیے۔ کچن کی نگرانی کر لیجئے۔ باقی وقت نماز روزے میں گزاریئے۔ اب آپ کے لئے محنت کا نہیں آرام کا وقت ہے۔ قرآن شریف پڑھیئے۔ میرے حق میں دعائے خیر کرتی رہیئے۔ باقی یہ کہ لڑکیوں ——— میری بھانجیوں کے لئے دوسری آیا موجود ہے۔ ابراہیم خانساماں کا نام ہے، بشن سنگھ گورکھا ہے، مادھو میرا ڈرائیور ہے ——— لیکن بلا ضرورت کسی کے جھگڑوں قصیوں میں نہ پڑئیے۔"

"میں خود ———" چھمی بیگم نے کہنا چاہا لیکن رضیہ بانو نے ان کی بات کاٹی۔

"میری اللہ کے فضل سے بڑی بزنس ہے۔" کچھ توقف کے بعد اضافہ کیا۔ "ایکسپورٹ امپورٹ جانتی ہیں۔ ایکسپورٹ امپورٹ؟"

"جی ہاں۔" چھمی بیگم نے سر ہلایا۔ صبیح الدین صاحب محکمۂ تجارت کے افسر تھے اور اس طرح کے الفاظ چھمی بیگم کے کانوں میں پڑھتے رہتے تھے۔ رضیہ بانو چھمی بیگم کو بہت سمجھدار اور نیک دل بی بی معلوم ہوئیں۔ اور اس قدر خدا پرست۔ چھمی بیگم نے ان کا باریک نائٹ گون اور سگرٹ نوشی معاف کر دی۔

"میں عورت ذات تن تنہا اتنا بڑا کاروبار چلا رہی ہوں۔ اس کی وجہ سے دس طرح کے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے۔ بھانجیاں بھی آج کل کی

لڑکیاں ہیں۔ ان کے دوست احباب بھی آتے رہتے ہیں۔ پھر میری بزنس کی وجہ سے دو مرتبہ پولیس ریڈ کر چکی ہے۔"

"پولیس؟" چھمی بیگم نے ذرا دہل کر دہرایا۔

رضیہ بانو ہنس پڑیں "ڈریئے نہیں۔ یہاں بڑے بڑے تاجروں کو پولیس اور انکم ٹیکس والے اکثر پریشان کرتے ہیں۔ میں اکیلی عورت دسیوں دشمن پیدا ہو گئے۔ کسی نے جا کر پولیس والوں سے جڑ دی کہ میں نے انکم ٹیکس نہیں دبا ہے۔ بس دوڑ آ گئی۔ اسی وجہ سے میں نے باہر لوہے کا دروازہ لگوا لیا ہے۔ تو اب آپ سے کہنا یہ ہے کہ جب باہر کی گھنٹی بجے تو آپ سوراخ میں سے دیکھ کر اطمینان کر لیجئے۔ کبھی کبھی یہ پولیس والے سادہ کپڑوں میں بھی آ جاتے ہیں۔

چھمی بیگم سفر کی تکان اور چائے کی طلب میں نڈھال ہوئی جا رہی تھیں۔ اٹھ کھڑی ہوئیں اور بولیں "بی بی گیس کا چولہا کیسے جلتا ہے؟"

رضیہ بانو نے سرہانے ایک برقی بٹن دبا دیا۔ ایک منٹ میں ابراہیم باورچی دروازے میں نمودار ہو گیا۔

"ابراہیم! یہ ہماری نئی بُوا ہیں۔ ان کے لئے چائے تو بنا دو جھٹ پٹ!"

چھمی بیگم جلدی سے اٹھ کر ابراہیم کے پیچھے پیچھے کچن کی طرف روانہ

ہو گئیں۔

ظہر، عصر، مغرب ساری نمازیں پڑھ کر وہ پھر بالکنی میں جا کھڑی ہوئیں۔ گھر میں کرنے کے لئے کام ہی نہ تھا۔ رضیہ بانو بن سنور کر باہر جا چکی تھیں۔ دوؤ بھانجیوں" کے کمرے میں روشنی جل رہی تھی۔ تیسری "بھانجی" غائب تھی، تینوں چاروں ملازم بھی فلیٹ میں نہ تھے۔ اس لئے گھنٹی بجی تو بجتی ہی چلی گئی۔ چھمّی بیگم نئی دہلی کی عادت کے مطابق فوراً دروازہ کھولنے کے لئے ڈرائنگ روم کی طرف لپکیں اور جلدی سے اندر والا دروازہ کھول دیا باہر کا آہنی دروازہ اس وقت پہلے سے ایک طرف سرکا ہوا تھا۔

اور جس طرح صبیح الدین صاحب اور ارشد صاحب کی کوٹھیوں میں ڈرائنگ روم کی دہلیز پر آ کر وہ مہمانوں سے بہت اخلاق سے کہتی تھیں "تشریف لائیے"۔ اسی عادت کے انہوں نے اخلاق سے کہا۔ "تشریف لائیے"۔

دو فربہ مارواڑی اور ایک معطّر نوجوان امیر زادہ اندر داخل ہوئے۔ امیر زادہ سیدھا بار کی طرف چلا گیا۔ فربہ مارواڑی دھم سے ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ صبیح الدین صاحب کے ہاں بھی اکثر اس وضع قطع کے کاروباری اپنی غرض سے آیا کرتے تھے معطّر نوجوان کو دیکھ

کرا البتہ ذرا تعجب ہوا۔ پھر سوچا اس شہر کا یہی دستور ہوگا۔ ابھی وہ یہی طے کر رہی تھیں کہ معزز مہمانوں سے چائے کے لئے پوچھیں یا کافی کے لئے کہ سونے کے بٹنوں اور ہیرے کی انگوٹھیوں والے فربہ مارواڑی نے ڈپٹ کر پوچھا۔ میڈم کدھر ہے ؟"

چھمی بیگم بخوبی جانتی تھیں کہ بیگم کو انگریزی میں میڈم کہتے ہیں اور سلیقے سے جواب دیا۔ "میڈم باہر گئی ہیں"۔

"سالا چھوکری لوگ کدھر گیا ؟"

چھمی بیگم کو غصہ آگیا۔ یہ صحیح ہے کہ اہل بمبئی تمیزدار اور اہل زبان نہیں۔ لیکن یہ گالی گلوچ کیا معنی ؟ انہوں نے ہونٹ بچکا کر پوچھا "بیگم صاحب کی بھانجیاں ؟"

اتنے میں دروازہ کھلا اور رضیہ بانو سرعت سے اندر آگئیں۔ چھمی بیگم سے کہا "بوا ! تم جا کر اپنی کوٹھری میں بیٹھو۔ آرام کرو"۔

"جی اچھا" انہوں نے جواب دیا۔ ان کے گیلری میں سے گزر جانے کے بعد ایک "بھانجی" کے کمرے سے ایک صاحب نکل کر باہر چلے گئے۔

چھمی بیگم نے اپنی کوٹھری میں جا کر بستر کھولا، جانماز نکالی، وضو کیا۔ نفلیں پڑھنے لگیں اور اس ربِ ذوالجلال کا شکر ادا کیا جسے اپنے

بندوں پر صرف وہ وخست ہنسی آتی ہے اور اسی پاک پروردگار نے ان کے باپ دادا کی لاج، ان کے حسب نسب کی عزت رکھ لی اور ایک بار پھر ایک شریف گھرانے کی حق حلال کی کمائی میں ان کا حصّہ بھی لگا دیا۔!!!

جلاوطن

سنلا لالہ - سجے ڈلالہ - ناچے ہری ہری کیرتن میں -
ناچے ہری ہری کیرتن میں -
ناچے -

چوکھٹ پر اکڑوں بیٹھی رام رکھی نہایت انہماک سے چاول صاف کر رہی تھی - اس کے گانے کی آواز دیر تک نیچے سُرخ گموں والی سنسان گلی میں گونجا کی - پھر ڈاکٹر آفتاب رائے صدر اعلیٰ کے چبوترے کی اور سے بڑے پھاٹک کی سمت آتے دکھلائی پڑے ———

"بندگی بھیّن صاحب -" رام رکھی نے گھونگھٹ اور زیادہ طویل کر کے آواز لگائی -

"بندگی ـــــ بندگی ـــــ" ڈاکٹر آفتاب رائے نے زینے پر پہنچتے ہوئے بے خیالی سے جواب دیا۔

"راجی کھُشی ہو بھین صاحب" رام رکھی نے اخلاقاً دریافت کیا۔

"اور کیا ـــــ مجھے کیا ہوا ہے۔ جو راضی خوشی نہ رہوں گا۔ یہ سوٹ ہٹا بیچ میں سے"

انہوں نے جھنجھلا کر کہا۔

"بھیتن صاحب ناج پھٹک رہی تھی"

"تو ناج پھٹکنے کے لئے تجھے گاڑی بھر راستہ چاہیئے۔ چل ہٹا سب چیز"

ڈاکٹر آفتاب رائے نے دنیا بھر کی ڈگریاں توڑ ڈالی تھیں۔ لیکن حالت یہ تھی کہ زری زری سی بات پر بچّوں کی طرح خفا ہو جایا کرتے تھے۔ رام رکھی پر برستے ہوئے وہ اوپر آئے اور مونڈھے پر پیر لٹکا کر انہوں نے اپنی بہن کو آواز دی ـــــ ببجی ـــــ جی ای ای ـــــ جی ای ای ـــــ (چھوٹا ہے اب تلک مورا بھیّن ہیم کرن پیار سے کہا کرتیں)، دالان کے آگے کھلی چھات پر نیم کی ڈالیاں منڈیر پر جھکی ہوا میں سرسرا رہی تھیں۔ شام کی گہری کیفیت موسم کی اداسی کے ساتھ ساتھ سارے میں بکھری تھی۔ دن بھر نیچے ہوسے کے باغ میں شہد کی مکھیاں بھنبھایا کرتیں اور ہر چیز پر غنودگی ایسی چھائی رہتی۔ آم اب پیلے ہو چلے تھے۔

"ٹھکرائن کی بگیا" میں صبح سے لے کر رات گئے تک روں روں کرتا رہٹ چلا کرتا۔

"آدت ہن بھیّن صاحب"، ہیم کرن نے دالان کا پیتل کے نقش و نگار والا کواڑ کھولتے ہوئے غلے کے گودام میں سے باہر آکر جواب دیا۔ اور کنجیوں کا گچھا ساری کے پلو میں باندھ کر چھن سے پشت پر پھینکتی ہوئی صحنچی میں آگئیں۔

"جے رام جی کی بھیّن صاحب ۔۔" رسوئیے نے چوکے میں سے آواز لگائی۔

"کٹہل کی ترکاری کھیو بھیّن صاحب"

"ہاں۔ ہاں ضرور کھیبا بھائی ۔۔" ڈاکٹر آفتاب رائے مونڈھے پر سے ہٹ کر ٹہلتے ہوئے تلسی کے چبوترے کے پاس آگئے۔ صحنچی میں رنگ برنگی مورتیاں اور گول پتھر سالگرام سے لے کر بجرنگ بلی مہراج تک سیندور سے لپی پتی گنگا جل سے نہائی دھوئی قرینے سے سجی تھیں۔ ہیم کرن تھیں تو بڑی سخت رام بھگت لیکن باقی کے بھی دیوی دیوتاؤں سے سمجھوتہ رکھتی تھیں کہ نہ جانے کون کس سمے آڑے آجائے۔ سب سے بنائے رکھنی چاہیئے۔ ابھی سرین رما کانت کھیل کے میدان سے لوٹیں گے۔ آٹھ بجے کھما کتھک کے توڑے سیکھ کر جمنا مہراج کے ہاں

سے واپس آئے گی۔ پھر چوکے میں کھانا پروسا جائے گا۔ ڈپتیل کے برتن ٹھنڈی چاندنی میں جھلملائیں گے۔ نیچے آنگن میں رام رکھی کوئی کجری شروع کر دے گی) یہاں پہ بالآخر امن تھا اور سکون۔

اب کھیم نیچے پکے گلیارے میں سے چلتی ہوئی اوپر آرہی تھی ٹھکرائن کی بگیا میں سے ابھی اس نے کروندے اور کمرکھیں اور کموہ توڑ کر جلدی جلدی منہ میں ٹھونسے تھے۔ دھاکر دادھی ناکت تا ـــ دھاکر دا ـــ ارے باپ رے ـــ اس نے منڈیر پر سے اوپر جھانک کر کر دمینتی سے کہا ـــ ماما آئے ہیں ـــ بھاگ جاورنہ ماما مجھے ماریں گے کہ سمے کھیلتی ہے ـــ دمینتی بھاگ گئی۔

کھیم چھت پر آئی۔ لمبے سے ڈھیلے ڈھالے فراک میں ملبوس، جس پر موتیوں سے خوب تتلیاں اور پھول بنے ہوئے تھے، کھینچ کر بالوں کی مینڈھیاں گوندھے، ہاتھوں میں چھناچھن چوڑیاں بجاتی کھیم وتی رائے زادہ اپنے اتنے پیارے اور اتنے سندر ماما کو دیکھ کر بیحد خوش ہوئی۔

"نمستے ماما ـــ ابھی کتاب لاتی ہوں۔ بس ذرا منہ ہاتھ دھو آؤں۔"

"چل چڑیل ـــ بہانے باز ـــ سبق سنا پہلے ـــ" ڈاکٹر آفتاب رائے نے پیار سے کہا لیکن یہ کچھ تجربہ انہیں تھا کہ اپنے

سے کم عمر لوگوں سے اور کنبہ برادری والوں سے یہ گھرگرہستی اور لاڈ پیار کے مکالمے وہ زیادہ کامیابی سے ادا نہ کر پائے تھے)

"تجھے تو میں انٹرمیڈیٹ میں بھی حساب دلاؤں گا دیکھتی جا۔"

انہوں نے پھر بزرگ بننے کی سعی کی۔

"ارے باپ رے !!" کھیم نے مصنوعی خوف کا اظہار کیا۔

"اور تو نے چوڑیاں تو بہت خوب صورت خریدی ہیں ری —"

"ہی ہی ہی ماما" کھیم نے دلی مسرت سے اپنی چوڑیاں کو دیکھیں

"اور تو ساری تو پہنا کر، کہ فراک ہی پہنے پھرے گی باؤلی سی۔"

(انہوں نے اپنی بزرگی کا احساس خود اپنے اوپر طاری کرنا چاہا)

"جی ماما" کھیم کے ذہن میں وہ ساریاں جھما جھم کرتی گھوم گئیں۔ جو اس کے صندوقوں میں ٹھنسی تھیں۔ وہ تو خدا سے چاہتی تھی کہ کل کی بجائے آج ہی وہ ساریاں پہن ڈالے۔ مگر ہیم کرن ہی پر انگریزیت سوار تھی۔ ایک تو وہ یہ نہیں سمجھی تھیں کہ تھیں تو وہ جون پور کے اس ٹھیٹھ دقیانوسی سریواستوار گھرانے کی بٹیا پر ان کا بیاہ ہوا تھا۔ الٰہ آباد کے انتے فیشن ایبل کنبے میں جس کے سارے افراد سول لائنز میں رہتے تھے اور جوتے پہنے پہنے کھانا کھاتے تھے۔ اور مسلمانوں کے ساتھ

بیٹھ کر چاء پانی پیتے تھے۔ اور گووِ دھوا ہوئے اب ان کو سات برس ہونے آئے تھے اور تب سے وہ میکے ہی میں رہتی تھیں۔ لیکن محلے پر ان کا رعب تھا۔ کیوں کہ وہ الہ آباد کے رائے زادوں کی بہو تھیں۔ دوسرے یہ کہ یہ فراک کا فیشن ڈاکٹر سین گپتا کے ہاں سے چلا تھا۔ ڈاکٹر سین گپتا ضلع کے سول ہسپتال کے اسسٹنٹ سرجن تھے اور ہسپتال سے ملحق ان کے پیلے رنگ کے اجاڑ سے مکان کے سامنے ان کی پانچوں بیٹیاں رنگ برنگے فراک پہنے دن بھر اودھم مچایا کرتیں۔ شام ہوتی تو آگے آگے ڈاکٹر سین گپتا دھوتی کا پلا نہایت نفاست سے ایک انگلی میں سنبھالے، ذرا پیچھے ان کی بی بی سُرخ کنارے والی سفید ساڑھی پہنے پھر پانچوں کی پانچوں لڑکیاں سیدھے سیدھے بال کندھوں پر بکھرائے چلی جارہی تھی ہواخوری کرنے۔ اوہ۔ کیا ٹھکانہ تھا بھلا۔ بس ہر بنگالی گھرانے میں یہ لڑکیوں کی فوج دیکھ لو۔ ہیم کرن کو ڈاکٹر سین گپتا سے بڑی ہمدردی تھی۔ کھیم کی ان سب سے بہت گھٹتی تھی۔ خصوصاً مونڈیرا سے اور اسکول کے ڈرامے کے دنوں میں تو بس کھیم اور مونڈیرا ہی سب پر چھائی رہتیں۔ کیا کیا ڈرامے مہادیوی کنیا پاٹھ شالہ نے نہ کر ڈالے "نل دمینتی" اور "شکنتلا ہریش چندر" اور "راج رانی میرا" اور اوپر سے ڈانس الگ گربا بھی ہو رہا ہے کہ "آ۔ تیرے گنگا پار تیرے جمنا بیچ میں

ٹھاٹے ہیں۔ نندلال ــــ" اور آپ کا خدا بھلا کرے رادھا کرشنا ڈانس بھی لیجیے کہ میں تو گردھر آگے ناچوں گی ــــ جی ہاں ــــ اور وہ گگری والا ناچ بھی موجود ہے کہ چلو چلو سکھی سکھیاری ری چلو پنگھٹ بھروا پانی ــــ اور ساتھ ساتھ مونڈیرا اسپین گیتا ہے کہ فرآٹے سے ہارمونیم بجارہی ہے۔

ایسے ہونے کو تو مسلمانوں کا بھی ایک اسکول تھا۔ انجمن اسلام گرلز اسکول ــــ وہاں یہ سب ٹھاٹھ کہاں ــــ بس بارہ وفات کی بارہ وفات میلاد شریف ہو جایا کرتا اور اس میں کھڑے ہو کر لڑکیوں نے خاصی بے سری آوازوں میں پڑھ دیا۔

تم ہی فخرِ انبیاء ہو۔ یا نبیؐ سلام علیکا ــــ چلیئے قصہ ختم ایک مرتبہ ایک سر پھری ہیڈ مسٹرس نے جو نئی نئی لکھنؤ سے آئی تھی۔ روپ متی باز بہادر "خواتین کے سالانہ جلسے میں اسٹیج کروا دیا تو جناب عالی لوگوں نے اسکول کے پھاٹک پہ پکٹنگ کر ڈالی اور روزنامہ صدائے حق نے پہلے صفحے پہ جلی حروف میں شائع کیا۔

"ملتِ اسلامیہ کی غیرت کا جنازہ

گرلز اسکول کے سٹیج پر نکل گیا

مسلمانو! تم کو خدا کے آگے بھی جواب دینا ہوگا ــــ بنات اسلام کو رقص و سرود کی تعلیم ــــ اسکول کو بند کرو" ــــ دیہ سب

ننھے کھیم کی مسلمان سہیلی کشوری اسے سنایا کرتی تھی۔ جو پڑوس میں رہتی تھی) صدر راعلی کے چبوترے کے آگے والے مکان میں وہ اسلامیہ گرلز اسکول میں پڑھتی تھی۔ اس کا بڑا بھائی اصغر عباس سرین اور رما کانت کے ساتھ ہاکی کھیلنے آیا کرتا تھا۔ ویسے پڑھنے وہ لوگ بھی الگ الگ تھے سرین اور رما کانت ڈی اے وی کالج میں تھے۔ اصغر عباس فیض اسلام کنگ جارج انٹر کالج میں۔

"کیوں ری الیف اے کرنے کہاں جائے گی۔ جولائی آرہی ہے بنارس جائے گی یا لکھنؤ ــــــــ؟" ڈاکٹر آفتاب رائے نے چوکے میں بیٹھے ہوئے سوال کیا۔

اب یہ ایک ایسا ٹیڑھا اور اچانک سوال تھا۔ جس کا جواب دینے کے لئے کھیم وتی ہرگز تیار نہ تھی۔ دونوں جگہوں سے متعلق اسے کافی انفرمیشن حاصل تھی۔ لیکن دو ٹوک فیصلہ وہ فی الحال کسی ایک کے حق میں نہ کر سکتی تھی۔ بنارس میں ایک تو یہ کہ چوڑیاں بہت عمدہ ملتی تھیں۔ لیکن لکھنؤ کو بھی بہت سی باتوں میں فوقیت حاصل تھی۔ مثلاً سینما تھے اور دس بیلناؤں کا ایک سینما تو خود مہیلا ودیالہ تھا۔ جہاں اسے بھیجنے کا تذکرہ ماما نے کیا تھا۔ پردہ غالباً اسے بہر صورت ہر جگہ کرنا تھا۔ تانگے پر پردہ یہاں بھی ہیم کرن اپنے اور اس کے لئے بندھواتی تھیں اور ماما جو اتنا

بڑا ڈنڈا لئے سر پر جبہ موجود تھے۔ یہ ماما اس کے آج تک پلے نہ پڑے۔ ولایت سے ان گنت ڈگریاں لے آئے تھے۔ یونیورسٹی میں پروفیسری کرتے تھے۔ تاریخ پر کتابیں لکھتے تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ چوں چوں کے مربہ تھے کھیم کے ماما۔

رہے رما کانت اور سرین۔ تو رما کانت تو شاعر آدمی تھا۔ سارے مقامی شاعروں میں جا کر دو غزلے پڑھ ڈالتا اور حضرت ناشاد جون پوری کے نام نامی سے یاد کیا جاتا۔ سرین اس کے برعکس بالکل انجینئر تھا۔ اس سال وہ بھی انٹر کر کے بنارس انجینئرنگ کالج چلا جائے گا۔ باقی کے سارے کنبے برادری کے بہن بھائی یوں ہی بکواس تھے۔ اس سلسلے میں اس کی گوئیاں کشوری یعنی کشور آرا بیگم کے بڑے ٹھاٹھ تھے۔ اس کے بے شمار رشتے کے بھائی تھے اور سب ایک سے ایک سورما۔ یہاں کبھی کے سورما پنے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ کسی نے آج تک اس سے یہ نہ کہا کہ چل کھیم تجھے سرکس یا نوٹنکی ہی دکھا دیں —— نوٹنکی کے دنوں میں رستو یا تک لہک لہک کر گاتا

اب یہی ہے میں نے ٹھانی لاؤں گا نوٹن کی رانی،

کہاں کشوری کے ماجد بھائی ہیں تو اس کے لئے لکھنؤ سے چوڑیاں لئے چلے آتے ہیں۔ اکرام بھائی ہیں تو کشوری ان کے لئے چھپا چھپ

پل اوور بن رہی ہے۔ اشفاق بھائی ہیں تو کشوری کو بیٹھے انگریزی شاعری پڑھا رہے ہیں۔ ان بھائیوں اور کھیم کے بھائیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا کہاں کی چڑیاں اور پل اوور۔ یہاں تو جوتیوں میں دال بٹتی ہے۔

ہیم کرن کو گھر کے کام دھندوں ہی سے فرصت نہ ملتی۔ آفتاب رائے ان کے لئے بڑا سہارا تھے۔ وہ ہر تیسرے چوتھے مہینے لکھنؤ سے آکر مل جاتے۔ رہنے والے ان کے بھتیّن صاحب جون پور ہی کے تھے۔ پر یہاں ان کی کسی سے ملاقات نہ تھی۔ "ضلع کے رؤسا اور مقامی عمائدین شہر" میں ان کا شمار تھا۔ پر آپ کا خیال اگر یہ ہے کہ ڈاکٹر رائے جون پور کے ان معززین کے ساتھ اپنا وقت خراب کریں گے تو آپ غلطی پر ہیں۔ حکام سے ان کی کبھی نہ بنی۔ انٹلکچوئیل آدمی تھے۔ ان سول سروس اور پولیس والوں سے کیا دماغ سوزی کرتے۔ جگن ناتھ جین آئی سی ایس جب نیا نیا حاکم ضلع ہو کر آیا تو اس نے کئی بار ان کو کلب میں بلا بھیجا۔ پر یہ ہرگز نہ گئے۔ رئیس الدین کاظمی ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج نے دعوت کی۔ اس میں بھی نہ پہنچے اور تو اور ولایت واپس جاتے وقت مسٹر چارلس مارٹن نے کوئین وکٹوریہ گورنمنٹ انٹر کالج کی پرنسپل شپ پیش کی۔ لیکن کھیم کے ماما نے اسے بھی رد کر دیا۔ یوں تو خیر کانگریسی

دانگریسی ہونا کوئی خاص بات نہیں۔ شہر اور قصبہ جات کا ہر ہندو جو سرکاری ملازم نہ تھا۔ گھر پر ترنگا لگاتا تھا اور نہ ہر مسلمان کے اپنے وسیلوں مشغلے تھے۔ احرار پارٹی تھی، شیعہ کانفرنس تھی۔ ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی میں مسلمان بھرے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ کا تو خیر اس وقت کسی نے نام بھی نہ سنا تھا۔ یہ بہت سے مسلمان اگر انصاف کی پوچھیے تو کچھ بھی نہ تھے یا شاعری کرتے تھے یا مجلسیں پڑھتے تھے۔

تو کہنے کا مطلب یہ کہ کوئی ایسی تشویشناک بات نہ تھی۔ یہ ڈاکٹر آفتاب رائے کی زیادہ تر لوگوں سے کبھی نہ پٹی۔ ارے صاحب یہاں تک سنا گیا ہے کہ ہری پورہ کانگریس کے موقع پر انہوں نے سب کو کھری کھری سنا دیں۔ گو یہ راوی کو یاد نہیں کہ انہوں نے کیا کہا تھا۔ ضلع کی سوسائٹی جن عناصر پر مشتمل تھی۔ انہیں سے ڈاکٹر آفتاب رائے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ وسط شہر میں مہاجنوں، ساہوکاروں اور زمینداروں کی اونچی حویلیاں تھیں۔ یہ لوگ سرکاری فنڈوں میں ہزاروں روپیہ چندہ دیتے۔ اسکول کھلواتے، مجرے اور مشاعرے اور دنگل کرواتے۔ جلسے جلوس اور سر پھٹول بھی ان ہی کی زیر سرپرستی منعقد ہوتے۔ ہندو مسلمانوں کا معاشرہ تقریباً ایک تھا۔ وہی تیج تہوار۔ میلے ٹھیلے۔ محرم رام لیلا۔ پھر اس سے اونچی سطح پر وہی مقدمے بازیاں۔

مؤکل۔ گواہ۔ پیش کار۔ سمن۔ عدالتیں۔ صاحب لوگوں کے لئے ڈالیاں۔

شہر کے باہر ضلع کا ہسپتال تھا۔ لق و دق ہری گھاس کے میدانوں میں بکھری ہوئی اداس پیلے رنگ، کی عمارتیں۔ کچے احاطے۔ نیم کے درختوں کی چھاؤں میں، آؤٹ ڈور، مریضوں کے ہجوم۔ گرد آلود یکوں کے اڈے سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے دو دو آنے میں خط لکھ دینے والے بہت بوڑھے اور شکستہ حال منشی جو دھاگوں والی عینکیں لگائے دھندلی آنکھوں سے راہگیروں کو دیکھتے۔ پھر گلیاں تھیں جن کے گھروں کے فرش پر پانی بہتا تھا۔ سیاہی مائل دیواروں پر کوئلے سے اشتہار لکھے تھے۔ حکیم مار کہ دھاگہ خریدیئے، پری برانڈ بیڑی پیو۔ ایک پیسہ باپ سے لو جائے جا کر ماں کو دو ـــــــ آگیا، آگیا، آگیا ـــــــ سال رواں کا سنسنی خیز فلم "لہری راجہ" آگیا۔ جس میں مس مادھوری کام کرتی ہے۔

پھر سایہ دار سڑکوں کے پرے آم اور مولسری میں چھپی ہوئی حکام ضلع کی بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ انگریزی کلب تھا۔ جس میں بے اندازہ خنکی ہوتی۔ چپ چاپ اور سائے کی طرح چلتے ہوئے مودب اور شائستہ "بیرے" انگریز اور کالے صاحب لوگوں کے لئے ٹھنڈے پانی کی بوتلیں اور برف کی بالٹیاں لا کر گھاس پر رکھتے، نیلے پردوں کی قناتوں کے پیچھے ٹینس کی گیندیں سبزے پر لڑھکتی رہتیں۔

اور سول لائنز کی اس دُنیا میں اوپر سے آئی کنول کماری جین جگن ناتھ جین آئی، سی ایس کی بالوں کٹی بیوی جس نے لکھنؤ کے مشہور انگریزی کالج ازابلا تھوبرن میں پڑھا تھا اور جو گیند بلا کھیلتی تھی۔ کلب میں بڑی چہل پہل ہو گئی گنتی کی کل تین تو میمیں ہی تھیں کلب میں۔ کوئین وکٹوریہ گورنمنٹ انٹر کالج کے انگریز پرنسپل کی میم ایک زنانہ ہسپتال کی بڑی ڈاکٹرنی میم مس مِک کنزی دو۔ اور اے پی مشن گرلز ہائی اسکول کی بڑی اُستانی مس سالفرڈ جو چین چپٹا میم کہلاتی تھی کہ نوکروں میں چلانی بہت تھی۔ ان تین کے علاوہ ڈاکٹرنی میم کی چھوٹی بہن مس ادلیو مک کنزی تھی۔ جو اپنی بہن سے ملنے نینی تال سے آئی ہوئی تھی اور ضلع کے غیر شادی شدہ حکام کے ساتھ ٹینس کھیلنا اس کا خاص مشغلہ اور اس میں کچھ اس کا جی لگا تھا کہ اب واپس جانے کا نام نہ لیتی تھی شام ہوتے ہی وہ کلب میں آن موجود ہوتی اور وے مسٹر سکسینہ اور دے مسٹر فرحت علی اور وے مسٹر پانڈے سبھی تو اس کے چاروں طرف کھڑے دانت نکوسے ہنس رہے ہیں۔ اس ایک میانے بھائی لوگوں کو تگنی کا ناچ نچا رکھا تھا۔ باقی ماندہ حضرات بھی کہتے تھے کہ میاں کیا مضائقہ ہے۔ جھوں پورا ایسی ڈل جگہ پر مس مِک کنزی کا دم ہی غنیمت جانو۔

اب غور کرنے کا مقام ہے کہ مس شبیرہ حمایت علی جو دوسری لیڈی

ڈاکٹر تھیں۔ ان کا تو نام سُن کر ہی جی بیٹھ جاتا تھا۔ مگر وہ خود بے چاری بڑی اسپورٹنگ آدمی تھیں۔ برابر جی داری سے ٹینس کھیلنے آیا کرتیں۔ لکھنؤ کے کنگ جارجز کی پڑھی ہوئی تھیں۔ لندن جاکر ایک ڈپلوما بھی مار لائی تھیں۔ لیکن کیا مجال جو کبھی بد دماغی دکھلا جاویں۔ لوگ کہتے تھے۔ صاحب بڑی شریف ڈاکٹرنی ہے۔ بالکل گائے سمجھیے، گائے۔ جی ہاں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ آپ یہ توقع کریں کہ ہر لیڈی ڈاکٹر انسانوں اور ناولوں کی روایت کے مطابق حور شمائل، مہ وش، پری پیکر ہو۔ اچھی آدمی کا بچہ تھیں بلکہ ایک مرتبہ تو ڈسٹرکٹ جج مسٹر کاظمی کی بیگم صاحب نے مسٹر فرحت علی سے تجویز بھی کی تھی کہ بھیا آزادی کا زمانہ ہے۔ مس شبیرہ ہی سے بیاہ کر لو۔ یہ جو سال سال چھٹیوں میں تمہاری اماں تمہیں لڑکیاں دیکھنے کے لئے نینی تال، مسوری بھیجا کرتی ہیں۔ اس دردِ سر سے بھی نجات ملے گی اور کیا۔

راوی کہتا ہے کہ فرحت علی نے جو ان دنوں بڑے معرکے کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ بیگم کاظمی کے سامنے کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک کی تھی۔ اور تھر تھر کانپا تھا۔ اور دست بستہ یوں گویا ہوا تھا کہ آئندہ وہ مس شبیرہ حمایت سے جو گفتگو کرے گا۔ وہ صرف چار جملوں پر مشتمل ہوگی۔ آداب عرض۔ آپ اچھی طرح سے ہیں۔ جی ہاں بالکل اچھی طرح ہوں۔ شکریہ آداب عرض۔

مصیبت یہ تھی کہ جہاں کسی شامت کے مارے نے کسی "غیر منسلک" خاتون محترم سے سوشل گفتگو کے دوران میں ان چار جملوں سے تجاوز کیا تو بس سمجھ لیجیے۔ ایکٹوٹی ہو گئی۔

تو غرضیکہ راوی دریا کو یوں کوزے میں بند کرتا ہے۔ کہ کنول کماری کے میاں کا تقرر اس جگہ پر ہوا (انگریز حاکموں کی اصطلاح میں صوبے کا ضلع "اسٹیشن" کہلاتا تھا)

اور نئے حاکم ضلع کے اعزاز میں کنور نرنجن داس رئیس اعظم جرن پور نے (کہ یہ سارا ایک نام تھا) اپنے باغ میں بڑی دھوم کی دعوت کی چبوترے پر زرتار شامیانہ تانا گیا۔ رات گئے تک جلسہ رہا۔ بیبیوں کے لئے اندر علیحدہ دعوت تھی۔ مصرانیوں نے کیا کیا کھانے نہ بنائے۔ مسلمانوں مہمانوں کے لئے باؤلے ڈپٹیوں کے وہاں سے باورچی بلوائے گئے تھے (باؤلے ڈپٹیوں کا ایک خاندان تھا جس میں عرصہ ہوا ایک ڈپٹی صاحب کا دماغ چل گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ پورا خاندان باؤلے ڈپٹیوں کا گھرانا کہلاتا تھا، کہار آوازہ لگاتے۔ اجی باؤلے ڈپٹیوں کے ہاں سے سواریاں آئی ہیں۔ اتروا لو مہریوں سے کہا جاتا ارے باؤلے ڈپٹیوں کے ہاں نیوتا دیتی آنا ری رام رکھی جاؤ وہیٹی۔

ہیم کرن ایسے تو کہیں آتی جاتی نہ تھیں۔ پر رانی نرنجن داس کی

زبردستی پردہ بھی دعوت میں آگئی تھیں۔ کلکٹر کی بیوی سے ملنے کے لئے عمائدین شہر کی بیویوں نے کیا کیا جوڑے نہ پہنے تھے۔ لیکن جب خود کنول کماری کو دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ پوری میم ہے۔ غضب خدا کا ہاتھوں میں چوڑیاں تک نہ تھیں۔ ناک کی کیل تو گئی چولہے بھاڑ میں ہلکے نیلے رنگ کی ساری پہنے گاؤ تکیئے سے ذرا ہٹ کر بیٹھی وہ سب سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتی رہی۔

"اے لو بیٹیا تم نے تو سہاگ کی نشانی ہی کو جھاڑو پیٹے فیشن کی بھینٹ کر دیا۔" صدر اعلیٰ کی بیگم نے ناک پر انگلی رکھ کر اس سے کہا۔

"اے ہاں سچ تو ہے۔ کیا ڈنڈا ایسے ہاتھ لئے بیٹھی ہو۔ دور پار چھائیں پھوئیں دیکھے ہی سے ہول آتا ہے۔" بیگم کاظمی نے بھی صادر کیا۔

کھیم کی تو بہرحال آج عید تھی۔ اس نے تیز جامنی رنگ کی بنارسی ساری باندھی تھی۔ پاؤں میں رام جھول پہنے تھے۔ سونے کی کودھنی اور دوسرے سارے گہنے پاتے علیحدہ کندن کا چھپکا اور مگر کشوری بھی پہن آئی تھی لیکن کشوری کی اماں دجو محلے میں بڑی بھاوج کے نام سے یاد کی جاتی تھیں، بن بیاہی لڑکیوں کے زیادہ سنگار پٹار کی قطعی قائل نہ تھیں۔ ان کے یہاں تو لڑکیاں بالیاں مانگ تک بالوں میں نہ کاڑھ سکتی تھیں۔ پر اب زمانے کی ہوا کے زیر اثر نئی پود کی لڑکیوں نے سیدھی اور آڑھی مانگیں کاڑھنی

شروع کر دی تھیں۔ کھیم دور سے بیٹھی کنول کماری کو دیکھتی رہی۔ کتنی سندر ہے۔ اور پھر ایم اے پاس، ایم اے پاس لڑکی کھیم اور کشوری کی نظروں میں بالکل دیوی دیوتا کا درجہ رکھتی تھی۔ کنول کماری جین ساری مہمان بیبیوں سے ہنس ہنس کر سخت خوش اخلاقی سے گفتگو کرنے میں مصروف تھی۔ (اور ساری محفل نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ لڑکی سابق کلکٹر کی بیوی اس چڑیل مسز بھارگو اسے کہیں زیادہ اچھی اور ملنسار ہے۔ رانی بٹیا ہے بالکل)

دالان کے گملوں کی اوٹ میں کھیم اور کشوری بیٹھی تھیں اور منٹ منٹ پر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوئی جاتی تھیں۔ اب ایک بات ہو تو بتلائی جائے۔ دسیوں تھیں۔ مثلاً موٹی مصرانی کی چال ہی دیکھ لو۔ اور ادھر سے کنور نرنجن داس صاحب خانہ کی اسٹیٹ کے مینجر صاحب لالہ گنیش مہاشے بار بار ڈیوڑھی میں آن للکارتے۔ "اجی پردہ کر لو۔ کہار اندر آرہے ہیں" تو ان کے حلق میں سے ایسی آواز نکلتی جیسے ہارمونیم کے پردوں کو برساتی ہوا مار گئی ہو۔

اب کے سمے جب ماما لکھنؤ سے گھر آئے تو کھیم نے دعوت کی ساری داستان گذار دی۔ کنول کماری ایسی، اور کنول کماری ویسی ماما چپکے بیٹھے سنتے رہے۔

کیسم جب رات کا کھانا کھا کر سونے چلی گئی اور سارے گھر میں خاموشی چھا گئی تو ڈاکٹر صاحب آفتاب رائے چھت کی منڈیر پر آکھڑے ہو گئے۔ باغ اب سنسان پڑے تھے۔ گرمیوں کا موسم نکلتا جا رہا تھا۔ اور گلابی جاڑے شروع ہو گئے تھے۔ پروائی ہوا آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ نیچے ٹھکرائن کی بگیا والی گلی کے برابر سے مسلمانوں کا محلہ شروع ہوتا تھا۔ اس کے بعد بازار تھا۔ جس میں مدھم گیس اور لالٹین کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں پھر پولیس لائنز کے میدان تھے۔ اس کے بعد کچہری اور سول لائنز سول لائنز میں حاکم ضلع کی بڑی کوٹھی تھی۔ جس پر یونین جیک جھٹ پٹے کی نیم تاریکی میں بڑے سکون سے لہرا رہا تھا۔ سارے میں یہ تھکی ہوئی خاموشی چھائی تھی۔ سامنے سلطان حسین شرقی کے زمانے کے اونچے پھاٹک اور مسجدوں کے بلند مینار رات کے آسمان کے نیچے پانچ سو سال سے اسی طرح ساکت اور صامت کھڑے تھے۔ زندگی میں بے کیفی تھی اور اداسی اور ذلت تھی۔ اور شاید غلامی کا احساس تھا۔

عمر بھر آفتاب رائے نے یوں ہی سوچا تھا کہ اب وہ اور کچھ نہ کریں گے۔ لیکن دنیا موجود تھی۔ وہ کام بھی کرتے۔ کھانا بھی کھاتے۔ سال میں

چار دفعہ جون پور آ کر جی جی سے دماغ سوزی بھی کرتے۔ زندگی کے بھاری پن کے باوجود گاڑی تھی کہ چلے جا رہی تھی۔

کنول کماری اس منظر کے پرے، مولسری کے جھنڈ کے دوسری طرف لرنین جیک کے سائے میں براجتی تھی۔ بہت سے لوگ ہیں کہ جو راستہ سوچا اختیار کر لیا۔ آرام سے اس پر چلتے چلے گئے۔ یہاں کسی راستے کا یقین ہی نہ ہو پاتا تھا۔ ایک کے بعد ایک سب ادھر ادھر نکل گئے تھے۔ آفتاب رائے وہیں کے وہیں تھے۔

کنول کماری ——— ؟ لاحول ولاقوۃ

جب وہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کے لئے ولایت جا رہے تھے۔ تو کنول نے ان سے کہا تھا "آفتاب بہادر تم کو اپنے اوپر بڑا مان ہے۔ پر وہ مان ایک روز ٹوٹ جائے گا۔ جب میں بھی کہیں چلی جاؤں گی۔"

"تم کہاں چلی جاؤ گی ——— ؟"

"افوہ ——— لڑکیاں کہاں چلی جاتی ہیں ——— ؟"

"گویا تمہارا مطلب ہے کہ تم بیاہ کر لو گی۔"

"میں خود تھوڑا ہی بیاہ کرتی پھروں گی۔ ارے عقلمند داس۔ میرا بیاہ کر دیا جائے گا۔" اس نے جھنجھلا کر جواب دیا تھا۔

"ارے جاؤ ———" آفتاب رائے خوب ہنستے تھے ——— "میں اس

جھانسے میں آنے والا نہیں ہوں۔ تم لڑکیوں کی پسند بھی کیا شے ہے۔ تم جیسی ماڈرن لڑکیاں آخر میں پسند اسی کو کرتی ہیں جو ان کے سماجی اور معاشی معیار پر پورا اُترتا ہے باقی سب بکواس ہے۔ پسند اضافی چیز ہے تمہارے لئے۔"

"ہاں —— بالکل اضافی چیز ہے۔ آفتاب بہادر ——" وہ غصّے کے مارے بالکل خاموش ہو گئی تھی۔

وہ چاند باغ میں تھی۔ آپ بادشاہ باغ میں بڑی دھوم دھام سے براجتے تھے۔ یونین کی پریذیڈنٹی کرتے تھے۔ تقریریں بگھارتے تھے۔ ایک منٹ نچلے نہ بیٹھتے تھے۔ تاکہ کنول نوٹس نہ بھی لیتی ہو تو لے۔ وہ اے پی سین روڈ پر رہتی تھی اور سائیکل پر روز چاند باغ آیا کرتی تھی۔ لکھنؤ کی بڑی نمائش ہوئی تو وہ اپنے کنبے کے ساتھ میوزک کانفرنس میں گئی۔ وہاں یونیورسٹی والوں نے سہگل کو اپنے محاصرے میں لے رکھا تھا جس گانے کی یونیورسٹی اور چاند باغ کا مجمع فرمائش کرتا۔ وہی سہگل کو بار بار گانا پڑتا۔ بھائی آفتاب بھی شور مچانے میں پیش پیش۔ لیکن اگلی صف میں کنول کو بیٹھا دیکھ فوراً سٹ پٹا کر چپ ہو گئے۔ اور سنجیدگی سے دوستوں سے بولے کہ یار چھوڑو کیا ہلڑ مچا رکھا ہے۔ اس پر عزت نے عسکری بلگرامی سے کہا۔ (آج ان دونوں پیارے دوستوں کو مرے بھی اتنا عرصہ ہو گیا تھا۔ منڈیر پر کھڑے ہوئے آفتاب رائے

کو خیال آیا، عزت نے عسکری سے کہا۔" استاد یہ اپنا آفتاب جو ہے۔ یہ اس انڈیا پر اچھا امپریشن ڈالنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہے۔ اب خدا وند تعالیٰ ہی اس پر رحم کرے۔

"بی اے کے بعد تم کیا کرو گی ——؟ ایک روز آفتاب رائے نے کنول سے سوال کیا۔

"مجھے کچھ پتہ نہیں ——" کنول نے کہا تھا۔ اس میں گویا یہ اشارہ تھا کہ مجھے تو کچھ پتہ نہیں تم ہی کوئی پروگرام بناؤ۔

لیکن کچھ عرصے بعد وہ سیدھے سیدھے ولایت نکل گئے۔ کیونکہ غالباً ان کی زندگی ان کے لیے، ان کے گھر والوں کے لیے، کنول کے وجود سے کہیں زیادہ اہم تھی۔ پھر ان کی آئیڈیالوجی تھی۔ دیار کیا بکواس لگا رکھی ہے بعزت نے ڈپٹ کر کہا تھا۔)

پر ایک روز لندن میں جب وہ سینیٹ ہاؤس کی لائبریری سے گھر کی اور جا رہے تھے۔ تو راہ میں انہیں مہی پال نظر آیا۔ جس نے دور سے آواز لگائی ——" چائے پینے چلو تو ایک حادثہ فاجعہ گوش گزار کروں۔ کنول کماری کا جگن ناتھ جین سے بیاہ ہو گیا۔ وہی جو سن پینتیس کے بیچ کا ہے۔"

لڑکیوں کی عجیب بے ہودہ قوم ہے۔ اس روز آفتاب رائے اس نتیجے پر پہنچے۔ ان کو سمجھنا ہمارے تمہارے بس کا روگ نہیں۔ میاں وہ جو

بڑی انٹلکچوئیل کی ساس بنی پھرتی تھی۔ ہو گئی ہو گی۔ اب گلیڈ جگن ناتھ جلین مائی فٹ ——— کون تھا یہ اُلّو ——— میں نے کبھی دیکھا ہے اُسے ———؟ مہی پال کے کمرے میں پہنچ کر آتشدان سُلگاتے ہوئے انہوں نے سوال کیا۔

مہی پال رائے زادہ کھڑکی میں جھکا باہر سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں ٹھیلے والے کوکنی دن بھر گلا پھاڑ کر چلاتے رہنے کے بعد اب اپنے اپنے ترکاریوں کے ٹھیلے گھسیٹتے ہو ہمر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے شام کا دھندلکا سارے میں بکھر گیا تھا۔ زندگی بہت اداس ہے اس نے خیال کیا تھا۔ ہاں۔ اس نے آفتاب رائے سے کہا تھا۔ میں نے اسے پٹنے میں دیکھا تھا۔ کالا سا آدمی ہے۔ عینک لگاتا ہے۔ کچھ کچھ لومڑی سے ملتی جلتی اس کی شکل ہے۔

"بے وقوف بھی ہے ———؟" آفتاب رائے نے پوچھا تھا۔

"خاصہ بیوقوف ہے۔" مہی پال رائے زادہ نے جواب دیا تھا۔

"پھر کنول اس کے ساتھ خوش کیسے رہ سکے گی ———؟"

آفتاب رائے نے مہی پال سے مطالبہ کیا

"میاں آفتاب بہادر ———" مہی پال نے مڑ کر ان کو مخاطب کیا۔

"یہ جتنی لڑکیاں ہیں نا ——— جو افلاطونِ زماں بنی پھرتی ہیں۔ یہ بیوقوفوں کے ساتھ ہی خوش رہتی ہیں۔ آیا عقل میں تمہاری ———؟"

"کیا بکواس ہے۔" آفتاب رائے نے بڑی آزادگی سے کہا۔

اب مہی پال رائے زادہ کو صریحاً غصہ آگیا۔ اس نے جھنجھلا کر کہا تھا

"تو میاں تم کو روکا کس نے تھا۔ اس سے بیاہ کرنے کو۔ جواب مجھے بور کر رہے ہو۔ کیا وہ تم سے خود آ کر کہتی کہ میاں آفتاب بہادر میں تم سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔ ایں ---! اور فرض کرو کہ اگر وہ خود سے ہی انکار کر دیتی تو کیا قیامت آجاتی میاں لڑکی تھی یا ہوا۔ کیا مارتی وہ تم کو جھاڑو لے کر۔ کیا کرتی ---؟ تم نے لیکن کہہ کے ہی نہیں دیکھا۔ خیر چلو --- خیریت گزر گئی۔ اچھا ہی ہوا۔ کہاں کا جھگڑا مول لیتے بے کار میں۔ کیوں کہ میرا مقولہ ہے (اس نے انگلی اٹھا کر عالمانہ انداز میں کہا) کہ شادی کے ایک سال بعد سب شادیاں ایک سی ہو جاتی ہیں۔ تم کو تو جگن ناتھ جین کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔ کہ اس نے تم کو ایک بارِ عظیم سے سبکدوش کیا۔ بلکہ وہ تمہارے حق میں بالکل دافع بلیات ثابت ہوا۔"

"بے ہودہ ہیں آپ انتہا سے زیادہ ---" آفتاب رائے نے جھنجھلا کر کہا تھا۔

لکھنؤ لوٹ کر ایک روز آفتاب رائے اتفاقاً اے پی سین روڈ پر سے گزرے۔ سامنے کنول کے باپ کی سرخ رنگ کی بڑی سی کوٹھی تھی۔ جس کی برساتی پر کاسنی پھولوں کی بیل پھیلی تھی۔ یہاں ایک زمانے میں کتنا

اودھم مچتا تھا۔ کنول کے سارے بہن بھائیوں نے مل کر اپنا آرکیسٹرا بنا رکھا تھا۔ کوئی بانسری بجاتا، کوئی جل ترنگ۔ کنول طبلہ بجاتی۔ ایک بھائی وائلن کا استاد تھا۔ سب مل کر جے جے ونتی شروع کر دیتے۔ مورے مندر اب کیوں نہیں آئے —— کیسی چوک بھئی موسے آلی —— پھر ارچنا بینرجی آ جاتی اور رکوئل ایسی آواز میں گاتی —— آمی پوہوڑی جھورنا مکر بوجوئے ہو —— اتوار کو دن بھر بیڈمنٹن ہوتا۔ بہ ہمہ تو آفتاب رائے ان لوگوں کے یہاں موجود رہتے تھے۔ اور جب ایک روز خود ہی چپکے سے ولایت کھسک لئے تو ان لوگوں کا کیا قصور۔ وہ لڑکی کو بنک کے سیف ڈیپازٹ میں تو ان کے خیال سے رکھنے سے رہے اور جگن ناتھ جین ایسا رشتہ تو بھائی قسمت والوں ہی کو ملتا ہے۔

پھر ایک روز امین آباد میں انہوں نے کنول کو دیکھا۔ وہ کار سے اُتر کر اپنی سسرال والوں کے ساتھ پارک کے مندر کی اور جا رہی تھی داؤ جی سائیں کے مندر دیا بار آئیں —— کر آئیں سولہ شرنگار۔ وہ گرمیوں کی شام تھی۔ امین آباد جگمگا رہا تھا۔ ہوا میں موتیا اور خس کی مہک تھی اور مندر کا گھنٹہ یکسانیت سے بجے جا رہا تھا۔

اب آفتاب رائے یونیورسٹی میں تاریخ کی چیئر سنبھالے ہوئے تھے۔ ساتھیوں کی محفل میں خوب اودھم مچاتے، ٹینس کھیلتے اور صوفی ازم

تاریخ پر ایک مقالہ لکھ رہے تھے۔ ہیں وہ نہیں ہوں جو میں ہوں۔ میں وہ ہوں جو میں نہیں ہوں۔ ہر چیز باقی ساری چیزیں ہیں۔ بھگوان کرشن جب ارجن سے کہتے ہیں ——— او پرنس ارجنا ——— "ارے جا" ——— عسکری ڈانٹ بتاتا۔ "اگر تم اس چکر میں ہو کہ تم بھی پروفیسر ڈی پی مکرجی کی طرح مہاگرو بن کے بیٹھ جاؤ گے تم غلطی پہ ہو۔ ڈاکٹر آفتاب رائے تمہارا تو ہم مارتے مارتے حلیہ ٹھیک کر دیں گے ——— " مہی پال اضافہ کرتا۔

جون پور آ کر وہ کھیم کو دیکھتے کہ تندہی سے کچالو کھا رہی ہے۔ کتھک سیکھ رہی ہے۔ جل بھرنے چلی ری گوئیاں آں آں گاتی پھر رہی ہے۔ یہ بھی کنول کماری کی قوم سے ہے۔

"اری او باؤلی ——— بتا تو کیا کرنے والی ہے ——— " وہ سوال کرتے۔

"پتہ نہیں ماما ——— " وہ معصومیت سے جواب دیتی۔

"پتہ نہیں کی بچی ——— وہ دل میں کہتے۔

چھت کی منڈیر پہ ٹہلتے ٹہلتے آفتاب رائے نیم کی ڈالیوں کے نیچے آ گئے۔ سامنے بہت دور، سول لائنز کے درختوں میں چھپی ہوئی حاکم ضلع کی کوٹھی میں گیس کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ پروائی ہوا بہے جا رہی تھی۔ یہ چاند رات تھی اور مسلمانوں کے محلوں کی طرف سے محرم کے

نقاروں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

محرم آگیا ـــــ آفتاب رائے کو خیال آیا ـــــ شاید اب کے سے پھر سر پھٹول ہو۔ بہت دنوں سے نہیں ہوئی تھی۔

انہوں نے سوچا۔

ویسے انگریز کی پالیسی یہ تھی کہ جن ضلعوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ وہاں ہندو افسروں کو تعینات کیا جاتا تھا اور جہاں ہندو زیادہ ہوتے تھے۔ وہاں مسلمان حاکموں کو بھیجا جاتا تھا۔ تاکہ توازن قائم رہے۔ یہ دوسری بات تھی کہ صوبے کی چھ کروڑ آبادی کا صرف ۱۳ فی صدی حصّہ مسلمان تھے۔ لیکن اتنی شدید اقلیت میں ہونے کے باوجود تہذیبی اور سماجی طور پر مسلمان ہی سارے صوبے پر چھائے ہوئے تھے۔ جون پور، لکھنؤ، آگرہ، علیگڑھ بریلی، مراد آباد اور شاہجہان پور وغیرہ جیسے ضلعوں میں تو مسلمانوں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ لیکن باقی کے سارے خطوں میں بھی ان کا ہی بول بالا تھا۔ صوبے کی تہذیب سے مراد وہ کلچر تھا۔ جس پر مسلمانوں کا رنگ غالب تھا۔ گلی گلی، محلے محلے، گاؤں گاؤں سینکڑوں ہزاروں مسجدیں اور امام باڑے تھے۔ مکتب، مدرسے، درسگاہیں، قلعے، حویلیاں چپے چپے سے مسلمانوں کی آٹھ سو سال پرانی روایات وابستہ تھیں۔

ہندو مسلمانوں میں سماجی سطح پر کوئی واضح فرق نہ تھا۔ خصوصاً دیہاتوں

اور قصبہ جات میں عورتیں زیادہ تر ساریاں اور ڈھیلے پاجامے پہنتیں۔ اودھ کے بہت سے پرانے خاندانوں میں بیگمات اب تک لہنگے بھی پہنتیں۔ بن بیاہی لڑکیاں ہندو اور مسلمان دونوں ساری کے بجائے کھڑے پانچوں کا پاجامہ پہنتیں۔ ہندوؤں کے یہاں اسے "اجار" کہا جاتا۔ شغلوں کی تقسیم بڑی دلچسپ تھی۔ پولیس کا عملہ اسی فیصدی مسلمان تھا۔ محکمہ تعلیم میں ان کی اتنی ہی کمی تھی۔ تجارت تو خیر کبھی مسلمان بھائی نے ڈھنگ سے کر کے نہ دی چند پیشے مگر خاص مسلمانوں کے تھے۔ جن کے دم سے ھر یلے کی مشہور صنعتیں قائم تھیں۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے کچھ ایسا مضبوط نظام تھا کہ سارا منافع تو بازار تک پہنچاتے پہنچاتے مڈل مین ہی مارے جاتا تھا اور جو بھائی کے پاس بچتا تھا۔ اس میں قرضے چکانے تھے۔ بٹیا کا جہیز بنانا تھا اور ہزاروں قصے تھے آپ جانئے۔

زبان اور تہوار ایک ہی تھے۔ مسلمان بچے برسات کی دعا مانگنے کے لئے منہ نیلا نیلا کئے گلی گلی ٹین بجاتے پھرتے اور چلاتے برسو رام دھڑاکے سے بڑھیا مر گئی فاقے سے گڑیوں کی بارات نکلتی تو وظیفہ کیا جاتا ـــــ ہاتھی گھوڑا پالکی ـــــ جے کنہیا لال کی۔ مسلمان پردہ دار عورتیں جنہوں نے ساری عمر کسی ہندو سے بات نہ کی تھی۔ رات کو جب ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو لہک لہک کر الاپتیں ـــــ بھری گگری موری ڈھرکائی

شام —— کرشن کنہیا کے اس تصور سے ان لوگوں کے اسلام پہ کوئی حرف نہ آتا تھا۔ یہ گیت اور گجریاں اور خیال، یہ محاورے، یہ زبان ان سب کی بڑی پیاری اور دلآویز مشترکہ میراث تھی۔ یہ معاشرہ جس کا دائرہ مرزا پور اور جون پور سے لے کر لکھنؤ اور دہلی تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک مکمل اور واضح تصویر تھا۔ جس میں آٹھ سو سال کے تہذیبی ارتقاء نے بڑے گمبھیر اور بڑے خوب صورت رنگ بھرے تھے۔

ڈاکٹر آفتاب رائے نے (کہ ان کا نام ہی اس مشترکہ تمدن کی لطافت کا ایک مظہر تھا) ایک بار سوچا تھا کہ وہ کبھی ایک کتاب لکھیں گے کہ کس طرح پندرھویں صدی میں بھگتی تحریک کے ذریعے —— لیکن ذہن ہی کو مکمل سکون کہاں میسر تھا۔ پہلے یہ کنول کماری کو دیکھ پڑی۔ پھر ان کی معاشی مجبوریاں آڑے آئیں اور ان کو ولایت سے لوٹ کر بنارس میں لیکچرر شپ سنبھالنی پڑی جہاں دن رات ہندی اتھوا ہندوستانی کے گن گائے جاتے —— یہ میں تم سے کہتا ہوں —— کہ شدھ ہندی اور گئو رکھشا اور رام راجیہ یہ سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس خطرے سے بچو —— انہوں نے ایک دفعہ ایک کانفرنس کے پنڈال میں چلا کر کہا تھا۔

آفتاب رائے کے ساتھی مذاق میں انہیں جون پور کا قاضی کہا کرتے تھے —— "یہ جو کتاب تم لکھنے والے ہو اس کا نام لکھنا" "جون پور کا قاضی"

"عرفؔ" میں شہر کے اندیشے میں دبلا کیوں ہوا ——"

رات کی ہوا میں خنکی بڑھ چکی تھی۔ نیم کے پتے بڑے پُراسرار طریقے سے سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ہاں زندگی میں بے پایاں اداسی تھی اور ویرانہ اور تاریکی۔

محلے کے مکانوں میں مدھم روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ نیچے بڑی بھاوج کے مکان کے بڑے آنگن میں مجلس کے لیے جو گیس کا ہنڈہ نصب کیا گیا تھا۔ اس کی روشنی رات کے ویرانے میں بڑی لرزہ خیز معلوم ہوتی تھی۔ جیسے جھوے کے جنگل میں اگیا بھتال اور مسان چپکے چپکے روتے ہوں۔

مجلسوں کے گریہ و بکا کی مدھم آوازیں پروائی کے جھونکوں میں رل مل کر وقفے وقفے کے بعد یک لخت بلند ہو جاتی تھیں۔ نکڑ پر کنول نرنجن داس کے ہاں کی محرم کی سبیل کے پاس رکھی ہوئی نوبت یکسانیت سے بجے جا رہی تھی۔

"عاشورہ کی شب لیلیٰ ارے سرہانے شمع رکھ کر ——" بو امدن نے تکیہ پر کرم خوردہ کتاب رکھ کر پڑھنا شروع کیا۔

"اُسے تکتی رہیں چہرہ علی اکبر کا ——" بگّن نے باریک تیز آواز میں ساتھ دینا شروع کیا۔

"اے لو وہ نوں کی دونوں سیٹھیا گئی ہیں —— اے بیوی چاند رات کو نویں تاریخ کے مرثیے نکال کر بیٹھ گئیں ——!" بڑی بھاوج نے باورچی خانے میں سے پکارا۔

"توبہ توبہ.... کمبخت ایسی سارٹستی پڑی ہے کہ اب تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ اے لو میں تو عینک لانا ہی بھول گئی۔ اب مجھے کچھ سجھائی تھوڑی دے رہا ہے۔ میں نے تو اٹکل سے پڑھنا شروع کر دیا —— اے بہن —— اے نیازی بیگم —— ذری اپنی عینک تو دینا ——" بُوا مدّن نے طویل سانس بھر کے کہا۔

نیازی بیگم نے اپنی عینک اتار کے دی جو بُوا مدّن نے ناک کی پھننگ پہ رکھ کر پھر سے بیاض کی ورق گردانی شروع کی۔

اے بوا مدن نجم الملّت کی بیاض بھی لائی ہو کہ نہیں ——؟ بڑی بھاوج نے تخت کے پائے کے قریب آکر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

"لڑکیوں سے پوچھیے —— بڑی بھاوج —— نجم الملّت کے نوحے تو یہی لوگ پڑھتے ہیں ——" بگّن نے جواب دیا۔

"ہاں بٹیا ہم تو پرانے فیشن کے آدمی ہیں۔ اب تو نوحوں میں بھی نئے

رنگ نکلے ہیں ـــــ" بُوا مُدن نے قدرے بے نیازی سے اضافہ کیا۔
یہ لڑکیوں پر صفا چوٹ تھی۔ بُوا مُدن نے لڑکیوں کی نوحہ خوانی کو کبھی بھی بنظرِ استحسان نہ دیکھا۔

کنبے اور محلے کی ساری لڑکیاں دیوار کے سہارے بڑے اسٹائل سے سیاہ جارجٹ کے دوپٹوں سے سر ڈھانپے خاموش بیٹھی تھیں۔ بُوا مُدن کے اس طعنے کا انہوں نے ہرگز نوٹس نہیں لیا۔

"ڈولی اُتروالو ـــــ" باہر سے رام بھروسے کی آواز آئی۔

"پردہ کر لو لوگو ـــــ کہار اندر آتے ہیں ـــــ"

فریٰ کی سینی دھم سے گھڑونچی پر ٹکا کے ممولہ تیز آواز میں چلّائی ـــــ "چھمّو بیگم آگئیں۔"

چھمّو بیگم ڈولی میں سے اُتریں اور پائنچے سمیٹ کے پانی سے لبریز نالی کو الانگنے کے ارادے سے آگے بڑھیں۔ "اللہ رکھے بڑی بھاوج کے ہاں تو ہر وقت بس بہیا سی آئی رہتی ہے۔" انہوں نے ذرا بے زاری سے کہا۔

کہیں ممولہ نے یہ سن لیا۔ "اے چھمّو بیگم ـــــ ذری زبان سنبھال کے بات کیا کیجئے۔ بڑی بھاوج کے دشمنوں کے گھر بھیّا آوے۔ شیطان کے کان بہرے ـــــ ایسا ہیں نے آنگن کا سارا پانی سونتا ہے۔ اپنے ہاں نہیں دیکھتے۔ ساری گلی کوڑے کے نوبت رائے کا تلاؤ بنا رکھا ہے۔ پانی

آپ کے گھر میں کھڑا رہتا ہے۔ ہاں“ اس نے منہ در منہ جواب دیا۔

”اے بی چھمو! ــــ زری آپے میں رہنا ــــ میں خود سے نہیں آ گئی۔ بڑی بھاوج نے سو دفعہ بلایا کہ آ کر مجلس پڑھ جاؤ ــــ مجلس پڑھ جاؤ ــــ میں اپنے گھر سے فالتو نہیں ہوں۔ کہ مارے ماری پھروں اور ٹکے کی ڈومنیوں کی باتیں سنوں ــــ ہاں ــــ لو بھائی ڈولی واپس کرو ــــ“ چھمو بیگم نے بیچ آنگن کے کھڑے ہو کر رجز پڑھا۔

بڑی بھاوج جلدی سے اُٹھ کر باہر آئیں ــــ ”اے ہے ــــ یہ کیا کوا لوجن مچی ہے ــــ اماموں پر مصیبت کی گھڑی آن پہنچی اور تم ہو کہ کھڑی جھگڑ رہی ہو ــــ چل نکل ممولہ یہاں سے ــــ ڈوبی جب دیکھو تب یہی فضیحتا شروع کرتی ہے۔ آؤ چھمو بیگم جم جم آؤ ــــ“

ڈیوڑھی میں کہاروں نے زور سے ڈنڈا بجایا۔ اجی پیسے بھجوائے بیگم صاحب ــــ ارے دیا رے ــــ ساری دیہہ دکھن لاگت ہے ــــ رام بھروسے نے دیوار سے لگ کر ماتا دین کی بیڑی سلگاتے ہوئے اظہار خیال کیا۔ ویسے محرم کی وجہ سے اب پیسے خوب ملیں گے چہلم تک دس دس پھیرے ایک گلی کے ہوتے تھے اور ہر پھیرا تین تین پیسے۔ دور کے محلوں تک آنے جانے کے تو دو دو آنے تک ہو جاتے تھے۔ بس چاندی تھی۔ آج کل بھائی رام بھروسے اور ان کی برادری کی اور ریڑے جو چل رہے

تھے۔ وہ الگ رہتا۔ وہ ایک طرح کا لکڑی کا کرسی نما ٹھیلہ ہوتا تھا۔ جس میں چاروں طرف پردہ باندھ دیا جاتا تھا۔ اندر دو دو تین تین سواریاں گھس پٹ کر بیٹھ جاتی تھیں اور بچوں کی انگریزی پرام کی طرح پیچھے سے دھکیلا جاتا تھا۔ اور چرخ چوں کرتا رہتا۔ وہ گلیوں کے پتھریلے فرش پر بڑے ٹھاٹھ سے چلتا۔ پالکی کا کرایہ بہت زیادہ تھا۔ یعنی چھ آنے فی پھیرا۔ پرائیویٹ پالکی جو پہلے صدر اعلیٰ کے یہاں تھا۔

چھمو بیگم اس معرکے کے بعد ٹھمک ٹھمک چلتی آن کر چاندنی پر بیٹھ گئیں اور عینک لگا کر بڑے ٹھسّے سے چاروں طرف نظر ڈالی۔ بُواُمدن خود بڑی ہائی برو سوز خواں تھیں۔ انہوں نے کبھی چھمو بیگم کی پرواہ نہ کی۔

سوز ختم ہو چکا تھا۔ گوٹے کے پھندنے لگاتی بُواُمدن طمانیت سے جا کر ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔ چٹاپٹی کی گوٹ کا اودا پائجامہ اور نوتنے کے پروں ایسے ہرے رنگ کا دوپٹہ اوڑھے وہ اس شان سے دیوار سے لگ کر بیٹھتی تھیں کہ دور سے معلوم ہو جاتا تھا کہ ہاں بھئی رام پور کی میر یاسن ہیں۔ مذاق نہیں ہے۔

چھمو بیگم ایک تو یہ کہ سیدانی تھیں۔ دوسرے یہ کہ بگّن سلطان کے بیاہ کے سلسلے میں ان سے جنگ ہو چکی تھی۔ لہٰذا وہ بُواُمدن کو ہرگز خاطر میں نہ لاتیں۔ بُواُمدن کو یہ زعم تھا کہ مالکوس اور سوہنی اور بھاگ میں سوز ایسے

پڑھتی ہیں کہ مجلس میں ٹھیس پڑ جاتی ہے۔ تو چھمّو بیگم کو بھی اپنے اوپر ناز بے جا نہ تھا کہ آٹھویں تاریخ والا میر انیس کا مرثیہ پوری راگ داری کے ساتھ ان جیسا کوئی اور نہ پڑھ سکتا تھا۔

چھمّو بیگم نے تہ در تہ ریشمی غلافوں میں سے چاند رات کا بیان نکالا اور مجمع کو نہایت گھور کر دیکھا۔

لڑکیوں کا گروہ اپنی جگہ پر ذرا چوکنا ہو گیا۔ ان لڑکیوں پر فرض یہ تھا کہ جب چھمّو بیگم حدیث پڑھیں یا وعظ کریں تو یہ لوگ دوپٹے منہ میں ٹھونس کر کھِل کھِل ہنسیں پر بظاہر یہی معلوم ہوتا کہ زار و قطار رو رہی ہیں اور چھمّو بیگم کس قیامت کی حدیث پڑھتی تھیں کہ کہرام بپا ہو جاتا تھا۔

چھمّو بیگم کے وعظ بہت موڈرن ہوتے تھے۔ کیا جناب کپتن صاحب بلکہ خود قبلہ جار چوئی صاحب ایسے ایسے رموز و نکات۔ انگریزی فلسفے کے فلسفۂ شہادت میں سے نہ نکال سکتے۔ جو چھمّو بیگم پل کی پل میں دریا کوزے میں بند کر کے رکھ دیتی تھیں۔

"اے صاحبانِ مجلس ـــــ جب باری تعالیٰ نے اپنے نور کے دو حصے کیے ـــــ" والی تمہید سے لے کر جب وہ اس کلائمیکس تک پہنچتی تھیں کہ "اے بیبیو ـــــ جناب عباس نے رو کر کہا۔ بالی سکینہ اٹھو ـــــ" تو اس وقت مجلس میں نالہ و شیون سے قیامت بپا ہو چکی ہوتی تھی۔ اندر باہر سب

کہتے تھے کہ ماشاءاللہ سے چھمو بیگم نے سماں باندھ دیا۔ ان کے زورِ خطابت کا یہ عالم تھا کہ منٹوں میں بات کہیں سے کہیں پہنچتی تھی۔ ابھی حضرت جبرائیل علیہ السلام کا بیان ہو رہا ہے۔ ابھی یزید ملعون کے خاندان کا ذکر آ گیا۔ جنگ جمل کا واقعہ سنا رہی ہیں۔ ساتھ ساتھ اس کا موازنہ جرمن اور انگریز کی لڑائی سے بھی ہوتا جاتا ہے۔ رسالت مآبؐ کے بیان پر جب آتیں تو کہتیں —— "بیبیو —— میں کوئی مورخ کوئی تاریخ دان کوئی فلاسفر نہیں ہوں۔ مگر اتنا جانتی ہوں اور کہتے دیتی ہوں کہ ایک طرف عیسائیوں اور رومیوں کی دس لاکھ فوج تھی۔ ایک طرف جناب رسالت مآبؐ کے ساتھ صرف پندرہ آدمی تھے۔ مگر وہ گھمسان کا رن پڑا تھا کہ سارے فرشتے چرخِ اوّل پر اُتر آئے تھے اور نور کی جھاڑو سے رسالت مآبؐ کے لئے راستہ صاف کرتے جاتے تھے۔" خداوند تعالیٰ کے مسئلے پر فرماتیں —— "اے بیبیو —— یہ جو انگریزی دان دہریئے خدا کے منکر ہیں۔ ان کا احوال مجھ سے سنو اور کان کھول کر سنو —— کہ خداوند کریم ان سب شیطانی وسوسوں اور چالوں سے واقف ہے۔ جو فرنگیوں کے علم کے ذریعے ابلیس ملعون نے تم مسلمانوں کے دلوں میں ڈال دی ہیں۔ بلکہ میں تم کو آج یہ بتانا چاہتی ہوں۔ اے مومن بیبیو —— کہ قرآن حکیم کے اندر اللہ تعالیٰ نے خود انگریزی میں اپنی توحید کا ثبوت دیا ہے۔ فرماتا ہے۔ وہ ربِ ذوالجلال کہ قل ھو اللہ احد۔ اللہ

الصمد لم یلد ولم یولد ولم یکن لہٗ کفواً احد ___ یہ ون کیا ہے ___؟ ون انگریزی میں ایک کو کہتے ہیں ___ "مسئلہ توحید سے سلسلہ کھینچ کر پھر واقعہ کربلا اور شہادتِ علی اکبر سے ملا دیا جاتا۔ یہ چھمّو بیگم کے آرٹ کا کمال تھا۔

بڑی بھاوج کیا سارے محلے کو معلوم تھا کہ چھمّو بیگم خاصی فراڈ ہیں لیکن ان کی شمولیت کے بغیر مجلس میں جان ہی نہ پڑ سکتی تھی۔ لہٰذا ان کی بدمزاجی کو بھی برداشت کیا جاتا۔

برسوں سے جب سے بڑی بھاوج پیدا ہوئیں، بڑی ہوئیں، رخصت ہو کر بارہ بنکی سے جون پور آئیں۔ زندگی کا ایک چلن قائم تھا۔ جس میں شادی بیاہ، تیج تہوار، لڑائی جھگڑے، محرم، کونڈے جوگی رام پورے کی سالانہ زیارت غرض کہ ہر چیز کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم تھی۔ ڈپٹی جعفر عباس سے بڑی دھوم دھام سے ان کا بیاہ رچایا گیا تھا۔ جب وہ پندرہ سال کی تھی۔ کیا زمانے تھے۔ دو فرلانگ لمبا تو ماہی مراتب ہی تھا۔ براتیوں کو چاندی کی طشتریوں میں سندیلے کے لڈو بانٹے گئے تھے اور جناتیوں یعنی لڑکی کے گاؤں والوں کے یہاں ہفتوں مہینوں پہلے سے ڈھولک رکھ دی گئی تھی۔ ان کا میکہ سسرال دونوں طرف سے ماشاء اللہ سے بھرا پرا کنبہ تھا۔ بس ایک چھوٹی اماں ہی سے ان کی نہ بنی۔ دیورانی جٹھانی کا دیوار بیچ گھر تھا۔ لیکن مدتوں کھڑکی میں تالا پڑا

رہا۔ مقدمہ کا قصّہ دراصل امام باڑے والے آموں کے باغ سے چلا تھا بعد میں رفتہ رفتہ دونوں بھائیوں کے گھرانوں میں بول چال تک بند ہوگئی۔ سچ کہا ہے بوا کہ زر، زمین، زن یہ چیزیں گھر کا گھر تباہ کر دیتی ہیں۔ سگے بھائی غیر ہو جاتے ہیں۔ پر جب چھوٹی اماں بیمار پڑیں تو بڑی بھاوج نے وضعداری پر حرف نہ آنے دیا اور مرنے سے پہلے دیورانی سے ساری اگلی پچھلی شکایتوں کو بھول کر کہا سُنا معاف کروا لیا۔ اس پر بھی کہنے والوں کا منہ کس نے بند کیا ہے۔ محلے میں اڑ گئی کہ یہ چھوٹی اماں اپنے غلے کی کوٹھڑی میں سونے کی مہریں دفن کیے بیٹھی تھیں۔ یہ ان کو حاصل کرنے کی ترکیبیں تھیں۔ پوچھو بڑی بھاوج کے پاس خدا کا دیا خود کیا کچھ نہیں۔ جو وہ ایسے کمینے خیالات دل میں لائیں اور اصلیت یہ ہے کہ چھوٹی اماں کی وہ سونے کی مہروں والی جھجھری جس پر وہ عمر بھر بابا کا سانپ بنی بیٹھی رہیں۔ اُوت کے مال سے بھی بدتر ثابت ہوئی۔ لڑکوں نے لے کر سارا پیسہ دو سال کے اندر اڑا دیا۔ بلکہ بُوا اُمدن تو یقین محکم کے ساتھ کہتی تھیں کہ چھوٹی اماں اور بڑی بھاوج کی لڑائی کروانے میں زیادہ ہاتھ چھمو بیگم کا ہے۔ حرّافہ اِدھر کی اُدھر لگاتی تھی اور پھر سال کے سال منبر پر مولون بن کر چڑھ بیٹھتی ہے چڑیل۔

رونا بہر حال فرض تھا۔ خواہ چھمّو بیگم جیسی کٹنی ہی بیان کیوں نہ پڑھے۔ لہٰذا بُوا اُمدن دیوار کے سہارے بیٹھی بڑے مشہدی رومال سے منہ ڈھانپے

شائستگی سے سسکیاں بھرتی رہیں۔ لڑکیاں دہلیز پر بیٹھی بیٹھی اُونگھ رہی تھیں اور منتظر تھیں کہ کب حدیث ختم ہو اور نوحہ خوانی کی باری آئے۔

نوحے پڑھنے میں بڑی بھاوج کی لڑکی کشوری کو ملکہ حاصل تھا۔ ہائے آئے تھے کیا کیا گلِ زہرا کو فدائی —— نو ماؤں نے دیکھی در خیمہ سے لڑائی ارے لڑتے ہوئے گرتے ہوئے مرتے ہوئے دیکھا —— اور جانے کون کون سے جدید نوحے۔ جی ہاں —— ایسی پاٹ دار آواز میں آخری بند اٹھاتی کہ کھیم کے گھر تک آواز پہنچ جاتی تھی۔

نوحوں کی طرزیں نکالنا لڑکیوں کا خاص مشغلہ تھا۔ جہاں کوئی چلتا چلتا لیکن غمگین سی دھن کا گیت ریکارڈ پر سنا جھٹ ذرا سی تبدیلی کر کے نجم الملت کے کسی نوحے پر اس دھن کو چپکا دیا۔ طلعت آرا اس معاملے میں بڑی رجعت پسند واقع ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ بھئی یہ غلط بات ہے۔ یہ کیا ساتویں کی رات کو معلوم ہو کہ کانن بالا کا ریکارڈ بج رہا ہے۔ توبہ توبہ مگر کشوری کس کی سنتی تھی۔ ویسے بھی وہ بڑی آزاد خیال روشن دماغ انسان تھی۔ ہائی اسکول تو اس نے پاس کر لیا تھا۔ وہ تو لکھنؤ جا کر لگے ہاتھوں انٹر اور بی۔ اے بھی کر لے۔ لیکن چھوٹی اماں جب مرتے وقت بڑی بھاوج سے صلح صفائی کرنے پر تلیں تو یہاں تک طے کر گئیں کہ ان کے بڑے لڑکے میاں اعزاز سے اس کا بیاہ بھی کر دیا جائے۔

اب یہاں سے مسلم سوشل کلچر بننا شروع ہوئی۔ کشوری کہاں ایک تیز لڑکی۔ سارے نٹنگ کے نمونے اس کو آویں۔ جہاں پرچہ باغ میں کوئی نیا نمونہ سویٹر کا کسی کو پہنے دیکھ پاوے۔ گھر آ کر فوراً تیار۔ افسانے پڑھنے کی وہ شوقین۔ فیاض علی کی انور و شمیم سے لے کر کرشن چندر کی "نظارے" اور حجاب امتیاز علی کی "ظالم محبت" تک اس کی الماری میں موجود۔ سینما بھی جب موقع ملتا۔ ضرور دیکھ لیتی۔ میاں اعزاز تک تو یہ کہ خاصے مولوی آدمی تھے۔ پی۔ سی۔ ایس میں آ گئے تھے۔ کیننگ کالج سے ایم اے ایل ایل بی کر رکھا تھا۔ لیکن اس کے روادار نہیں تھے کہ گھر کی لڑکیاں ذرا کی نمائش ہی میں ہو آئیں۔ خود بڑی دون کی لیتے تھے کہ مس سکینہ سے یونین میں یوں بحث چلی اور مس صدیقی کے یہاں یوں چار پہ گیا۔ لیکن اپنے کنبے کی لڑکیوں کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ لڑکیاں جہاں گھر سے باہر نکلیں۔ میاں زمانہ خراب ہے۔ کسی کو بدنام ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔

بڑی بھاوج نے، لطیفہ یہ تھا کہ کشوری کے لئے بڑی منتیں مرادیں مان رکھی تھیں۔ عاشورہ کے روز جب ذوالجناح اندر لایا جاتا تو جلیبی کھلانے کے بعد اس کے کان سے منہ لگا کر ساری بیبیاں اور ساری لونڈی باندیاں دعا مانگتیں کہ مولا کشوری بٹیا کا نصیبہ اب کے سال کھلے۔

اب یہ پوچھو کہ یہ میاں اعزاز کے پلّے باندھنا نصیبے کا کھلنا سمجھا جا

رہا تھا۔ لیکن کشوری نے بھی طے کر لیا تھا کہ عین بیاہ کے موقع پر وہ انکار کر دے گی۔ برات میں ایک ہڑبونگ مچ جائے گی۔ وہ جیسا کہ سوشل فلموں میں ہوتا ہے کہ عین وقت پر جب پھیرے پڑنے والے ہوں تو اصل ہیرو ہسپتال یا جیل سے چھوٹ کر پہنچ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ "ٹھہر جاؤ یہ شادی نہیں ہو سکتی ـــــ"

کشوری کے بابا سید جعفر عباس ڈپٹی کلکٹر تھے۔ لیکن دل کے بڑے پکے قوم پرست مسلمان تھے۔ جب کانگریسی وزارت قائم ہوئی۔ تو آپ نے بھی خوب خوشیاں منائیں۔ حافظ ابراہیم ضلع میں آئے تو آپ مارے محبت کے جا کے ان سے لپٹ گئے۔ جب جنگ چھڑی اور کانگریسی وزارت نے استعفا دیا۔ اور مسلم لیگ نے یوم نجات منایا تو کشوری کے بابا کو بڑا دکھ ہوا۔ اب وہ ریٹائر ہو چکے تھے اور چبوترے پر بیٹھے پیچوان لگائے سوچا کرتے کہ دنیا ہی بدلتی جا رہی ہے لڑکے جن کو نوکری نہ ملتی تھی۔ اب فوج میں چلے جا رہے تھے۔ اپنا اصغر عباس ہی اب لیفٹیننٹ تھا۔ مہنگائی شدید تھی۔ لیڈر جیل میں تھے۔ لیکن زندگی میں یک بیک ایک نیا رنگ آ گیا۔

تھا۔ حافظ ابراہیم کے موقع پر ضلع کے اردو اخباروں نے لکھا تھا:
کہاں گئی موٹر سرکاری بیچاکر سبزی ترکاری، وہ بھی دیکھا، یہ بھی دیکھ
کشوری کے بابا کو یہ سب پڑھ اور سن کر صدمہ ہوتا۔ وہ بڑے پکے مسلمان تھے۔ دراصل مسلمانوں کے معاشرے کا استحکام انہیں پرانے مدرسۂ فکر کے ڈپٹی کلکٹروں کے دم قدم سے قائم تھا۔ پردے کے بڑے پابند۔ کیا مجال جو لڑکیاں بغیر قناتوں چادروں کے گھر سے قدم نکالیں (صوبے کے مشرقی ضلعوں میں برقعے کا رواج نہ تھا)۔ "باعزت متوسط طبقے" کی مسلمان اور ہندو عورتیں چادریں اور دلائیاں اوڑھ کر باہر نکلتی تھیں۔ ہندو عورتیں تو خیر گھونگھٹ کاڑھ کر سڑک سڑک پیدل گزر جاتی تھیں۔ لیکن مسلمان بیبیوں کا دن دہاڑے باہر نکلنا سخت معیوب خیال کیا جاتا تھا۔

اصغر عباس فوج میں رہ کر بالکل انگریز بنتا جا رہا تھا۔ اب کے سے جب وہ چھٹی پر گھر آیا تو چند شرائط بابا کے سامنے رکھیں:

(ا) وہ خود کنبے میں بیاہ نہ کرے گا۔

(ب) کشوری جب اس کے ساتھ رہنے کے لئے جبل پور جائے گی۔ تو پردہ نہ کرے گی۔

(ج) اعزاز میاں سے بیاہ کا پروگرام منسوخ۔

(د) کشوری کو ایف۔ اے کے لئے مسلم گرلز کالج لکھنؤ بھیجا جائے گا۔

بڑے بحث مباحثے کے بعد بابا اور بڑی بھاوج دونوں نے ان شرائط کے بیشتر نکات منظور کر لئے۔

ہندوستان کے مسلمان متوسط طبقے کا کوئی ہی خاندان ایسا ہوگا۔ جس کی لڑکیوں نے کبھی نہ کبھی علی گڑھ گرلز کالج یا لکھنؤ مسلم اسکول میں نہ پڑھا ہو۔ بیشتر لڑکیوں کو اس بات پر فخر ہوتا ہے کہ انہوں نے چاہے چند روز ہی کے لئے کیوں نہیں۔ لیکن پڑھا مسلم اسکول میں ہے۔

بعینہ یہی احوال مہیلا ودیالہ لکھنؤ کا تھا۔ صوبے کے سارے ٹھوس ہندو متوسط طبقے کی پیتریاں اس ڈش ودیالے کی ودیارتھی رہ چکی تھیں۔ سرکاری اور عیسائی اداروں کا ماحول مختلف تھا۔ وہاں انگریز کے اقبال کی وجہ سے شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔

اب کی جولائی کیھم اور کشوری اکٹھی ہی جون پور سے ٹرین میں سوار ہوئیں۔ اور لکھنؤ آن پہنچیں۔ چارباغ پر ماما کیھم کو اتروانے کے لئے آگئے تھے اور کشوری کو پہنچانے کے لئے نو ماجد بھائی بے چارے مردانہ ڈبے میں موجود ہی تھے۔ اسٹیشن کی برساتی میں پہنچ کر کیھم اور کشوری نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور روئیں اور کبھی کبھی ملنے کی کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ اور تانگوں میں بیٹھ کر اپنی اپنی راہ چلی گئیں۔

"کھیم وتی رائے زادہ سے میری ملاقات اتنے برسوں بعد بینٹ ہال کی سیڑھیوں پر ہوئی۔ وہ چودھری سلطان کے لیکچر کے اوپر جارہی تھی۔ میں احتشام صاحب کی کلاس کے بعد پرشین تھیٹر سے اُتر رہی تھی ـــــ" کشوری نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ـــــ اور پھر وہ خاموش ہوگئی ـــــ اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ جہاں برف کے گالے چپکے چپکے نیچے گر رہے تھے۔

"کیا تم نے کبھی سوچا ہے ـــــ" اس نے ساتھیوں کو مخاطب کیا ـــــ "کہ ہم جو چھ سو سال تک ایک دیوار کے سائے میں رہے۔ ایک مٹی سے ہماری اور اس کی تخلیق ہوئی تھی۔ اس کے اور ہمارے گھروالوں کو اپنی مشترکہ کلچر پر ناز تھا۔ چار سال بعد جب اس وقت کھیم نے مجھے دیکھا تو ایک لحظے کے لئے ذرا جھجکی پھر "ہلو کشوری" کہتی ہوئی آگے چلی گئی۔

"اور میں نے سوچا ٹھیک ہے۔ میں نے اور اس نے اسی دن کے لئے ساری تیاریاں کی تھیں۔ وہ مہیلا ودیالہ کی لڑکی ہے۔ کانگریس میں یقین رکھتی ہے میرے بابا بڑے نیشنلسٹ بنتے تھے۔ لیکن میں کٹر مسلم لیگی ہوں۔ یوم پاکستان کے جلسے کے موقع پر کھیم کے ساتھیوں نے ہمارے اوپر اینٹیں پھینکی تھیں۔ اکھنڈ ہندوستان دیک کے دلوں میں ہمارے رفقاء نے ان کے پنڈال پر

پکٹنگ کی تھی۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے۔ یہی ٹھیک ہے اور بھائی زندگی نہ ہوئی شانتا رام کی فلم ہو گئی۔ بنو اچھے پڑوسی کر دو بھائی چارہ نہیں کرتے بھائی چارہ میاں زبردستی ہے تمہاری۔ یہی ایک مثال میری اور کھیم کی دیکھ لو۔ جنم جنم کے پڑوسی تھے۔ اور کیا دوستی اور یگانگت کا عالم تھا۔ پر تھے ہم ان کے لئے ملچھ۔ ان کے چوکے کے قریب نہ پھٹک سکتے تھے اور ہماری اماں کا یہ سلسلہ تھا کہ اگر ہندو کی دکان سے کوئی چیز آئی تو۔ اسے فوراً حوض میں غوطہ دے کر پاک کیا جاتا تھا۔ ایک قوم اسطرح بنتی ہے۔ تقسیم کا مطالبہ ہند کی ساری تاریخ کا نہایت فطری اور نہایت منطقی نتیجہ ہے۔"

کشوری چپ ہو گئی۔

آتش دان میں آگ، جہک رہی تھی۔ کسی نے آہستہ سے ایک انگارہ الاؤ میں سے نکال کر باہر گرا دیا۔ یہاں وہ چند لمحوں تک سلگتا رہا۔ اور پھر بجھ گیا۔ نیچے سڑک پر کوئی بھکاری اکارڈین پر "موجوں کے اوپر" کا والز بجاتا ہوا گزر رہا تھا۔

آج میں کنول کماری کے ہاں چاء پر گئی تھی۔" ارملا نے کہا کہ ہمارے "مجلس میلے" کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔

"کنول کماری؟ — کشوری نے کچھ یاد کرتے ہوئے سوال کیا ———

"ہاں ہمارے نئے فرسٹ سیکرٹری کی بیوی۔ اور میں نے سوچا کہ قابل عورت ہے۔ اس سے میلے کے موقع پر ہندوستانی آرٹ پر لگے ہاتھوں ایک تقریر

بھی کروالیں۔ پام دت وغیرہ سب ہی ہوں گے۔ بچاری نے وعدہ کرلیا۔"

"سویراست ہو گیا ــــ سویراست ہو گیا ــــ دوسرے کمرے میں "میلے" کے پروگرام کی ریہرسل کرتے ہوئے چند لڑکیوں نے ہریندر ناتھ چٹوپادھیا کا کورس یک لخت زور زور سے الاپنا شروع کر دیا۔

"میں نے بہت کوشش کر کے سوچا کہ میں جب یونیورسٹی میں اور لوگوں سے ملتی ہوں ــــ اٹلی کے لوگ ہیں۔ برازیل کے۔ عراق اور مصر کے۔ میں ان سے اس طرح کیوں نہیں باتیں کرنا چاہتی۔ پھر ہمارے پروفیسر ہیں۔ "ہم عصر فنون کی انجمن" کے اراکین ہیں۔ انہوں نے ہمارے مسائل پر بڑی کتابیں لکھی ہیں۔ ہمارا بڑا دقیق مطالعہ کیا ہے۔ اخباروں میں وہ ہمارے متعلق اڈیٹوریل لکھتے ہیں۔ دارالعوام میں اور ریڈیو پر بحثیں کرتے ہیں ــــ" کشوری نے کہا۔

"چاروں اور آگ لگی ــــ دل میں بھوک پیاس جگی۔ یگ یگ ہم گاتے

ہم گاتے ہم گاتے ــــ" لڑکیاں چلّا رہی تھیں۔

"میرا جی چاہتا ہے۔ میں تم سے یہ سب باتیں کہوں۔ تم کو یہ سارا قصہ یہ سارا گورکھ دھندا سمجھاؤں ــــ" اس نے ساتھیوں کو اداس آواز میں مخاطب کیا ــــ" تاکہ تم لوگ مجھے بھی ایک اور مضحکہ خیز کردار نہ سمجھو اور اس سارے پس منظر اس ساری کہانی کو اس فاصلے سے دیکھ کر اپنی نئی راہ کا تعین کرو۔

سڑک پر کیرل گانے والوں کی ٹولیاں گزرنی شروع ہو گئی تھیں ــــ

"کرسمس کا زمانہ بھی اختتام پر ہے۔" روزماری نے اظہارِ خیال کیا۔

ہاں ——— جون پور میں میرے محلے میں بچے کچھے سوگوار جہلم کے تعزیوں کے سائے میں بیٹھے اپنی قسمت کو رو رہے ہوں گے۔ نہیں شاید محرم کا زمانہ گزر گیا ہوگا۔ پرانے کیلنڈر بے کار ہو چکے ہیں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں ——— کشوری نے دل میں کہا۔

"برف باری شدید ہوگئی ہے ——— پھر بہار آئے گی۔ کیا سارے زمانے، سارے موسم اتنے بے مصرف ہیں ———؟"

روزماری نے اپنے آپ سے بات کی۔

"نہیں ———" کشوری نے کہا۔

"پگ پگ ہم گاتے چلیں ———" لڑکیوں کی آواز نے تکرار کی۔

چار باغ اسٹیشن پر کھیم کو آخری بار خدا حافظ کہنے کے بعد اب کشوری کو دم لینے کی فرصت بھی کہاں تھی۔ پہلے مسلم اسکول پھر چاند باغ پھر کیننگ کالج۔ زمانہ کہاں سے کہاں نکل گیا تھا۔ ہر ہنگامے میں کشوری موجود۔ مباحثے ہو رہے ہیں ——— بیڈمنٹن ٹورنامنٹ ہیں۔ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی

مصروفیات ہیں۔ اِدھر ہندو اسٹوڈنٹس فیڈریشن تھا۔ مہابھائی طالبات کے جلسے جلوس تھے۔ جن میں کبھی کبھی کھیم رائے زادہ دور سے نظر آجاتی۔ طالب علموں کی دنیا اچھی خاصی سیاسی اکھاڑہ بن گئی تھی۔ گھر پر واپس جاؤ تو وہی سیاست کل کی تشویش۔ مستقبل کی فکر۔ ملک کی تقسیم ہو گی۔ نہیں ہو گی۔ ہو گی۔ نہیں ہو گی۔

یونیورسٹی میں لیکچررز کے دوران میں پروفیسروں سے جھڑپ ہو جاتی۔ سطحی طور پر ابھی دوستی اور بھائی چارہ قائم تھا۔ لیکن آخری "شوڈاؤن" کے لئے اسٹیج بالکل تیار تھا۔

ڈاکٹر آفتاب رائے ابھی تک ہسٹری ڈیپارٹمنٹ میں موجود تھے ایک روز ایک لیکچر کے دوران میں ان سے بھی کچھ تکرار ہو گئی۔ ایک ہندو طالب علم نے کہا" آزادی کا مطلب ڈاکٹر صاحب مکمل سوراج ہے۔ ہند کی دھرتی کو پھر سے شدھ کرنا ہے۔ ساری ان قوموں کے اثر سے آزاد ہونا ہے۔ جنہوں نے باہر سے آکر حملہ کیا۔ یہی تلک جی نے کہا تھا جی ہاں"

اس پریڈ میں شیواجی کے اوپر گفتگو ہو رہی تھی۔ لہذا خانہ جنگی ناگزیر تھی۔ شام تک ساری یونیورسٹی میں خبر پھیل گئی کہ ڈاکٹر آفتاب رائے کی کلاس میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔

اگلی صبح کشوری پورا جلوس بنا کر ڈاکٹر صاحب آفتاب رائے کے دفتر

میں پہنچی۔

"ڈاکٹر صاحب ——" اس نے نہایت رُعب داب سے کہنا شروع کیا۔

"کل جس طرح آپ نے حضرت اورنگ زیب علیہ الرحمۃ کے متعلق اظہار خیال کیا۔ اس کے لئے معافی مانگیے۔ ورنہ ہم اسٹرائیک کر دیں گے بلکہ کر دیا ہے۔ اسٹرائیک ہم نے —— آپ نے ہماری دل آزاری کی ہے۔"

آفتاب رائے اچنبھے سے کشوری کو دیکھتے رہے —— ارے تو تو ڈپٹی جعفر عباس کی بٹیا ہے نا۔ اری بانڈلی سی —— وہ بے ساختہ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن کشوری کے تیور دیکھ کر رک گئے۔ اور پہلو بدل کر سنجیدگی سے کھنکارے

"بات یہ ہے مس عباس ——" انہوں نے کہنا شروع کیا "سیاست اور حصولِ تعلیم کے درمیان جو ——"

"اجی ڈاکٹر صاحب بس اب رہنے دیجئے ——" کسی نے آگے بڑھ کر کہا —— "ہم خوب اس ڈھونگ کو جانتے ہیں۔ معافی مانگیے قبلہ ——"

"ڈاکٹر صاحب" میں نے کہا "بنارس کیوں نہیں واپس چلے جاتے ——؟"

دوسری آواز آئی۔

"دیکھو میاں صاحب زادے ——" آفتاب رائے نے رسان سے کہا

"معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاریخ کے متعلق میرے چند نظریئے اور اصول ہیں۔ میں اور تمہاری دل آزاری کروں گا؟ کیا باتیں کرتے ہو ——؟"

"ہم کچھ نہیں جانتے ـــــ" انہوں نے شور مچایا ـــــ "معافی مانگیے۔ ورنہ ہم کل اورنگ زیب ڈے منائیں گے۔"

"ضرور مناؤ ـــــ" آفتاب رائے نے یک لخت بے حد اُکتا کر کہا۔

"اور مکمل اسٹرائیک کریں گے۔"

"ضرور کرو ـــــ خدا مبارک کرے ـــــ" انہوں نے آہستہ سے کہا اور چق اٹھا کر اندر چلے گئے۔

"کٹر مہاسبھائی نکلا یہ بھی ـــــ" لڑکوں اور لڑکیوں نے آپس میں کہا اور برساتی سے باہر نکل آئے۔

وہ رات آفتاب رائے نے شدید بے چینی سے کاٹی۔ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ مسلمان طالب علموں کو اچھے نمبر نہ ملتے۔ ہندوؤں کو لیوں ہی پاس کر دیا جاتا۔ ہوسٹلوں میں ہندو مسلمان اکٹھے رہتے تھے۔ لیکن جس ہوسٹل میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس پر سبز پرچم لہرانے لگا تھا۔ اس کے جواب میں عین مغرب کی نماز کے وقت ہندو اکثریت والے ہوسٹلوں میں لاؤڈ سپیکر نصب کر کے گراموفون بجایا جاتا۔

چند روز بعد آفتاب رائے کے سر میں جانے کیا سمائی کہ استعفا دیدیا۔ اور غائب ہو گئے۔ سارے میں ڈھنڈیا مچ گئی۔ مگر ڈاکٹر آفتاب رائے اب ملتے ہی نہ تھے لوگوں نے کہا ایک چول ہمیشہ سے ذرا ڈھیلی تھی۔ سنیاس لے

لیا ہوگا۔ پھر تقسیم کا زمانہ آیا۔ اب کسے ہوش تھا کہ آفتاب رائے کی فکر کرتا۔ اپنی ہی جانوں کے لالے پڑے تھے۔

ملک آزاد ہو گیا۔ کُسم دنی کی شادی ہو گئی۔ کشوری کے گھر والے آدھے پاکستان چلے گئے۔ اس کے بابا اب بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ آنکھوں سے کم سجھائی دیتا تھا۔ ایک ٹانگ پر فالج کا اثر تھا۔ دن بھر وہ جون پور میں اپنے گھر کی بیٹھک میں پلنگڑی پر لیٹے نادِ علیؑ کا ورد کیا کرتے۔ اور پولیس ہر سمے ان کو تنگ کرتی۔ آپ کے بیٹے کا پاکستان سے آپ کے پاس کب خط آیا تھا؟ آپ نے کراچی میں کتنی جائیداد خرید لی ہے؟ آپ خود کب جا رہے ہیں ـــــ؟ اصغر عباس ان کا اکلوتا لڑکا تھا اور اب پاکستانی فوج میں میجر ہے۔ نہ وہ ان کو خط لکھ سکتا اور اگر مر جائیں تو مرتے وقت وہ اس کو دیکھ بھی نہ سکتے تھے۔ وہ تو کشوری کے لئے مصر تھا کہ وہ اس کے پاس راولپنڈی چلی آئے۔ لیکن ڈپٹی صاحب ہی نہ راضی ہوئے کہ انت سمے بٹیا کو بھی نظروں سے اوجھل کر دیں۔ وہی کشوری تھی جس کی ایسے بسم اللہ کے گنبد میں پرورش ہوئی تھی اور اب وقت نے ایسا پلٹا کھایا تھا کہ وہ جون پور کے گھر کی چار دیواری سے باہر مدتوں سے لکھنؤ کے کیلاش ہوسٹل میں رہ رہی تھی۔ ایم اے میں پڑھتی تھی اور اس فکر میں تھی کہ بس ایم اے کرتے ہی پاکستان پہنچ جائے گی اور ملازمت کرے گی۔ ارے صاحب آزاد قوم کی لڑکیوں کے لئے ہزاروں باعزت راہیں کھلی ہیں۔ کالج میں پڑھائے۔

نیشنل گارڈ میں بھرتی ہو جایئے۔ اخباروں میں مضمون لکھئے۔ ریڈیو پر بولیے۔ کوئی ایک چیز ہے جی ہاں۔ وہ دن گن رہی تھی کہ کب دو سال ختم ہوں اور کب وہ پاکستان اُڑ پھو ہو۔ لیکن پھر بابا کی محبت آڑے آجاتی۔ دکھیا اتنے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ آنکھوں سے سجھائی بھی نہیں دیتا۔ کہتے ہیں بٹیا کچھ دن اور باپ کا ساتھ دے دو۔ جب میں مر جاؤں تو جہاں چاہنا جانا۔ چاہے پاکستان چاہے انگلینڈ اور امریکہ ——

میں اب تمہیں کسی بات سے روکتا تھوڑا ہی ہوں۔ بٹیا تم بھی چلی گئیں تو میں کیا کروں گا۔ محرم میں میرے لئے سوز خوانی کون کرے گا۔ میرے لئے رکی کا حلوہ کون بنائے گا۔ پُورت پہلے ہی مجھے چھوڑ کر چلا دیا۔ پھر ان کو جلدی جلدی پُونچھتے ہوئے یا علی کہہ کر دیوار کی طرف کروٹ کر لیتے۔

بڑی بھاوج ان سے کہتیں —— دیوانے ہوئے ہو۔ بٹیا کو کب تلک اپنے پاس بٹھلاؤ گے۔ آج نہ گئی کل گئی۔ جانا تو اسے ہے ہی ایک دن۔ یہاں اس کے لئے اب کون سے رشتے رکھے ہیں۔ سارے اچھے اچھے لڑکے ایک ایک پاکستان چلے گئے اور وہاں ان کی شادیاں بھی دھبا دھب ہو رہی ہیں۔ یہ اصغر عباس کے پاس پہنچ جاتی تو وہ اسے بھی کوئی ڈھنگ کا لڑکا دیکھ کر ٹھکانے لگا دیتا —— بڑی بھاوج کی اس شدید حقیقت پسندی سے کشوری کو اور زیادہ کوفت ہوتی۔ اور یہ ایک واقعہ تھا کہ اس نے پاکستان

کے مسئلے پر اس زاویے سے کبھی غور ہی نہ کیا تھا۔ ویسے وہ سوچتی کہ بابا ہندوستان میں ایسا کیا کھونٹا گاڑ کر بیٹھے ہیں، اچھے خاصے ہوائی جہاز سے چلے چلتے مگر نہیں۔ اور یہ جو بابا کی قوم پرستی تھی۔ سارا جون پور عمر بھر سے واقف ہے کہ بابا کتنے بڑے نیشنلسٹ تھے۔ تب بھی پولیس پیچھا نہیں چھوڑتی۔ سارے حکام اور پولیس والے جن کے سنگ جنم بھر کا ساتھ کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ وہی اب جان کے لاگو ہیں۔ کل ہی عجائب سنگھ چوہان نے جو عمر بھر سے روزانہ بابا کے پاس بیٹھ کر شعروشاعری کرتا تھا۔ دوبارہ دوڑ بھجوا کر خانہ تلاشی لی۔ گویا ہم نے بندوقوں اور ہتھیاروں کا پورا میگزین دفن کر رکھا ہے۔ پھر اسے بابا پر ترس آجاتا۔ بےچارے بابا۔

اب ڈپٹی صاحب کی مالی حالت بھی اب ابتر ہوتی جارہی تھی۔ اصغر عباس پاکستان سے روپیہ نہ بھیج سکتا تھا جو تھوڑی بہت زمینیں تھیں۔ ان پر ہندو کاشتکار قابض ہو گئے تھے اور دیوانی کی عدالت میں ڈپٹی صاحب کی فریاد کی شنوائی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چھوٹی اماں مرحومہ کی مقدمہ بازیوں کے بعد جو کچھ زیور بچ رہا تھا۔ وہ بڑی بھاوج نے سمیٹ کر بہو کے حوالے کر دیا تھا۔ جو وہ پاکستان لے گئی تھی۔ باقی روپیہ ڈپٹی صاحب کی پنشن کا کشوری کی تعلیم پر خرچ ہو رہا تھا۔ ان کے علاج کے لئے کہاں سے آتا اور فالج تو بوا ایسا روگ ہے کہ جان لے کر پیچھا چھوڑتا ہے۔ چنانچہ نوبت یہ

پہنچی کہ چپکے چپکے بڑی بھاوج نے چھتو بیگم کے ذریعے چند ایک گہنے جو بچ رہے تھے فروخت کروا دیئے۔ ویسے اس میں ایسی شرم کی تو کوئی وجہ نہ تھی۔ وہ جو مثل ہے کہ مرگ انبوہ جشنے وارد، اَن گنت مسلمان گھرانے ایسے تھے جو اپنے گہنے اور چاندی کے برتن بیچ بیچ کر گزارہ کر رہے تھے۔ لیکن بڑی بھاوج ناک والی آدمی تھیں اور ابھی ان کے بھلے دنوں کو گزرے عرصہ ہی کتنا ہوا تھا۔ کشوری کو جب یہ معلوم ہوا تو اس کی مٹی گم ہو گئی۔ اس نے پاکستان جانے کا خیال ترک کر دیا اور سرگرمی سے ملازمت کی تلاش میں جٹ گئی۔

لیکن ایک جگہ تو اس سے صاف صاف کہہ دیا گیا۔ صاف بات یہ ہے کہ جگہ تو خالی ہے۔ لیکن ہم شرنارتھی۔ لڑکیوں کو ترجیح دے رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ آپ کسی خانگی مجبوری کی وجہ سے ہندوستان ٹھہری ہوئی ہیں۔ پہلا موقع ملتے ہی آپ بھی پاکستان چلی جایئے گا۔

اور وہ گھوم پھر کر جون پور لوٹ آئی۔ بڑی بھاوج نے اس سے کہا—

وہ تمہاری گڑیاں کھیم کے ماموں آفتاب بہادر تھے۔ ان کو ہی جا کر پکڑو۔ وہ تو بڑے با اثر آدمی ہیں۔ اور بڑے شریف۔ ضرور مدد کریں گے اور کشوری کو خیال آیا۔ کس طرح وہ جلوس بنا کر ان کے پاس پہنچی تھیں اور ان کو سخت سست سنائی تھیں۔ اس کے اگلے ہفتے ہی وہ غائب ہو گئے تھے۔

آفتاب رائے —— اب پتہ نہیں وہ کہاں ہوں گے۔ اڑتی سی خبر

تھی کہ بمبئی میں حکومت کے خلاف تقریر کرنے کے جرم میں ان کو احمد آباد جیل میں بند کر دیا گیا تھا۔ جیل سے چھوٹے تو کچھ اور گڑبڑ ہوئی اور اب شاید وہ روس میں ہیں اور سمرقند ریڈیو سے اردو میں خبریں سناتے ہیں۔ دوسری روایت تھی کہ نہیں صاحب ڈاکٹر آفتاب رائے تو آج کل پنڈت جی کی بالکل مونچھ کا بال بنے ہوئے ہیں اور ان کو ری پبلک لمبی ڈورا میں ہند کا سفیر بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب تو عرصے سے گویا مستقل ''زیرِ زمین'' تھے۔

بے چارے آفتاب رائے۔

آج چاند رات تھی۔ محلے میں نقارہ رکھا جا چکا تھا۔ مجلسیں اب بھی ہوتیں لیکن وہ چہل پہل، رونق اور بے فکری تو کب کی خواب و خیال ہو چکی تھی۔ ڈیوڑھی میں ڈولیاں اُترنی شروع ہوئیں اور بیبیاں آ آ کر امام باڑے کے دالان میں بیٹھنے لگیں۔ کشوری بے دلی سے دہلیز پر اپنی پرانی جگہ پر بیٹھی رہی۔ دالان کی چاندنی جس پر تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی تھی۔ اب چھدری چھدری نظر آتی تھی۔ سارے خاندانوں میں سے دو دو تین تین افراد تو ضروری ہجرت کر گئے تھے۔ بڑی بھاوج بہت مشکل سے پاؤں گھسیٹتی اِدھر اُدھر چل رہی تھیں۔ اب وہ اللے تللے کہاں۔ ساری مہریاں اور کہاریں اور پاسنیں ایک ایک کر کے چھوڑ کر چل دیں۔ بس لنگڑی ممولہ رہ گئی تھی۔ سو اس کی آواز کو بھی پالا مار گیا تھا۔ لیکن چھمّو بیگم کو آتا دیکھ کر وہ پھر للکاری ——— آگئیں چھمّو بیگم۔

آڈر جم جم آڈر۔

چھمو بیگم چپ چاپ آکر منبر کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ زیارت پڑھ کے تعزیوں کو جھک کر سلام کرنے اور کنپٹیوں پر انگلیاں چٹخا کر جناب علی اصغر کے جارجٹ کے گہوارے کی بلائیں لینے کے بعد انہوں نے علموں کو مخاطب کر کے آہستہ سے کہا۔

"مولا یہ میرا آخری محرم ہے۔ ارے اب تمہاری مجلسیں یہاں کیسے کروں گی۔ اور یہ کہہ کر انہوں نے زور و شور سے رونا شروع کر دیا۔

بوا مدن اپنی پرانی "دشمناگی" فراموش کر کے سرک کر ان کے قریب آ بیٹھیں اور بولیں ——— لو بوا غم حسینؑ کو یاد کرو۔ اپنا غم ہلکا ہو جائے گا ——— مولا تو ہر جگہ ہیں۔ کیا پاکستان میں نہیں ہیں ———؟"

"ہاں ——— ہاں ———" باقی بیبیوں نے آنسو خشک کرتے ہوئے تائید کی

"مولا کیا پاکستان میں نہیں ——— تم وہاں مولا کی مجلسیں قائم کرنا۔"

"لو بوا ——— ہم بھی چل دیئے پاکستان ———" جب محفل کی رقت ذرا کم ہوئی اور چھمو بیگم چاند رات کا بیان ختم کر چکیں تو بوا مدن نے اپنا اناؤنسمنٹ بھی کر ڈالا۔

"سچ کہو بوا مدن ———" بڑی بھاوج نے گوٹا پھانکتے ہوئے پوچھا ———

"ہاں بیوی! چل دیئے ہم بھی ———" بوا مدن نے اعتراف کیا۔

"کیسے چل دیں ———؟ بڑی بھاوج کو ایک طرح سے تو رشک ہی آیا۔

اچھے خاصے لوگ نکلتے جا رہے ہیں۔ سب نصیحتوں سے الگ۔ سارے دلدر دور ہو جاویں گے وہاں پہنچ کر ـــــــ

"بس بڑی بھاوج لڑکا نہیں مانتا ـــــــ وہاں سے ہر بار خط میں لکھتا ہے کہ بس اماں آجاؤ ـــــــ کوئی نگوڑی جگہ سکھر ہے۔ وہاں اس نے راشن کی ڈپو کھول لی ہے۔"

"اچھا ـــــــ شکر ہے۔ مولا سب کی بگڑی بنائیں ـــــــ" بڑی بھاوج نے کہا

"عاشورہ کی شب لیلے ـــــــ" بوا مدن نے جو حسبِ معمول عینک گھر بھول آئی تھیں۔ دوبارہ غلط مرثیہ شروع کیا۔ لیکن سب پر ایسی اُداسی اور اُکتاہٹ طاری تھی کہ کسی نے ان کی تصحیح کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ بگن نے آواز ملائی ـــــــ چراغوں کی روشنی دالان میں مدھم سا اجالا بکھیرتی رہی۔ آنگن کا گیس کا ہنڈہ پیلا پڑتا جا رہا تھا۔

اس تاریکی میں کشوری سیاہ دوپٹے سے سر ڈھانپے اپنی جگہ پر اکڑوں بیٹھی سامنے رات کے آسمان کو دیکھتی رہی۔

کنواری کماری جبین نے مہمانوں کے جانے کے بعد نشست کے کمرے میں

واپس آکر دریچوں کے پردے گرائے اور چار کا سامان میزوں پر سے سمیٹنے لگی۔ مدراسی آیا ایک ہی تھی۔ جسے وہ ہمراہ لیتی آئی تھی اور پردیس میں ملازموں کے فقدان پر اس نے ملٹری اڈوائزر بریگیڈیر کھنہ کی بیوی سے بڑا رقت انگیز تبادلۂ خیالات کیا تھا۔ گھر کی صفائی اور بچے کی دیکھ بھال کے بعد جو اسے وقت ملتا۔ اس میں وہ رائل اکیڈیمی آف ڈریمیٹک جاکر کوریگرافی سیکھتی تھی۔ سر لارنس اور لیڈی اولیویر، اینتھنی ایسکویتھ کرسٹفر فرائی ان سب سے اس کی بڑی گہری دوستی تھی۔ یہ سب مل کر گھنٹوں فن اداکاری، جدید آرٹ اور ہندوستانی بیلے پر گفتگو کرتے۔ جین کے پاس ان سب بکھیڑوں کا وقت نہ تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے رات کے تو وہ دفتر سے نپٹ کر انڈیا ہاؤس سے لوٹتا اور وہ تو صاف بات کہتا تھا کہ بھائی میں انٹلکچوئیل وِنٹلکچوئیل نہیں ہوں۔ سیدھا سادا آدمی ہوں۔ اور جس ڈھرے پر برس ہا برس سے چل رہا ہوں۔ وہی میرے لئے ٹھیک ہے۔

انگریز کے زمانے میں وہ ملک کے طبقاتی قطب مینار کی سب سے اونچی سیڑھی پر پہنچ چکا تھا۔ اور اب تو وہ اتنا اونچا تھا کہ بالکل بادلوں پر براجمان تھا۔ انگریز کے زمانے میں ڈریس سوٹ پہنتا۔ اب سفید چوڑی دار پاجامے اور سیاہ شیروانی میں ملبوس سفارتی ضیافتوں میں کیا ہلکی پھلکی نپی تلی باتیں کرتا۔ خود کنول کیا کم معرکے کی خاتون تھی۔ جہاں جاتی محفل جگمگا اٹھتی۔ واہ واہ۔ مثلاً آج ہی کی پارٹی میں اس نے کوریا کی کرشنا مینن والی تجویز کے سلسلے میں

"نیو اسٹیٹس مین اینڈ نیشن" کے ایڈیٹر کنگزلے مارٹن اور جدید شاعر لوئی مک نیس دونوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ سب کو قائل ہونا پڑا۔ چاند باغ کے اچھے پرانے سنہرے دنوں میں تو خیر وہ یوں ہی جھپسٹ میں انٹلکچوئیل بن گئی تھی کہ یونیورسٹی کی زندگی کا یہ ایک لازمی جزو تھا۔ پر یہ تو ان دنوں اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک روز وہ ان ساری جید بین الاقوامی گلیمرس ہستیوں سے یوں بھائی چارے کے ساتھ ملا کرے گی۔ جیسے وہ سب گاجر مولی ہیں۔

"سویرا است ہو گیا ـــــ سویرا است ہو گیا ـــــ" اور گنگناتی ہوئی اندر آئی۔

"کنول دیدی ـــــ جاتے جاتے مجھے خیال آیا کہ ایک بار آپ کو پھر یاد دلا دوں کہ آپ کو مجلس میلے میں آنا ہے ـــــ"

"ہاں ہاں ضرور ـــــ" کنول نے جواب دیا "اور وہ میری کتاب تو دیتی جاؤ"

"ارے ہائے ـــــ" ارملا نے رک کر کہا۔ "وہ تو ڈاکٹر آفتاب رائے نے مجھ سے لے لی۔ وہ مجھے انڈیا آفس لائبریری سے نکلتے ہوئے مل گئے۔ چھین کر لے گئے، کہنے لگے کل دے دیں گے ـــــ"

ڈاکٹر ـــــ آفتاب ـــــ رائے ـــــ؟" کنول نے دہرایا۔

"ہاں کنول دیدی ـــــ" ارملا نے اسی طرح لاپرواہی سے بات جاری رکھی۔ "وہ تو دن بھر یوں ہی لائبریریوں میں گھسے رہتے ہیں۔ آج کل ایک

نئی کتاب لکھ رہے ہیں۔ آج مہینوں کے بعد اتفاقاً نظر آ گئے۔ ان کا کوئی بھروسہ تھوڑا ہی ہے۔ لیکن کل وہ براڈکاسٹنگ ہاؤس آ رہے ہیں۔ وہاں کتاب مجھے لوٹا دیں گے۔ اچھا گڈ نائٹ کنول دیدی ــــ"

"گڈ نائٹ ارملا ــــ"

"ارے ہاں" اس نے جاتے جاتے رک کر پھر کہا۔

"کل آپ رائل کمانڈ پرفورمنس میں جا رہی ہیں۔ آپ کو تو سر رالف رچرڈسن نے خود ہی بلایا ہوگا"

"ارے نہیں بھئی ــــ" کنول نے پیشانی پر سے بال ہٹا کر تھکی ہوئی آواز میں کہا "یہ بھی اس کا ایک پوز ہے" ایک دل جلی مسز اچاریہ نے جو سیکنڈ سیکرٹری کی بیوی تھی۔ مارے حسد کے اپنی ایک سہیلی سے کہا تھا "جانتی ہے کہ بکھرے ہوئے بال اس کے اوپر زیادہ اچھے لگتے ہیں" "چڑیل کہیں کی" نہیں بھائی ارملا۔ مجھے یہ پارٹیوں اور سفارتی مصروفیتوں کا سلسلہ بعض دفعہ بالکل بور کر دیتا ہے۔ اس سے کہیں پناہ نہیں ــــ"

"اچھا گڈ نائٹ ــــ"

"اچھی طرح سوؤ ــــ" کنول نے کہا۔ ارملا ہریندر ناتھ چٹو پادھیا کا کوئی اس گنگناتی ہوئی نچلی منزل میں اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

انڈیا آفس لائبریری سے نکلتے ہوئے مل گئے ــــ ڈاکٹر آفتاب رائے

مل گئے — اجی ان کا کوئی بھروسہ تھوڑا ہی ہے۔ چھین کرلے گئے — کہنے لگے کل دے دیں گے وہ صوفے پر بیٹھ گئی — واسنتھی — " اس نے چلا کر آواز دی — یہ کھانا گرم پر لگا دو۔ " اس نے ٹیلی ویژن کھولا۔ بکواس ہے۔ بند کر دیا۔ کیا پتہ اس کے لکھنؤ ریڈیو پر ارچنا بنرجی گاتا ہو یا ہوڑی چھوڑ نا — نکر کر لو جوئے ہو — اور چاند باغ کی خاموش سڑکوں پر سے لڑکیاں لینٹرن سروس کے بعد لوٹتی ہوں گی۔

میں نے کیا کیا تھا — ؟ اس نے سوال کیا۔ کچھ نہیں میں اب دس سال سے کنول کماری جین ہوں۔ یہ تو کچھ بات نہ بنی۔ بات کس طرح بنتی ہے۔ کیوں نہیں بنتی — سال گزرتے جا رہے ہیں۔ میں کنول کماری جس نے یہ سب دیکھا۔ ایک روز یوں ہی ختم ہو جاؤں گی۔ اور تب بہت اچھا ہوگا۔

ایسا نہ ہونا چاہیے تھا۔ پر ہو گیا۔

کنول ڈارلنگ — ثروت نے انگلی اٹھا کر سخت صوفیانہ انداز میں اس سے کہا تھا — جن ڈھونڈھا تن پائیاں گہرے پانی پیٹھ —

— میں برہن ڈوبت ڈری رہی کنارے بیٹھ — ؟ کنول نے سوچا تھا۔ کنارا ابھی تو نہیں ہے —

پانے کے کیا معنی ہیں — ؟ کیا ملتا ہے ؟

باہر اندھیرا تھا اور سردی اور بیکراں خاموشی۔ میں زندہ ہوں۔

ارے بھئی آفتاب بہادر ـــــ اس نے غصے سے سر ہلا کر دل میں سوال کیا ـــــ تم کیوں چلے گئے تھے۔ میں نے تمہارا کچھ لگاڑا تھوڑا ہی تھا۔ تم اپنے آپ میں مگن رہتے میں وہیں کہیں تمہاری زندگی کے تانے بانے کے کسی کونے میں آ کر چپکی بیٹھ جاتی اور بس تمہارے لئے پوریاں بنایا کرتی۔ تم اسی طرح رہتے۔ اس میں تمہاری شکست نہ تھی۔ تمہاری تکمیل تھی میاں آفتاب بہادر ـــــ؟

نیچے کیرل گانے والے ہیتھ کی اور نکل گئے تھے۔

آفتاب بہادر ـــــ اب جو میں ہوں اور جو تم ہو ـــــ کیا یہی بہت ٹھیک ہے؟

بہت زمانہ ہوا اس نے چاند باغ میں ایک لڑکی کو دیکھ کر جو آفتاب رائے کو بہت پہلے سے جانتی تھی۔ سوچا تھا کہ جنے آفتاب کی بیوی کیسی ہو گی اور ایک بار خود اس کے لئے اس کی دوست ثروت نے ایک لبڑے سے آدمی کی تصویر سامنے لا کر کہا تھا۔ آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر دیکھ ـــــ!! اور کمال یہ کہ عین مین اسی طرح کا آدمی جین نکلا ـــــ) آفتاب کی بیوی۔ یہ فقرہ کتنا عجیب لگتا تھا۔ کوئی ہو گی چڑیل۔ آخر میں یہ سب کر کری کھاتے ہیں۔ ثروت نے اضافہ کیا تھا۔ خوب صورت تو ضرور ہو گی۔ اور ٹینس کھیلتی ہو گی۔ جس کا آفتاب کو اتنا شوق ہے۔ لیکن فراٹے بھرنے اور ہوا میں اڑنے والی لڑکیاں تو وہ سخت ناپسند کرتا تھا۔ جس کو وہ پسند کرے گا۔

وہ تو بہت ہی عمدہ ہو گی۔ بس بالکل مجموعہ خوبی۔ چندے آفتاب چندے مہتاب۔
جی ہاں اور مجھ میں کیا برائی تھی؟ اس نے ملے کرنا چاہا۔ کہ آفتاب کا رویہ تھا کہ
اس پر کنول کماری پر یہ وحی اُترنی چاہیئے تھی کہ یہ مہاپرش، آسمان پر سے خاص
اس کے لئے بھیجا گیا ہے۔ لیکن یہ اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اس کنول
کماری سے یا روزانہ آ کر ملے یا کبھی نہ ملے۔ اس سے طبلہ اور جے جے دنتی سنے۔
پوریاں بنا کر کھائے۔ پھر ایک روز نہ اطمینان سے آگے چلا جائے۔ اور یہ کنول
کماری بعد میں بیٹھ کر جھک مارتی رہے اور کیا وہ اس کے پیچھے پیچھے ڈنڈا لے
کر دوڑتی کہ اے میاں آفتاب بہادر ایک بات سنتے جاؤ۔ ان دنوں ثروت
نے ایک اور لطیفہ ایجاد کیا۔ چیپل کے بعد ایک روز اس نے "گینگ" کی
باقی افراد سے کہا:

بھئی نومبر ۲۹۔ اے پی سین روڈ پر آج کل یہ سلسلہ ہے۔ اگر بھائی
آفتاب چاء پیتے پیتے رک کے۔ دفعتاً کنول رانی سے کہتے ہیں۔ بھئی کنول
مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے تو ہماری کنول رانی کو فوراً یہ دھیان ہوتا ہے
کہ اب شاید یہ پرپوز کرنے والا ہے۔ پر وہ بات محض اتنی ہوتی ہے کہ بھئی
ذرا مہی پال کو فون کر دو کہ آم خریدتا لائے یا اسی قسم کی کوئی اور شدید اینٹی
کلائمکس۔ ثروت اس قدر کمینی تھی۔ وہ سارے مسخرے پن کے قصے یاد کر کے
اب اس نے دل میں ہنسنا چاہا۔ لیکن سردی بڑھتی گئی اور بیکراں تنہائی

اور زندگی کے ازلی اور ابدی پچھتاووں کا ویرانہ۔ آفتاب بھیا اور تم کو پتہ ہے کہ میری کیسی جلاوطنی کی زندگی ہے ذہنی طمانیت اور مکمل مسرت کی دنیا جو ہو سکتی تھی اس سے دیس نکالا جو مجھے ملا ہے۔ اسے بھی اتنا عرصہ ہو گیا کہ اب میں اپنے متعلق کچھ سوچ بھی نہیں سکتی۔ اب میرے سامنے صرف لاٹل کمانڈر فورینس اور ہملین کے صبح کے ناشتے کی دیکھ بھال ہے اور یہ ہر دلعزیزی جو مجھ پر ٹھونس دی گئی ہے۔ لیکن تم بھلا کیا سوچو گے (اس نے کہا تھا۔ ارے تم لوگ اسی کو پسند کرتی ہو جو ایک مخصوص معیار پر پورا اترتا ہے۔) کیا الٹی منطق تھی۔ یعنی چت بھی تمہاری پٹ بھی۔ آخر اس ساری لفاظی، اس ذہنی اور تصوراتی گورکھ دھندے سے تمہارا مطلب کیا نکلا۔ واہ واہ چغد آدمی کہیں کے۔

ثروت نے اس کی شادی کے بعد ایک اور سہیلی کے سامنے نہایت جامع و مانع اختصار کے ساتھ اس طرح تشریح کر دی تھی کہ قصّہ کو یوں مختصر کرتی ہوں۔ اے عزیزہ۔ کنول کی ٹریجڈی یہ ہوئی کہ ساری عمر تو کوئی ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ سب میں مین میکھ نکالتی رہیں اور مارے بد دماغی کے کسی کو خاطر ہی میں نہ لاویں۔ اور جن بزرگوار کو آپ نے نہایت صدق دل سے پسند فرمایا۔ وہ خود ہی ہری جھنڈی دکھا گئے ——— بس اب کیا ہے پیاری بہن۔ جب آنکھ کھلی تو گاڑی نکل چکی تھی۔ پٹری چمک رہی تھی۔ جی ہاں۔

اری ثروت ——— کروک کہیں کی۔

مگر سوال یہ تھا کہ ہر چیز کے متعلق اس مذاق اور خوش دلی کا رویہ کہاں تک گھسیٹا جا سکتا تھا لیکن اس کے علاوہ تم اور کر بھی کیا سکتی ہو۔ ثروت نے کہا تھا، زندگی نہ ہوئی اسٹیفن لیکاک کا مسخرہ پن ہو گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تمہارا مذاق کہاں ہوتا ہے اور سنجیدگی کہاں سے شروع ہوتی ہے دیا ـــــ

(VICE VERSA

ڈاکٹر صاحب تو دن بھر لائبریریوں میں گھسے رہتے ہیں اور آج کل ایک اور کتاب لکھ رہے ہیں۔ اسے ارملا نے مطلع کیا ہے۔ اب وہ کیا رہا ہے... ڈاکٹر ڈی۔ پی مکرجی کی طرح مہاگرو بن چکا ہے۔ غالباً اس نے شادی کر لی ہو گی۔ یہاں پہنچ کر اسے عجیب و غریب اور انتہائی شدید تکلیف کا احساس ہوا ـــــ وہ کون ہو گی ـــــ کیسی ہو گی ـــــ آفتاب کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی کیسی نظر آتی ہو گی۔ آفتاب اس سے کہاں ملا ہوگا، یا اب تک وہ کنفرمڈ بیچلر بن چکا ہو گا۔ (بہت سے لوگوں کے لئے اس میں بھی سخت گلیمر تھا) کیا بات ہے صاحب ـــــ ان ساری حماقتوں سے علیحدہ اور برگزیدہ ـــــ اپنی نہایت شخصی دنیا، اپنے مشغلے، کتابیں، موسیقی، بیتھوون کے کونسرٹ، چند دلچسپ سے گنے چنے دوست۔ اتوار کے روز دن بھر کسی کنٹری کلب کی لاؤنج میں بیٹھے ٹائمز پڑھ رہے ہیں۔ تیسرے پہر کو رائیڈنگ کو چلے گئے اور ٹینس کھیلا۔ اِدھر اُدھر خواتین سے بھی مل لئے۔

لیکن لڑکیوں کو ہمیشہ بڑے ترحم کی نگاہوں سے دیکھا۔ گویا —— بیچاریاں ——! اور اپنا بے نیازی اور سرپرستی کا رویہ قائم رکھا۔ دیر سب ثروت نے ایک واقعہ ارشاد کیا تھا، اچھا بھئی آفتاب بہادر —— تم کتابیں لکھتے رہو۔ میں ان پر تھرڈ پروگرام میں ریویو کروں گی۔ راستہ اسی طرح طے ہونا ہے گا۔

صبح ہوئی شام ہوئی —— زندگی تمام ہوئی —— زندگی تمام ہوئی —— نچلی منزل میں ارملا ہریندر ناتھ چٹوپادھیا کا وہ کم بخت کورس آہستہ آہستہ الاپے جا رہی تھی۔

وہ دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ کہرہ اب کم ہو گیا تھا اور آسمان کا رنگ قرمزی تھا۔ جس کے مقابل میں کیتھولک چرچ کے ہولناک گنبد کا سلہٹ نحوست سے اپنی جگہ پر قائم تھا۔

اونی لبادوں میں ملفوف۔ مشرقی یورپ سے بھاگتے ہوئے لوگ، بھاری بھاری قدم اٹھاتے ہاتھوں میں شمعیں لئے مڈنائٹ ماس کے لئے گرجا کی سمت بڑھ رہے تھے۔

صبح ہوئی شام ہوئی
زندگی تمام ہوئی
زندگی تمام ہوئی
زندگی تمام ہوئی

"جب مجھے ملازمت نہ ملی تو میں نے سمندر پار کے وظیفوں کے لئے ہاتھ پاؤں مارے۔ برٹش کونسل نے مجھے یہاں آنے کا وظیفہ دے دیا اور جب میں نے روانہ ہونے کی خبر بابا کو سنائی تو وہ بالکل چُپ ہو گئے اور اس کے بعد ایک لفظ منہ سے نہ بولے اور ابھی میں راستے ہی میں تھی۔ جب مجھے اطلاع ملی کہ بابا مر گئے "کشوری نے مدھم آواز میں بات ختم کی اور چمٹے سے آتش دان میں لکڑی کے کندوں کو ٹھیک کرنے میں منہمک ہو گئی۔

"آج مڈنائیٹ ماس منانے جائیں گے۔" روزماری نے اپنے برُش اور کینوس سمیٹتے ہوئے کہا "چلو ہم بروملٹن اور ریٹری چلیں۔ جہاں ایک شام میں نے پیلے بالوں اور اُداس چہرے والی ایک ہینگرین پناہ گزین لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ سر پر سیاہ اسکارف باندھے تسبیح ہاتھ میں لئے گھٹنوں سے ساکت اور منجمد بیٹھی تھی۔ اس کا یہ انداز کتنا قابل رحم تھا۔ میں نے قربان گاہ کے ستونوں کے پیچھے چھپ کر اس کی تصویر بنائی۔ میں نے اس تصویر کا نام "آزادی سے فرار" رکھا تھا۔ لیکن جب اسے نمائش میں رکھا جانے لگا تو ہم عصر فنون کی انجمن نے اس کا نام بدل کر "آزادی کا شکرانہ" کر دیا ——— آج کی رات میں وہاں امید اور ناامیدی کی ان کرب ناک کیفیتوں کے چند اور اسکیچ تیار کروں گی۔

کتنی کیفیتیں ہیں۔ جنہیں الفاظ اور رنگوں کے روپ میں ڈھالا ہی نہیں جا سکتا۔ جن کے اظہار سے ان کی بے وقتی توہین ہوتی ہے۔ کشوری نے سوچا (یہی بات اپنے لئے کتنی بار کنول نے محسوس کی تھی۔ لیکن کوئی کچھ نہ جانتا تھا) کیسی بے لبی ہے کہ سب اپنے اپنے دماغوں میں محصور رہے جانے پر مجبور ہیں۔

"تم کو معلوم ہے کہ میں یک لخت اس طرح تم سب سے یہ باتیں کیوں کہ رہی ہوں" کشوری نے کہا۔

"سنتے ہیں کہ جب مدتوں کے بچھڑے ہوئے دو جنے دوبارہ ملتے ہیں تو ساری پرانی یگانگت یاد آجاتی ہے۔ پرانے دوستوں سے مل کر بھی کو خوشی ہوتی ہے۔ اس نے بات آہستہ آہستہ جاری رکھی ——" لیکن پرانے دشمن" سے مل کر مجھے کیسی مسرت ہوئی —— آج صبح مجھے بالکل اتفاقیہ کیسم وتی پھر سے نظر آگئی۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ وہ یہاں پر ہے۔ وہ ایک دکان سے نکل رہی تھی" ارے کھیم کھیا ——" میں چلا کر اس کی اور دوڑی۔ اس نے مجھے واقعی نہ پہچانا۔ وہ بہت موٹی ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ غالباً اس کا شوہر تھا" کھیما رانی تم ہی کانا ہیں۔ چنہیں؟" میں نے بالکل بے ساختگی سے اپنی زبان میں اس سے کہا۔ جو اس کی اور میری مادری زبان تھی —— "ہلو کشوری ——" اس نے مطلق کسی گرم جوشی کا اظہار نہ کیا۔ "نمستے"۔ اس کے شوہر نے مسکرا کر

سلام کیا۔" یہ میرے پتی ہیں۔" کھیم نے اسی سے سرد مہری کے انداز میں بات کی۔ "نمستے بھائی صاحب ——" میں نے بے حد خوش دلی سے کہا۔

"تم تو پاکستانی ہو۔ تمہیں نمستے نہ کہنا چاہیئے۔" کھیم نے بڑی طنز کے ساتھ کہا۔ میرے اوپر جانو کسی نے برف ڈال دی۔ میں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر دوسری اور دیکھا۔ اس کے شوہر نے جو بہت سمجھدار معلوم ہوتا تھا۔ فوراً بات سنبھالی اور کہنے لگا ——" اچھا بہن جی —— اس سمے تو ہم بہت جلدی میں ہیں آپ کسی روز ہمارے یہاں آیئے۔ ہم یہیں ساؤتھ کینزنگٹن میں رہتے ہیں" —— "اچھا۔ ضرور آؤں گی۔ بائی بائی کھیم ——" میں نے اسے یہ بھی نہ بتانا چاہا کہ میں پاکستانی نہیں ہوں۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔

میں اس وقت کوئی رقت انگیز تقریر نہ کروں گی۔ میں یہ نہ کہوں گی کہ رفیقو انسان نے خودکشی کر لی۔ پرانی اقدار تباہ ہو گئیں۔ اپنے پرائے ہو گئے۔ یہ سب پچھلے پانچ سال سے دہراتے دہراتے تم لوگ اکتا نہیں گئے۔ یہ جو کچھ ہوا یہی ہونا تھا۔ اور آپ تھیں کہ ایک نہایت رومینٹک تصور لئے بیٹھی تھیں۔ گویا زندگی نہ ہوئی شانتارام کی فلم ہو گئی۔ میں نے اور کھیم نے جو کچھ کیا وہ ان سب باتوں کا نہایت منطقی نتیجہ تھا اور باقی تم جو کہنا چاہتی ہو وہ جھک مارتی ہو سمجھیں۔

"اس انداز سے میں نے اپنے آپ کو سمجھانا چاہا۔ لیکن چلو رہ زاری۔

اب ہم نئی تصویریں بنائیں گے۔" اس نے روزِ ماری کو مخاطب کیا۔ "تم اگر ہمارے اسکیچ تیار کرو تو تمہاری آرٹ کونسل اور ہم عصر فنون کی انجمن ان کے لئے کون سے عنوان منتخب کرے گی؟۔

"ہم اپنے بدقسمت ملک کی وہ نوجوان نسل ہیں۔ جو یورپ کی جنگ اور اپنے سیاسی انتشار کے زمانے میں پروان چڑھی۔ اپنی خانہ جنگی کے دور نے اس کی ذہنی تربیت کی اور اب اس ہولناک "سرد لڑائی" کے محاذ پر اسے اپنے اور دنیا کے مستقبل کا تعین کرنا ہے۔

"ہم لوگ یونیورسٹی کی اونچی اونچی ڈگریاں حاصل کر رہے ہیں۔ تہذیبی میلے اور تہوار منعقد کرنے میں مصروف ہیں۔ ہے مارکیٹ کے مخصوص تھیٹروں میں اپنے بیلے کے پروگرام پیش کرتے ہیں۔ امن کانفرنسوں اور یوتھ فیسٹولز میں شامل ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں سے واپس لوٹ کر کیا ہوگا۔

"تم نے کبھی خیال کیا ہے کہ میں کہاں جاؤں گی ——— ؟ میرا گھر اب کہاں ہے ——— ؟ کیا میں اور میری طرح دوسرے ہندوستانی مسلمان ایسے مضحکہ خیز اور قابلِ رحم کردار بننے کے مستحق تھے ——— ؟"

وہ خاموش ہو گئی۔ سب لوگ چپ چاپ بیٹھے آگ کے شعلے کو دیکھتے رہے۔ سڑک کے دوسری طرف ایک مکان میں "وائٹ کرسمس" گائی جا رہی تھی۔

"شاید میں نے تمہیں بتایا تھا ——" ارملا نے نیچی آواز میں کہا۔

"کہ آج دفتر سے واپسی میں ڈاکٹر آفتاب رائے مل گئے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب میں نے سنا تھا کہ آپ ری پبلک لمپی ڈورا میں سفیر ہیں۔ تم نے غلط سنا تھا۔ انہوں نے رسان سے مسکرا کر کہا۔ میں نے گھبرا کر ان کو دیکھا تو کیا آپ بھی —— میں نے سوال کرنا چاہا —— ہاں —— میں بھی —— اتنا کہہ کر وہ جلدی سے خدا حافظ کہتے ہوئے مجمع میں غائب ہو گئے اور دوسرے لمحے اسٹیشن کی مہیب انڈر گراونڈ نے اُن کو نگل گیا۔ ان کے ہاتھوں میں کتابیں تھیں اور وہ کسی سے بات کرنا نہ چاہتے تھے —— نجانے وہ کہاں رہتے ہیں۔ کیا کرتے۔ اتنا عرصہ انہوں نے کیسے گزرا۔ وطن واپس جانے کی اجازت انہیں کب ملے گی —— کیا ہو گا ——"

دور گرجاؤں کے گھنٹے بجنے شروع ہو گئے تھے۔ وہ سب باہر سڑک پر آ گئے۔

ہماری غلطیوں کا سایہ ہمارے آگے آگے چلتا ہے۔ اور صاف ہمارے تعاقب میں ہے۔ انہوں نے سوچا —— لیکن ہم رات کی وادی کو تیزی سے عبور کر رہے ہیں۔

ہمارے چاروں طرف یہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کا ہجوم جو اپنی قسمتوں کو روتے ہیں۔ لیکن دیکھو۔ یہ راستے۔ یہ جھیلیں۔ یہ باغات۔ ہمارے منتظر ہیں۔

سناٹے میں صرف موت کے قدموں کی چاپ تھی۔ اجنبی موت جو یک لخت ہمارے سامنے آ گئی۔ لیکن ہم اسے چھوڑ کر ہنستے ہوئے آگے نکل جائیں گے۔ سنو۔ ہمارے پاس یقین ہے اور وہ کامل اعتماد جسے اس محبت نے تخلیق کیا ہے۔ جو غداری کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ یہ غداری محض یاسمین کے پھولوں کی آرزو ہے۔ وہ گرجا کی سمت بڑھتے رہے۔

سامنے راستے کی نیم تاریکی میں ایک الزبتھن وضع کے مکان میں دھندلی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ یہ ہندوستانی ہائی کمیشن کے فرسٹ سیکرٹری کا مکان تھا۔ اس کے آگے پھر اندھیرا تھا۔ یہ کون دیوانی روح اپنی تنہائی سے گھبرا کر باہر نکل آئی ہے۔ انہوں نے سوال کیا۔ اس سے کہو یہ یہاں کیوں کھڑی ہے۔ ان لیمپوں کے نیچے گھاس کے ان راستوں پر۔ زمین کے ان پھولوں کے درمیان اسے کچھ نہ ملے گا۔ سنسان سیڑھیوں پر یہ کون لوگ نظر آ رہے ہیں۔ ان سے کہو کہ واپس جائیں اور صبح کا انتظار کریں۔

ہمارے اور ان کے خیالوں کے بُھتنے ——؟

لیکن پھر گھنٹوں نے پکارا —— آؤ —— آج کی رات تمہارے وجود کے گناہ کا کفارہ ادا کیا جائے گا۔ میں تمہارے خدا کی آواز ہوں —— اور تمہاری ہر تباہی میں شریک ہوں۔ اور ہر موت کا محافظ ہوں اور اب پادریوں اور راہبوں کا جلوس آگے بڑھا۔ جو اپنے اپنے ملکوں سے جلاوطن

ہو کر اس سے خداوند تعالیٰ کی تقدیس کرتے تھے اور گرجا کی مرمریں سیڑھیوں پر سیاہ اسکارف سے سر ڈھانپے عورتیں اور بوڑھے اور جوان بڑے صبر سے بیٹھے تسبیحیں پھیر رہے تھے اور ہولی کمیونین کے منتظر تھے۔

ایک راستہ یہیں پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔ پھر ایک دیوار ہے۔ لیکن ریشمی پردوں میں سے چھن چھن کر روشنی اِدھر بھی پہنچ رہی ہے۔ گو بہت سے سیاہ پوش مریض دیوانے، فلسفی اور بیمار سیاست دان راستہ روکے کھڑے ہیں۔

ہمیں تمہاری موت عزیز ہے۔ کیوں کہ تمہاری موت میں نجات ہے۔ اس کے گھنٹوں نے کہا۔

ہماری ماں۔ چٹانوں کی بہن۔ سمندر کے روشن ستارے ہمیں چپکا بیٹھنا سکھا۔ یہ ہمارا عہد نامہ ہے۔

یہ ہمارا پرانا عہد نامہ تھا۔ ان کے خیالات تباہ ہو چکے۔ اب ان کے پاس کیا باقی رہا ہے —— آرگن کے مدھم اور لرزہ خیز سُروں کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے وہ سب آہستہ آہستہ اپنے راستے پر واپس آئے۔

کنول رانی —— کسی نے اندھیرے میں یک لخت پہچان کر چپکے سے پکارا۔ یہاں آجاؤ۔

اور ہمارے ساتھ کھڑے ہو کر اس خوب صورت روشنی کو دیکھو جو آسمان

پر پھیل رہی ہے۔ اب کسی پچھتاوے، کسی افسوس کا وقت نہیں ہے۔

"پرانے عہد نامے منسوخ ہوئے" کشوری نے آہستہ سے دہرایا۔

ڈالن والا

ہر تیسرے دن سہ پہر کے وقت ایک بے حد دُبلا پتلا بوڑھا، گھسے اور جگہ جگہ سے چمکتے ہوئے سیاہ کوٹ پتلون میں ملبوس سیاہ گول ٹوپی اوڑھے پتلی کمانی والی چھوٹے چھوٹے شیشوں کی عینک لگائے، ہاتھ میں چھڑی لئے برساتی میں داخل ہوتا۔ اور چھڑی کو آہستہ آہستہ بجری پر کھٹکھٹاتا فقیرا باہر آکر باجی کو آواز دیتا ــــ ''بٹیا، چلیے۔ سائمن صاحب آگئے۔'' بوڑھا باہر ہی سے باغ کی سڑک کا چکر کاٹ کر پہلو کے برآمدے میں پہنچتا۔ ایک کونے میں جاکر اور جیب میں سے میلا سا رومال نکال کر جھکتا۔ پھر آہستہ سے پکارتا ــــ ''ریشم ــــ ریشم ــــ ریشم!'' ریشم دوڑتی ہوئی آتی۔ باجی بڑے آرٹسٹک انداز میں سرود کندھے سے لگائے برآمدے میں نمودار ہوتیں۔ تخت پر بیٹھ کر سرود کا سُرخ بناری

غلاف اتارتیں اور سبق شروع ہو جاتا۔

بارش کے بعد جب باغ بھیگا بھیگا سا ہوتا اور ایک انوکھی سی تازگی اور خوشبو فضا میں تیرتی تو بوڑھے کو واپس جاتے وقت گھاس پر گری کوئی منقوبانی مل جاتی۔ وہ اُسے اُٹھا کر جیب میں رکھ لیتا۔ ریشم اُس کے پیچھے پیچھے چلتی۔ اکثر ریشم شکار کی تلاش میں جھاڑیوں کے اندر غائب ہو جاتی یا کسی درخت پر چڑھ جاتی تو بوڑھا سر اُٹھا کر ایک لمحے کے لئے درخت کی ہلتی ہوئی شاخ کو دیکھتا اور پھر سر جھکا کر پھاٹک سے باہر چلا جاتا۔ دوسرے روز سہ پہر کو پھر اسی طرح بجری پر چھڑی کھٹکھٹانے کی آواز آتی۔

جب سے پڑوس میں مسز جوگ مایا چیٹرجی کلکتے سے آکر رہی تھیں اس محلے کے باسیوں کو بڑا سخت احساس ہوا تھا، کہ ان کی زندگیوں میں کلچر کی بہت کمی ہے۔ موسیقی کی حد تک ان سب کے "گول کمروں" میں ایک ایک گراموفون رکھا تھا۔ (ابھی ریڈیو عام نہیں ہوئے تھے۔ فریجڈیر (Status symbol) نہیں بنا تھا۔ ٹیپ ریکارڈ ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ اور سماجی رتبے کی علامات ابھی صرف کوٹھی، کار اور بیرے پر مشتمل تھیں) لیکن جب مسز جوگ مایا چیٹرجی کے وہاں صبح شام ہارمونیم کی آوازیں بلند ہونے لگیں تو سروے آف انڈیا کے اعلیٰ افسر کی بیوی مسز گوسوامی نے محکمہ جنگلات کے اعلیٰ افسر کی بیوی مسز فاروقی سے کہا ـــــ "بہن جی، ہم لوگ تو بہت ہی بیک ورڈ رہ گئے۔ ان بنگالیوں

کو دیکھیے، ہر چیز میں آ گے آ گے ــــــ"

"اور میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ ان لوگوں میں جب تک لڑکی گانا بجانا نہ سیکھ لے اس کا بیاہ نہیں ہوتا" ملٹری اکیڈیمی کے اعلیٰ افسر کی بیوی مسز جسونت سنگھ نے اظہار خیال کیا۔

"ہم مسلمانوں میں تو گانا بجانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مگر آج کل زمانہ دوسرا ہے۔ میں نے تو اُن سے کہہ دیا ہے۔ میں اپنی حمیدہ کو ہارمونیم ضرور سکھواؤں گی" مسز فاروقی نے جواب دیا۔

اور اس طرح رفتہ رفتہ ڈالن والا میں آرٹ اور کلچر کی ہوا چل پڑی۔ ڈاکٹر سنہا کی لڑکی نے ناچ سیکھنا بھی شروع کر دیا۔ ہفتے میں تین بار ایک منحنی سے ڈانس ماسٹر اس کے گھر آتے۔ انگلیوں میں سلگتی ہوئی بیڑی تھامے منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالتے جو "جی جی کت تا توم ترنگ تکا توم تن تن" وغیرہ الفاظ پر مشتمل ہوتیں۔ وہ طبلہ بجاتے رہتے۔ اور راوشا سنہا کے پاؤں، توڑوں کی چک پھیریاں لیتے لیتے گھنگھروں کی چوٹ سے زخمی ہو جاتے۔

پڑوس کے ایک نوجوان رئیس سردار امرجیت سنگھ نے وائلن پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا تھا۔ سردار امرجیت سنگھ کے والد نے ڈچ ایسٹ انڈیا کے دارالسلطنت بٹاویا میں جواب جمہوریہ انڈونیشیا کا دارالسلطنت جکارتہ کہلاتا ہے، بزنس کر کے بہت دولت جمع کی تھی۔ سردار امرجیت سنگھ ایک شوقین

مزاج رئیس تھے۔ جب وہ گراموفون پر بڑے انہاک سے بجو کا ریکارڈ ۔۔۔

خزاں نے آکے چمن کو اجاڑ دینا ہے

مری کھلی ہوئی کلیوں کو لوٹ لینا ہے

بار بار نہ بجاتے تو دریچے میں کھڑے ہو کر وائلن کے تاروں پر اسی انہاک سے گز رگڑا کرتے۔ ورنہ پھیری والے بزازوں سے رنگ برنگی چھینٹوں کی جارجٹ اپنے صافوں کے لئے خریدتے رہتے۔ اور یہ بڑھیا بڑھیا صافے باندھ کر اور ڈاڑھی پر سیاہ پٹی نفاست سے چڑھا کر مسز فلک ناز مرزا ید خاں سے ملاقات کے لئے چلے جاتے۔ اور اپنی زوجہ سردارنی بی بی مہندر کور سے کہہ جاتے کہ وائلن سیکھنے جا رہے ہیں۔

اسی زمانے میں باجی کو سرود کا شوق پیدا ہوا۔

وہ موسم سرما گوناگوں واقعات سے پُر گزرا تھا۔ سب سے پہلے تو ریشم کی ٹانگ زخمی ہوئی۔ پھر موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانے والی مس زہرہ ڈربی نے آکر پریڈ گراؤنڈ پر اپنے جھنڈے گاڑے، ڈائنا بکیٹ ملکۂ عالم حسینۂ لندن کہلائی۔ ڈاکٹر مس زبیدہ صدیقی کو رات کے دو بجے گدھے کی جسامت کا کتا نظر آیا۔ مسٹر پیٹر رابرٹ سردار خاں ہماری زندگیوں سے غائب ہو گئے نرگس نے خودکشی کر لی۔ اور نیّرا کی بھاوج گوریا چڑیا بن گئی۔

چونکہ یہ سب نہایت اہم واقعات تھے لہٰذا میں سلسلے وار ان کا تذکرہ

کرتی ہوں۔

میری بہت خوبصورت اور پیاری ریحانہ باجی نے جو میری چچازاد بہن تھیں، اسی سال بی اے پاس کیا تھا۔ اور وہ علی گڈھ سے چند ماہ کیلئے ہمارے یہاں آئی ہوئی تھیں۔ ایک سہانی صبح باجی سامنے کے برآمدے میں کھڑی ڈاکٹر ہون کی بیوی سے باتوں میں مصروف تھیں کہ اچانک برساتی کی بجری پر ہلکی سی کھٹ کھٹ ہوئی اور ایک نحیف اور منحنی سے بوڑھے نے بڑی دھیمی اور ملائم آواز میں کہا ——— "میں نے سنا ہے یہاں کوئی لیڈی سرود سیکھنا چاہتی ہیں۔"

باجی کے سوالات پر انھوں نے صرف اتنا کہا کہ ان کی ماہانہ فیس پانچ روپے ہے۔ اور وہ ہفتے میں تین بار ایک گھنٹہ سبق دیں گے۔ وہ کرزن روڈ پر پادری اسکارٹ کی خالی کوٹھی کے شاگرد پیشے میں رہتے ہیں۔ ان کے بیوی بچے سب مر چکے ہیں۔ اور برسوں سے اُن کا ذریعۂ معاش سرود ہے جس کے ذریعے وہ آٹھ دس روپے مہینہ کما لیتے ہیں۔

"لیکن اس خوابیدہ شہر میں سرود سیکھنے والے ہی کتنے ہوں گے؟ باجی نے پوچھا۔

انہوں نے اسی دھیمی آواز میں کہا۔ "کبھی کبھی دو ایک طالب علم مل جاتے ہیں۔" (اس کے علاوہ انہوں نے اپنے متعلق کچھ نہیں بتلایا) وہ

انتہائی خوددار انسان معلوم ہوتے تھے۔ ان کا نام سائمن تھا۔

پیر کے روز وہ ٹیوشن کے لئے آ گئے تھے۔ باجی پچھلے لان پر دھوپ میں بیٹھی تھیں "مسٹر سائمن کو یہیں بھیج دو۔" انہوں نے فقیرا سے کہا۔ باقی کی طرف جانے کے لئے فقیرا نے اُن کو اندر بلا لیا۔ اس روز بڑی سردی تھی اور میں اپنے کمرے میں بیٹھی کسی سٹریٹر میں محو تھی۔ میرے کمرے میں سے گزرتے ہوئے ذرا ٹھٹھک کر سائمن نے چاروں طرف دیکھا۔ آتش دان میں آگ سلگ رہی تھی۔ ایک لحظے کے لئے اُن کے قدم آتشدان کی سمت بڑھے۔ اور انہوں نے آگ کی طرف ہتھیلیاں پھیلائیں۔ مگر پھر جلدی سے فقیرا کے پیچھے پیچھے باہر چلے گئے۔

ریشم نے بہت جلد ان سے دوستی کر لی۔ یہ بڑے تعجب کی بات تھی۔ کیونکہ ریشم بے انتہا مغرور، اکل کھُری اور اپنے سیاہی حسن پر حد سے زیادہ نازاں تھی۔ اور بہت کم لوگوں کی خاطر میں لاتی تھی۔ زیادہ تر وہ اپنی ساٹن کے ریشمی جھالر غلاف والی ٹوکری کے گدیلوں پر آرام کرتی رہتی اور کھانے کے وقت بڑی مکاری سے آنکھیں بند کر کے میز کے نیچے بیٹھ جاتی "اس کی خاصیتیں ویمپ (Vamp) عورتوں کی ایسی ہیں۔" باجی کہتیں "عورت کی خاصیت بلّی کی ایسی ہوتی ہے۔ چمکارو تو پنجے نکال لے گی۔ بے رخی برتو، تو خوشامد شروع کر دے گی۔

"اور آدمی لوگوں کی خاصیت کیسی ہوتی ہے باجی؟" میں پوچھتی۔ باجی ہنسنے لگتیں اور کہتیں "یہ ابھی مجھے معلوم نہیں!"

باجی چہرے پر دل فریب اور مطمئن مسکراہٹ لئے باغ میں بیٹھی مظفر بھائی کے بے حد دل چسپ خط پڑھا کرتیں، جو ان کے نام ہر پانچویں دن بمبئی سے آتے تھے۔ جہاں مظفر بھائی انجنئرنگ پڑھ رہے تھے۔ مظفر بھائی میرے اور باجی کے چچازاد بھائی تھے اور باجی سے اُن کی شادی طے ہو چکی تھی۔ جتنی دیر وہ باغ میں بیٹھتیں غفور بیگم اُن کے نزدیک گھاس پر پاندان کھولے بیٹھی رہتیں۔ جب باجی اندر چلی جاتیں تو غفور بیگم شاگرد پیشے کی طرف جا کر فقیرا کی بھاوج سے باتیں کرنے لگتیں۔ یا پھر اپنی نماز کی چوکی پر آ بیٹھتیں۔

غفور بیگم باجی کی بے حد وفادار انّا تھیں۔ اُن کے شوہر نے جن کی علی گڈھ میں میرس روڈ کے چوراہے پر سائیکلوں کی دوکان تھی۔ پچھلے برس ایک نوجوان لڑکی سے نکاح کر لیا تھا۔ اور تب سے غفور بیگم اپنا زیادہ وقت نماز روزے میں گزارتی تھیں۔

سائمن کے آتے ہی ریشم دبے پاؤں چلتی ہوئی آ کر خرخر کرنے لگتی۔ اور وہ فوراً جیب سے رومال نکال کر اسے کچھ کھانے کو دیتے۔ شام کے وقت فقیرا جب اُن کے لئے چائے کی کشتی لے کر برآمدے میں جاتا تو وہ آدھی چائے طشتری میں ڈال کر فرش پر رکھ دیتے۔ اور ریشم فوراً طشتری چاٹ جاتی۔

اور فقیرا بڑبڑاتا "ہمارے ہاتھ سے نورانی صاحب دودھ پینے میں بھی نخرے کرتی ہیں۔

فقیرا ایک ہنس مکھ گڑھوالی نوجوان تھا۔ دو سال قبل وہ چیتھڑوں میں ملبوس نہر کی منڈیر پہ بیٹھا اون اور سلائیوں سے موزے بن رہا تھا جو پہاڑیوں کا عام دستور ہے تو سکھ نندن خانساماں نے اس سے پوچھا تھا — "نوکری کرے گا — ؟" اور اُس نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے جواب دیا تھا "مہینوں سے بھوکوں مر رہا ہوں، کیوں نہیں کروں گا — " تب سے وہ ہمارے ہاں "اوپر کا کام" کر رہا تھا۔ اور ایک روز اس نے اطلاع دی تھی کہ اُس کے دونوں بڑے بھائیوں کی مٹی ہو گئی ہے اور وہ اپنی بھاوج کو لینے گڑھوال جا رہا ہے۔ اور چند دنوں بعد اُس کی بھاوج جل دھرا پہاڑوں سے آکر شاگرد پیشے میں بس گئی تھی۔

جل دھرا ادھیڑ عمر کی ایک گوری چٹی عورت تھی جس کے ماتھے، ٹھوڑی اور کلائیوں پر نیلے رنگ کے نقش و نگار گدے ہوئے تھے۔ وہ ناک میں سونے کی لونگ اور بڑا سا بلاق اور کانوں کے بڑے بڑے سوراخوں میں لاکھ کے پھول پہنتی تھی۔ اور اُس کے گلے میں ملکہ وکٹوریہ کے روپیوں کی مالا بھی پڑی تھی۔ یہ تین گہنے اس کے تینوں شوہروں کی واحد جائداد تھی۔ اس کے دونوں متوفی شوہر مرتے دم تک یاتریوں کا سامان ڈھونڈتے رہے تھے۔ جل دھرا

بڑے میٹھے لہجے میں بات کرتی تھی اور ہر وقت سوئیٹر بنتی رہتی تھی۔ اُسے کنٹھ مالا کا مرض تھا۔ فقیرا اُس کے علاج معالجے کے لئے فکر مند رہتا تھا۔ اور اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ جل دھرا کی آمد پر باقی نوکروں کی بیویوں نے آپس میں چہ میگوئیاں کی تھیں ـــــ یہ پہاڑیوں کے یہاں کیسا بُرا رواج ہے ایک لگائی کے دو دو تین تین خاوند ـــــ اور جب جل دھرا کا تذکرہ دوپہر کو کھانے کی میز پہ ہوا تھا تو باجی نے فوراً ..... دروپدی کا حوالہ دیا تھا اور کہا تھا کہ پہاڑوں میں پولی اینڈری کا رواج مہابھارت کے زمانے سے چلا آتا ہے۔ اور ملک کے بہت سے حصّوں کا سماجی ارتقاء ایک خاص اسٹیج پہ پہنچ کر وہیں منجمد ہو چکا ہے۔ اور پہاڑی علاقے بھی انہی پسماندہ حصّوں میں سے ہیں باجی نے یہ بھی کہا کہ پولی اینڈری، جسے اردو میں "چند شوہری" کہتے ہیں، مادرانہ نظام کی یادگار ہے۔ اور معاشرے نے جب مادرانہ نظام سے پدری نظام کی طرف ترقی کی تو انسان بھی کثیر الازدواجی کی طرف چلا گیا۔ اور مادرانہ نظام سے بھی پہلے ہزاروں سال قبل، تین چار بھائیوں کے بجائے قبیلوں کے پورے پورے گروہ ایک ہی عورت کے ساتھ رہتے تھے۔ اور ویدوں میں ان قبائل کا ذکر موجود ہے ـــــ میں منہ کھولے یہ سب سنتی رہی۔ باجی بہت سخت قابل تھیں۔ بی اے میں اُنہیں فرسٹ ڈویژن ملا تھا۔ اور ساری علی گڑھ یونیورسٹی میں اوّل رہی تھیں۔

ایک روز میں اپنی چھوٹی سی سائیکل پر اپنی سہیلیوں کے وہاں جا رہی تھی۔ ریشم میرے پیچھے پیچھے بھاگتی آ رہی تھی۔ اس خیال سے کہ وہ سڑک پر آنے والی موٹروں سے کچل نہ جائے، میں سائیکل سے اتری۔ اُسے خوب ڈانٹ کر سڑک پر سے اُٹھایا اور باڑھ پر سے احاطے کے اندر پھینک دیا۔ اور پیڈل پر زور سے پاؤں مار کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

لیکن ریشم احاطے میں کودنے کی بجائے باڑھ کے اندر لگے ہوئے تیز نوکیلے کانٹوں والے تاروں میں الجھ گئی۔ اُس کی ایک ران بُری طرح زخمی ہوئی۔ وہ لہو لہان ہو گئی۔ اور اس نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ اور اسی طرح تار سے لٹکی چیختی اور کراہتی رہی۔ بہت دیر بعد جب فقیرا ادھر سے گزرا جو جھاڑیوں سے مرچیں اور ٹماٹر توڑنے اس طرف آیا تھا تو اس نے بڑی مشکل سے ریشم کو باڑھ میں سے نکالا اور اندر لے گیا۔

جب میں کملا اور رومِلا کے گھر سے لوٹی تو دیکھا کہ سب کے چہرے اُترے ہوئے ہیں۔ "تمہاری ریشم مر رہی ہے۔" باجی نے کہا —— اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے —— "کم بخت جانے کس طرح جا کر باڑھ کے تاروں میں اُلجھ گئی۔ جنے اس قدر احمق کیوں ہے۔ چڑیوں کی لالچ میں وہاں جا گھسی ہو گی۔ اب بری طرح چلا رہی ہے۔ ابھی ڈاکٹر صاحب مرہم پٹی کر کے گئے ہیں۔"

میرا دل دہل گیا۔ ریشم کی اس ناقابل برداشت تکلیف کی ذمہ دار میں تھی۔

اس کی تکلیف، اور ممکن موت کے صدمے کے ساتھ انتہائی شدید احساس جرم نے مجھے سراسیمہ کر دیا۔ اور میں جا کر گھر کے پچھواڑے گھنے درختوں میں چھپ گئی تاکہ دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو جاؤں۔ کچھ فاصلے پر کھٹ کھٹ بڑھیا کی شکل والی مسز وار بروک کے گھر میں سے وائرلیس کی آواز آ رہی تھی۔ دور شاگرد پیشے کے سامنے قیصرا کی بھاوج گھاس پر بیٹھی غفور بیگم سے باتیں کر رہی تھی۔ پچھلے برآمدے میں باجی اب مظفر بھائی کو خط لکھنے میں محو ہو چکی تھیں۔ باجی کی عادت تھی کہ دن بھر میں کوئی بھی خاص بات ہوتی تھی تو وہ فوراً مظفر بھائی کو طویل سا خط لکھتی تھیں۔ ریشم پٹیوں سے بندھی اُن کے نزدیک اپنی ٹوکری میں پڑی تھی۔ ساری دنیا پرسکون تھی۔ صرف میں ایک روپوش مجرم کی طرح اونچی اونچی گھاس میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ اب کیا کروں۔ آخر میں آہستہ آہستہ اپنے والد کے کمرے کی طرف گئی اور دریچے میں سے اندر جھانکا۔ والد آرام کرسی پر بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ میں اندر گئی اور کرسی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ "کیا بات ہے بی بی؟" میری سسکی کی آواز پر انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"ریشم کو ——— ریشم کو ہم نے باڑ میں پھینک دیا تھا۔"

"آپ نے پھینک دیا تھا؟"

"ہم ——— ہم کملا و ملا کے ہاں جانے کی جلدی میں تھے۔ وہ اتنا منع کرنے کے باوجود پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ ہم نے اُسے جلدی سے باغ کے اندر پھینک

دیا۔ اتنا کہہ کر میں نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔

رونے کے بعد دل ہلکا ہوا اور جرم کا تھوڑا سا پرائشچت بھی ہو گیا۔ مگر ریشم کی تکلیف کسی طرح کم نہ ہوئی۔ شام کو سائمن سبق سکھانے کے بعد دیر تک اس کے پاس بیٹھے اس سے باتیں کرتے رہے۔

ریشم کی روزانہ مرہم پٹی ہوتی تھی۔ اور ہفتے میں ایک دفعہ اسے "گھوڑا ہسپتال" بھیجا جاتا تھا۔ اُس کی ران پر سے اس کے گھنے اور لمبے سنہری بال مونڈ دیئے گئے تھے۔ اور زخم کی گہری سُرخ لکیریں دور تک کھینچی ہوئی تھیں۔ کافی دنوں کے بعد اُس کے زخم بھرے اور اُس نے لنگڑا کر چلنا شروع کر دیا۔ ایک مہینے کے وہ آہستہ آہستہ لنگڑاتی ہوئی سائمن کو پہنچانے پھاٹک تک گئی۔ اور جب فقیر بازار سے اس کے لئے چھچھڑے لے کر آیا تو وہ اسی طرح لنگڑاتی ہوئی کونے میں رکھے ہوئے اپنے برتن تک بھی جانے لگی۔

ایک روز صبح کے وقت مسٹر جارج بیکٹ باڑ پر نمودار ہوئے اور ذرا جھجکتے ہوئے انہوں نے مجھے اپنی طرف بلایا۔

"ریشم کی طبیعت اب کیسی ہے؟" انہوں نے دریافت کیا۔ "مجھے مسٹر سائمن نے بتایا تھا کہ وہ بہت زخمی ہو گئی تھی۔"

مسٹر جارج بیکٹ نے پہلی بار اس محلے میں کسی سے بات کی تھی۔ میں نے ریشم کی خیریت دریافت کرنے کے لئے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ اور وہ اپنے چار

خانہ کورٹ کے پھٹی ہوئی جیب میں انگوٹھے ٹھونس کر آگے چلے گئے۔

مسٹر جارج بیکٹ ایک بے حد فاقہ زدہ انگلو انڈین تھے۔ اور پلپلی صاحب کہلاتے تھے۔ وہ سڑک کے سرے پر ایک خستہ حال کائی آلود کاٹیج میں رہتے تھے۔ اور بالٹی اُٹھا کر صبح کو میونسپلٹی کے نل پر خود پانی بھرنے جایا کرتے تھے۔ اُن کی ایک لڑکی تھی جس کا نام ڈاٹنا تھا۔ وہ پریڈ گراؤنڈ پر ایک انگریزی سینما ہال میں ٹکٹ بیچتی تھی اور خوش رنگ فراک پہنے اکثر سامنے سے سائیکل پر گزرا کرتی تھی۔ اس کے پاس صرف چار فراک تھے جنہیں وہ دھو دھو کر اور بدل بدل کر پہنا کرتی تھی۔ اور مسز گوسوامی، مسز فاروقی اور مسز جسونت سنگھ کا کہنا تھا کہ "سینما ہال کی نوکری کے اُسے صرف پچیس روپلی ملتے ہیں اور کیسے ٹھاٹھ کے کپڑے پہنتی ہے۔ اسے گورے پیسے دیتے ہیں۔" لیکن گورے اگر اسے پیسے دیتے تھے۔ (یہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اُسے گورے کیوں پیسے دیتے تھے) تو اُس کا بوڑھا باپ نل پر پانی بھرنے کیوں جاتا تھا؟

یہ پنشن یافتہ متمول انگریزوں کا محلہ تھا جو پر فضا خوبصورت کوٹھیوں میں خاموشی سے رہتے تھے۔ اُن کے انتہائی نفاست سے سجے ہوئے کمروں اور برآمدوں میں لندن السٹرٹیڈ نیوز، ٹیٹلر، کنٹری لائف اور پنچ کے اخبار میزوں پر رکھے تھے۔ اور ٹائمز اور ڈیلی ٹیلی گراف کے پلندے سمندری راستے سے اُن کے نام آتے تھے۔ ان کی بیویاں روزانہ صبح کو اپنے اپنے "مارننگ

روم" میں بیٹھ کر بڑے اہتمام سے "ہوم" خط لکھتی تھیں۔ اور اُن کے "گول کمروں میں" اُن کے بیٹوں کی تصویریں روپہلے فریموں میں سجی تھیں جو مشرقی افریقہ اور جنوب مشرقی ایشیا میں سلطنتِ برطانیہ کے آفتاب کو مزید چمکانے میں مصروف تھے۔ یہ لوگ مدتوں سے اس ملک میں رہتے آرہے تھے۔ مگر "کوئی ہائے" اور "عبدل" "چھوٹا حاضری مانگتا" سے زیادہ الفاظ نہ جانتے تھے۔ یہ عزلت پسند انگریز دن بھر باغبانی یا برڈ واچنگ Bird Watching یا ٹکٹ جمع کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ یہ بڑے عجیب لوگ تھے۔ مسٹر ہارڈ کاسل تبتی زبان اور رسم و رواج کے ماہر تھے۔ مسٹر گرین آسام کے کھاسی قبائل پر اتھارٹی تھے۔ کرنل وائٹ ہیڈ جو شمالی مغربی سرحد کے معرکوں میں اپنی ایک ٹانگ کھو چکے تھے اور لکڑی کی ٹانگ لگاتے تھے۔ خوشحال خاں خٹک پر عبور رکھتے تھے۔ میجر شیلٹن اسٹیٹسمین میں شکار کے متعلق مضامین لکھا کرتے تھے۔ اور مسٹر مارچ بین کو شطرنج کا خبط تھا۔ مس ڈرنگ واٹر پلانچٹ پر روحیں بلاتی تھیں۔ اور مسز وار برک تصویریں بناتی تھیں۔

مسز وار برک ایک بریگیڈیر کی بیوہ تھیں۔ اور ہمارے پچھواڑے رہتی تھیں۔ ان کی بوڑھی پھوپس کنواری بہن بھی اُن کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان دونوں بہنوں کی شکلیں لمبی چونچ والے پرندوں کی ایسی تھیں۔ اور یہ دونوں اپنے طویل و عریض ڈرائنگ روم کے کسی کونے میں بیٹھی آبی رنگوں سے ہلکی

پھلکی تصویریں بنایا کرتی تھیں۔ وہ دونوں اتنی مختصر سی تھیں کہ پھول دار غلافوں سے ڈھکے ہوئے فرنیچر اور دوسرے ساز و سامان کے جنگل میں کھو جاتی تھیں اور پہلی نظر میں بڑی مشکل سے نظر آتی تھیں۔

ڈالن والا کی ایک کوٹھی میں "انگلش اسٹورز" تھا، جس کا مالک ایک پارسی تھا۔ محلے کی ساری انگریز اور نیٹو بیویاں یہاں آکر خریداری کرتی تھیں۔ اور اسکنڈل اور خبروں کا ایک دوسرے سے تبادلہ کرتی تھیں۔

اس خوش حال اور مطمئن انگریزی محلے کے واحد مفلس اور اینگلو انڈین باسی بجھی بجھی نیلی آنکھوں والے مسٹر جارج بیکٹ تھے۔ مگر وہ بڑی آن بان والے اینگلو انڈین تھے۔ اور خود کو پکا انگریز سمجھتے تھے۔ انگلستان کو "ہوم" کہتے تھے۔ اور چند سال اُدھر جب شہنشاہ جارج پنجم کے انتقال پر کولاگڈھ میں سلو مارچ پر بڑی بھاری پریڈ ہوئی تھی۔ اور گوروں کے بینڈ نے موت کا نغمہ بجایا تھا۔ تو مسٹر جارج بیکٹ بھی بازو پر سیاہ ماتمی پٹی باندھ کر کولاگڈھ گئے تھے۔ اور انگریزوں کے مجمع میں بیٹھے تھے۔ اور اُن کی لڑکی، ڈائنا روز نے اپنے سنہرے بالوں اور خوبصورت چہرے کو سیاہ ہیٹ اور سیاہ جالی سے چھپایا تھا۔ اور مسٹر بیکٹ سیاہ ماتمی پٹی بازو پر باندھے رہے تھے۔

لیکن بچے بہت بے رحم ہوتے ہیں۔ ڈالن والا کے سارے ہندوستانی بچے مسٹر جارج بیکٹ کو نہ صرف پلپلی صاحب کہتے تھے۔ بلکہ کلاّ اور ولاّ

کے بڑے بھائی سورن نے جو ایک پندرہ سالہ لڑکا تھا۔ اور ڈون پبلک اسکول میں پڑھتا تھا۔ مسٹر بیکٹ کی لڑکی ڈائنا کو چڑانے کی ایک اور ترکیب نکالی تھی۔

کملا اور وملا کے والد ایک بے حد دلچسپ اور خوش مزاج انسان تھے انہوں نے ایک بہت ہی انوکھا انگریزی ریکارڈ ۱۹۲۸ء میں انگلستان سے خریدا تھا۔ یہ ایک انتہائی بے تکا گیت تھا جس کا اینگلو انڈین اردو میں ترجمہ بھی ساتھ ساتھ اسی دھن میں گایا گیا تھا۔ نہ جانے کس منچلے انگریز نے اُسے تصنیف کیا تھا۔ یہ ریکارڈ اب سورن کے قبضے میں تھا۔ اور جب ڈائنا سائیکل پر اُن کے گھر کے سامنے سے گزرتی تو سورن گراموفون دریچے میں رکھ کر اُس کے بھونپو کا رخ سڑک کی طرف کر دیتا۔ اور سوئی ریکارڈ پر رکھ کر چھپ جاتا۔ اور مندرجہ ذیل بلند پایہ روح پرور گیت کی آواز بلند ہوتی۔

There was a rich merchant in London did say.
Who had his daughter an uncommon liking.
Her name it was Diana, sha was sixteers old,
And had a large fortune in silver and gold.

ایک بار ایک سوداگر شہر لندن میں تھا۔
جس کی ایک بیٹی نام ڈائنا اُس کا۔

نام اس ڈائنا سوسے برس کا عمر
جس کے پاس بہت کپڑا، چاندی اور سونا۔

As Diana was walking in the garden one day,
Her father came to her and thus did he say:
Go dress yourself up in gorge us array.
For you will have husband both gallant and gay-

ایک دن جب ڈائنا بگیچہ میں تھی۔
باپ آئی اور بولی بیٹی۔
جاؤ کپڑا پہنو اور ہو صفا
کیونکہ میں تیرے واسطے خاوند لایا۔

O father, dear father I've made up my mind,
To marry at present I don't feel inclind.
And all my large fortune every day adore.
If you let live me single a year or two more.

ارے رے مورا باپ تب بولی بیٹی۔
شادی کا ارادہ میں ناہیں کرتی۔
اگر ایک دو برس تکلیف ناہیں دیو۔

آآ ارے دولت میں بالکل چھوڑ دیوں۔

Then gave the father a gallant reply:
If you don't be this young man's bride,
I'll leave all your fortune to the fearest of things.
And you shan't reap the benefit of a single thing.

تب باپ بولا ارے بچہ بیٹی
اس شخص کی جورو تو ناہیں ہوتی۔
مال اور اسباب تیرا کر کے دیوں
اور ایک کچی دمڑی بھی تجھے میں ناہیں دیوں۔

As Wilikins was walking in the garden one day,
He found his dear Diana lying dead on the way.
A cup so fearful that lay by her side,
And Wilikins doth fainteth with a cry in his eye.

ایک دن ولی کن ہوا کھانے کو آگیا۔
ڈائنا کا مردہ ایک کونے میں پایا۔
ایک بادشاہ پیالہ اُس کے کمر پر پڑا۔
اور ایک چیٹھی جس میں لکھا:۔

"زہر پی کے مرا"

جیسے ہی ریکارڈ بجنا شروع ہوتا، بے چاری ڈائنا سائیکل کی رفتار تیز کر دیتی اور اپنے سنہرے بال جھٹک کر زناٹے سے آگے نکل جاتی۔

اس موسم سرما کا دوسرا اہم واقعہ پریڈ گراؤنڈز میں "دی گریٹ ایسٹ انڈین سرکس اینڈ کارنیول" کی آمد تھا۔ اس کے اشتہار لنگوروں اور مسخروں کے ذریعے لمبے جلوس سے بانٹے گئے تھے جن پر لکھا تھا:

بیسویں صدی کا حیرت ناک تماشہ
شیر دل حسینہ
مس زہرہ ڈربی
موت کے کنویں میں
آج شب کو

سب سے پہلے فقیرا سرکس دیکھ کر لوٹا۔ وہ اپنی بھاوج کو بھی کھیل دکھانے لے گیا تھا۔ اور صبح کو اس نے اطلاع دی —— "بیگم صاحب —— بڑی بٹیلی —— بی بی —— زنانی ڈیتھ آف ویل میں ایسے پھٹ پھٹی چلاتی ہے کہ بس کیا بتاؤں —— عورت ہے کہ شیر کی بچی —— ہرے رام —— ہرے رام ——"

دوسرے دن اسکول میں کملا اور وملا نے مجھے بتایا کہ مس زہرہ ڈربی

ایک نہایت سنسنی خیز خاتون ہے۔ اور وہ دونوں بھی اس کے دلبرانہ کمالات بچشم خود دیکھ کر آئی ہیں۔

چونکہ میں سرکسوں پر پہلے ہی سے عاشق تھی۔ لہٰذا جلد از جلد باجی کے ساتھ پریڈ گراؤنڈز پہنچی۔ وہاں تمبو کے باہر ایک اونچے چوبی پلیٹ فارم پر ایک موٹر سائیکل گھڑگھڑا رہی تھی۔ اور اُس کے پاس مس زہرہ ڈربی کرسی پر فروکش تھی۔ اُس نے نیلے رنگ کی چمک دار ساٹن کا اس قطع کا لباس پہن رکھا تھا جو مس نادیا نے ہنٹر والی فلم میں پہنا تھا۔ اُس نے چہرے پر بہت سا گلابی پاوڈر لگا رکھا تھا جو بجلی کی روشنی میں نیلا معلوم ہو رہا تھا۔ اور ہونٹ خوب گہرے سرخ رنگے تھے۔ اس کے برابر میں ایک بے حد خوفناک، بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی اسی طرح کی رنگ برنگی "برجیس" پہنے لمبے لمبے پٹے سجائے اور گلے میں بڑا سا سرخ رومال باندھے بیٹھا تھا۔ مس زہرہ ڈربی کے چہرے پر بڑی اکتاہٹ تھی۔ اور وہ بڑی بے لطفی سے سگریٹ کے کش لگا رہی تھی۔

اس کے بعد وہ دونوں موت کے کنویں میں داخل ہوئے جس کی تہ میں ایک موٹر سائیکل رکھی تھی۔ خوفناک آدمی موٹر سائیکل پر چڑھا اور مس زہرہ ڈربی سامنے اُس کی باہوں میں بیٹھ گئی۔ اور خوفناک آدمی نے کنویں کے چکر لگائے۔ پھر وہ اتر گیا اور مس زہرہ ڈربی نے تالیوں کے شور میں موٹر

سائیکل پر تنہا کنویں کے چکر لگائے اور اوپر آ کر دونوں ہاتھ چھوڑ دیئے اور موٹر سائیکل کی تیز رفتار کی وجہ سے موت کا کنواں زور زور سے ہلنے لگا۔ اور میں مس زہرہ ڈربی کی اس حیرت انگیز بہادری کو مسحور ہو کر دیکھتی رہی۔ کھیل کے بعد وہ دوبارہ اسی طرح چبوترے پر جا بیٹھی اور بے تکلفی سے سگریٹ پینا شروع کر دیا۔ گویا کوئی بات ہی نہیں۔

یہ واقعہ تھا کہ مس زہرہ ڈربی جاپانی چھتری سنبھال کر تار پر چلنے والی میموں اور شیر کے پنجرے میں جانے والی اور جھولوں پر کمالات دکھلانے والی لڑکیوں سے بھی زیادہ بہادر تھی۔ پچھلے برس وہاں "عظیم الشان آل انڈیا دنگل" آیا تھا۔ جس میں حمیدہ بانو پہلوان نے اعلان کیا تھا کہ جو مرد پہلوان انھیں ہرا دے گا وہ اس سے شادی کر لیں گی۔ لیکن بقول فقیرا کوئی مائی کا لال اس شیر کی بچی کو نہ ہرا سکا تھا۔ اور اسی دنگل میں پروفیسر تارابائی نے بھی بڑی زبردست کشتی لڑی تھی اور ان دونوں پہلوان خواتین کی تصویریں اشتہاروں میں چھپی تھیں۔ جن میں وہ بنیان اور نیکریں پہنے ڈھیروں تمغے لگائے بڑی شان و شوکت سے کیمرے کو گھور رہی تھیں ـــــــ

یہ کون پراسرار ہستیاں ہوتی ہیں جو تار پر چلتی ہیں اور موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلاتی ہیں اور اکھاڑے میں کشتی لڑتی ہیں۔ میں نے سب سے پوچھا لیکن کسی کو بھی ان کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔

"دی گریٹ ایسٹ انڈین سرکس" ابھی تماشے دکھا ہی رہا تھا کہ ایک روز فقیرا پلٹن بازار سے سودا لے کر لوٹا تو اُس نے ایک بڑی تہلکہ خیز خبر سنائی۔ کہ مس زہرہ ڈربی کے دو عشاق ماسٹر گلفند اور ماسٹر چھنڈر کے درمیان چکو چل گیا۔ ماسٹر چھنڈر نے مس زہرہ ڈربی کو بھی چکو سے گھائل کر دیا۔ اور وہ ہسپتال میں پڑی ہیں۔ اور اس سے بھی تہلکہ خیز خبر جو فقیرا نے چند دن بعد میونسپلٹی کے نل پر سنی، یہ تھی کہ پلپلی صاحب کی مسیا نے سرکس میں نوکری کر لی۔

"ڈائنا بکیٹ نے ——؟" باجی نے دوہرایا۔

"جی ہاں بڑی بٹیا —— پلپلی صاحب کی مسیا، سنا ہے کہتی ہے کہ اس سے اپنے باپ کی گریبی اور تکلیف اب نہیں دیکھی جاتی۔ اور دنیا والے تو یوں بھی تنگ کرتے ہیں —— اوڈین سینما میں اسے پچیس روپے ملتے تھے، سرکس میں پچھتر روپے ملیں گے —— یہ تو سچ ہے۔ وہ گریب تو بہت تھی بڑی بٹیا ——"

"اور گورے جو اُس کو پیسے دیتے تھے۔؟" میں نے پوچھا۔

غفور بیگم نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا "جاؤ بھاگ جاؤ یہاں سے"۔ لہٰذا میں بھاگ گئی۔ اور باہر جا کر ریشم کی ٹوکری کے پاس بیٹھ کر ڈائنا بکیٹ کی بہادری کے متعلق غور کرنے لگی۔

اب کی بار جب لنگوروں اور مسخروں نے سرکس کے اشتہار بانٹے

تو ان پر چھپا تھا:

سرکس کے عاشقوں کو مژدہ
پری جمال یوروپین دوشیزہ کے حیرت انگیز کمالات
قتالۂ عالم، حسینۂ لندن
مس ڈائنا روز
موت کے کنوئیں میں
آج شب کو

انہی دنوں سینما کا چرچا شروع ہوا تو سینما کے اشتہار عرصے سے لکڑی کے ٹھیلوں پر چپکے سامنے سے گزرا کرتے تھے۔

سالِ رواں کا بہترین فلم "چیلنج"
جس میں مس سردار اختر کام کرتی ہیں، پریڈ کے سامنے
پلیڈیم سینما میں ـــــ آج شب کو!

سالِ رواں کا بہترین فلم "دہلی ایکسپریس"
جس میں مس سردار اختر کام کرتی ہیں، پریڈ کے سامنے
راکسی سینما میں ـــــ آج شب کو!

اور مجھے بڑی پریشانی ہوتی تھی کہ مس سردار اختر دونوں جگہوں پر بیک وقت کس طرح "کام" کریں گی۔ لیکن قسمت نے ایک دم یوں پلٹا کھایا کہ

باجی امسال اُن کی سہیلیوں کے ساتھ کے بعد دیگرے تین فلم دیکھنے گئیں ۔ "اچھوت کنیا" جس کے لئے مسز جوگ مایا چٹرجی نے بتایا کہ ہمارے دیش میں زبردست سماجی انقلاب آگیا ہے ۔ اور گرو دیو ٹیگور کی بھانجی دیویکا رانی اب فلموں میں کام کرتی ہیں ۔ "امرت جیون لتا" جس میں سبیتا دیوی نازک نازک چھوٹی سی آواز میں گاتیں ۔ "مورے پریم کے جھولے جھلا دے کوئی" ۔ اور "جیون پربھات" جسے باجی بڑے ذوق شوق سے اس لئے دیکھنے گئیں کہ اس میں خورشید آپا "کام" کر رہی تھیں ۔ جو اب رینوکا دیوی کہلاتی تھیں ۔ جو اس زبردست سماجی انقلاب کا ثبوت تھا ۔ مسز جوگ مایا چٹرجی کی بشارت کے مطابق ہندوستان جس کے دروازے پر کھڑا تھا ۔ اور تبھی مسز جوگ مایا چٹرجی کی لڑکیوں نے ہارمونیم پر فلمی گانے "نکالنے" شروع کر دیے ۔ "بانکے بہاری بھول نہ جانا ۔ پیتم پیارے پریت نبھانا" "چور چرا دے مال خزانہ ، پیا نینوں کی نندیا چرا دے" اور "تم اور میں اور منا پیارا ۔ گھروا ہوگا سورگ ہمارا ۔"

غفورن بیگم کام کرتے کرتے ان آوازوں پر کان دھرنے کے بعد کمر پر ہاتھ رکھ کر کہتیں "بڑے بوڑھے سچ کہہ گئے تھے ۔ قرب قیامت کے آثار ہیں کہ گائے مینگنیاں کھائے گی اور کنواریاں اپنے منہ سے بر مانگیں گی ۔"

منورما چٹرجی کی سریلی آواز بلند ہوتی "مورے پریم کے جھولے جھلا دے کوئی"

"بے حییفی تیرا آسرا ——" غفور بیگم کانپ کر فریاد کرتیں۔ اور سلیپر پاؤں میں ڈال سپڑ سپڑ کرتی اپنے کام کاج میں مصروف ہو جاتیں۔

انہی دنوں فقیرا بھی اپنی بھاوج کو یہ ساری فلمیں سیکنڈ شو میں دکھا لایا۔ مگر جس رات جل دھرا "چنڈی داس" فلم دیکھ کر لوٹی تو اسے بڑا سخت بخار چڑھ گیا۔ اور ڈاکٹر ہوتن نے صبح کر آ کر اسے دیکھا اور کہا کہ اس مرض تشویشناک صورت اختیار کر چکا ہے۔ اب وہ روز تانگے میں لیٹ کر ہسپتال جاتی اور واپس آ کر دھوپ میں گھاس پر کمبل بچھا کر لیٹی رہتی۔ کچھ دنوں میں اس کی حالت ذرا بہتر ہو گئی۔ اور سکھ نندن خانساماں کی بیوی دھن کلیا اس سے ذرا فاصلے پر بیٹھ کر اس کا دل بہلانے کے لئے پوربی گیت گایا کرتی اور اسے چھیڑ چھیڑ کر رلاتی۔

"ناجو ادا سے سر و حیا سے
بالے سیاں سے سرمائے گئی میں تو ——"

اور غفور بیگم جب جل دھرا کی خیریت پوچھنے جاتیں تو وہ مسکرا کر کہتی "اناجی —— میرا تو سمے آ گیا۔ اب تھوڑے دن میں پران نکل جائیں گے ——"

اور غفور بیگم اس کا دل رکھنے کے لئے کہتیں "اری تو ابھی بہت جیے گی —— اور لے جل دھرا —— ذرا یہ تو بتا کہ تو نے فقیرا نگوڑے پر کیا جادو کر رکھا ہے —— ذرا مجھے بھی وہ منتر بتا دے۔ نجھ نیختی کو تو اپنے گھر والے کو رام کرنے کا ایک بھی نسخہ نہ ملا —— تو ہی کوئی ٹوٹکا بتا دے۔ سنا ہے پہاڑوں

پر جادو ٹونے بہت ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ فقیرا ابھی کیسا تیرا کلمہ پڑھتا ہے۔۔۔۔۔ اری تو تو اُس کی ماں کے برابر ہے۔۔۔۔۔!" اور وہ بڑی ادا سے ہنس کر جواب دیتی۔۔۔۔۔

"انا جی۔ کیا تم نے سنا نہیں۔ پرانے چاول کیسے ہوتے ہیں؟"

"پرانے چاول۔۔۔۔۔؟" میں دہراتی۔۔۔۔۔ اور غفور بیگم ذرا گھبرا کر مجھے دیکھتیں اور جلدی سے کہتیں۔۔۔۔۔ "بی بی آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟ جائیے بڑی بٹیا آپ کو بلا رہی ہیں۔۔۔۔۔" لہٰذا میں سر جھکائے بجری کی رنگ برنگی کنکریاں جوتوں کی نوک سے ٹھکراتی باجی کی طرف چلی جاتی۔ مگر وہ فلسفے کی موٹی سی کتاب کے مطالعہ میں یا مظفر بھائی کا خط پڑھنے یا اُس کا جواب لکھنے میں مستغرق ہوتیں۔ اور مجھے کہیں اور جانے کا حکم دے دیتیں تو میں گھوم پھر کر دوبارہ ریشم کی ٹوکری کے پاس جا بیٹھتی اور اُس کے جلد تندرست ہونے کی دعائیں مانگنے لگتی۔

اسکول میں کرسمس کی چھٹیاں شروع ہو چکی تھیں۔ میں صبح صبح کملا و ملا کے گھر جا رہی تھی کہ راستے میں مسٹر بیکٹ نظر آئے۔ وہ بے حد حواس باختہ اور دیوانہ وار ایک طرف کو بھاگے چلے جا رہے تھے۔ اتنے میں میجر شیلٹن نے اپنی ۱۹۲۶ء ماڈل کی کھڑکھڑیا فورڈ روک کر انہیں اُس میں بٹھا لیا۔ اور فورڈ لیور ویلین ہسپتال کی سمت روانہ ہو گئی۔

میں کملا کے گھر پہنچی تو سوترن خلاف معمول بہت خاموش تھا۔ میرے

پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ وہ ابھی پریڈ گراؤنڈ سے سارا واقعہ سن کر آرہا ہے

ڈائنا بیکٹ ابھی ماسٹر چھندر کے ساتھ ہی موٹر سائیکل پر بیٹھتی تھی۔ اور دیکھنے والوں کا بیان تھا کہ دہشت کے مارے اُس کا رنگ سفید پڑ جاتا تھا۔ اور وہ آنکھیں بند کئے رہتی تھی۔ مگر سرکس منیجر نے اصرار کیا کہ وہ تنہا موٹر سائیکل چلانے کی ٹریننگ بھی شروع کر دے۔ تاکہ اُس کے دل کا خوف نکل جائے۔ دل کا خوف نکالنے کے لئے اُس نے موٹر سائیکل پر تنہا بیٹھ کر کنوئیں کی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی، مگر موٹر سائیکل بے قابو ہو گئی۔ اور ڈائنا کی دونوں ٹانگیں موٹر سائیکل کے تیزی سے گھومتے ہوئے پہیوں میں آکر چور چور ہو گئیں۔ اُسے فوراً یورپین ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ کرنل وائی کومب سول سرجن نے کہا ہے کہ اس کی دونوں ٹانگیں ہمیشہ کے لئے بیکار ہو گئی ہیں۔ اور اسے ساری عمر پہیوں والی کرسی پر بیٹھ کر گزارنی ہو گی۔"

اس دن ہم لوگوں کا کسی چیز میں دل نہ لگا۔ اور ہم سب ایک درخت کی شاخ پر چپ چاپ بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد دفعتہً سوکرن شاخ پر سے نیچے کودا، اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا کرکٹ کھیلنے چلا گیا۔ اور میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی ندامت طاری تھی۔ ایک انجانا احساس جرم اور ندامت ——

دوسرے روز دی گریٹ ایسٹ انڈین سرکس اینڈ کارنیول کے لڑکیلی

مونچھوں اور بے شمار تمغوں والے مینجر اور رنگ ماسٹر پروفیسر شہباز نے اعلان کیا کہ سرکس کوچ کر رہا ہے اور آئندہ سال معزز شائقین کو اس سے زیادہ حیرت ناک تماشے دکھائے جائیں گے۔ لیکن فقیرا کی اطلاع کے مطابق وہ ڈرا ہوا تھا۔ اس کے سرکس میں پے در پے دو شدید حادثے ہوئے تھے۔ اور پولیس اس کے پیچھے لگ گئی تھی۔

کرسمس کی چھٹیاں شروع ہوئے ایک ہفتہ گزرا تھا کہ ایک بہت لمبی اور دبلی پتلی بی بی ہمارے یہاں مہمان آئیں۔ اُن کا نام ڈاکٹر زبیدہ صدیقی تھا۔ وہ دہلی سے کلکتہ جا رہی تھیں اور ایک ہفتے کے لئے یہاں ٹھہری تھیں۔ انہوں نے ولایت سے سائنس میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا تھا۔ وہ کسی دور افتادہ دیسی ریاست کے گرلز کالج کی پرنسپل تھیں اور سیاہ کنارے کی سفید ساری اور لمبی آستینوں کا سفید بلاؤز پہنتی تھیں۔ وہ اپنی طویل القامتی کی وجہ سے ذرا جھک کر چلتی تھیں۔ اور سر نیہوڑا کر بڑی گہری نظر سے ہر ایک کو دیکھتی تھیں۔ اس وقت وہ گنتی کی ان مسلمان خواتین میں سے تھیں جنہوں نے سمندر پار جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔

پہلے روز جب وہ کھانا کھانے بیٹھیں تو انہوں نے ذرا جھجک کر کہا۔ "آپ کے ہاں سارے ملازم ہندو ہیں۔ میں دراصل ہندو کے ہاتھ کا پکا نہیں کھاتی ـــــ"

"مسلمان ہو کر آپ چھوت چھات کرتی ہیں زبیدہ آپا؟ کمال ہے۔ اور آپ تو ولایت تک ہو آئی ہیں زبیدہ آپا" باجی نے اپنی خوبصورت آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"دراصل ـــــ وہ ـــــ میں ـــــ میں ایک وظیفہ پڑھ رہی ہوں آج کل" انہوں نے جھینپتے ہوئے جواب دیا۔ لہٰذا ان کا کھانا غفورن بیگم نے باوضو ہو کر اپنے ہاتھ سے تیار کرنا شروع کیا۔

پڑوس کی ان بیبیوں پر ڈاکٹر زبیدہ کی وزٹ کا بے انتہا رعب پڑا۔ "لڑکی ہو تو ایسی۔ سات سمندر پار ہو آئی مگر ساری کا آنچل مجال ہے جو سر سے سرک جائے ـــــ" مسز فاروقی نے کہا۔

"شرعی پردہ تو دراصل یہی ہے، کہ عورت بس اپنا چہرہ اور ہاتھ کھلے رکھے اور اپنی زینت مردوں سے چھپائے۔ قرآن پاک میں یہی آیا ہے" مسز قریشی نے جواب دیا۔

"روزے نماز کی پابند۔ شرم و حیا کی پتلی۔ اور مومنہ ایسی کہ ہندو کے ہاتھ کا پانی نہیں پیتی ـــــ" مسز انصاری نے تعریف کی۔

ڈاکٹر صدیقی سارے وقت گھاس پر کرسی بچھائے باجی کو جانے کون سی داستان امیر حمزہ سنانے میں مشغول رہتی تھیں۔ اور فقیرا کی بھاوج کو دیکھ کر انہوں نے کہا تھا ـــــ "کیسی خوش نصیب عورت ہے"

جب ڈاکٹر صدیقی صبح سے شام تک ایک ہی جیسی سنجیدہ اور غمناک شکل بنائے بیٹھی رہتیں۔ تو اُن کو محظوظ کرنے کے لئے باجی مجھے بلاتیں (گویا میں کوئی تماشا دکھانے والا بھالو تھی) اور حکم دیتیں۔ فلاں گیت گاؤ۔ فلاں قصہ سناؤ زبیدہ آپا کو۔ ذرا بھاگ کے اپنی دوستوں کو بلا لاؤ اور سب مل کر ناچو

ایک دن ڈاکٹر صدیقی پچھلے لان پر بیٹھی باجی سے کہہ رہی تھیں "مرے کے لئے تو صبر آجاتا ہے، ریحانہ خاتون — زندہ کے لئے صبر کیسے کروں —" اور اس دن جب انہوں نے کسی طرح مسکرانے کا نام ہی نہ لیا تو باجی نے مجھے بلا کر حکم دیا — "ارے رے۔ ذرا وہ اپنے مسخرے پن کا اینگلو انڈین گیت، تو سناؤ، زبیدہ آپا کو —"

"بہت اچھا" میں نے فرمانبرداری سے جواب دیا۔ اور سیدھی کھڑی ہو کر اور ہاتھ گھٹنوں تک چھوڑ کر (جس طرح اسکول میں انگریزی گانے گاتے یا نظمیں پڑھتے وقت کھڑا ہونا سکھلایا تھا) میں نے گیت شروع کیا:

ایک بار ایک سوداگر شہر لندن میں تھا۔
جس کی ایک بیٹی نام ڈائنا اس کا۔
نام اُس کا ڈائنا سولے برس کا عُمر۔
جس کے پاس بہت کپڑا — اور — چاندی — اور —

دفعتہً میرے حلق میں کوئی چیز سی آ اٹکی اور میری آواز رندھ گئی۔ اور میں گیت ادھورا چھوڑ کر وہاں سے تیزی سے بھاگ گئی۔ ڈاکٹر صدیقی حیرت سے مجھے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں۔

شام کو میں نے دلما سے کہا — ”یہ زبیدہ آپا ہر وقت جنے اتنی پریشان کیوں نظر آتی ہیں —“

”مجھے معلوم ہے“ دلما نے جواب دیا۔ وہ مجھ سے ذرا بڑی تھی۔ اور ایک ماہر فن ڈیٹیکٹو تھی — ”کل صبح آنٹی فاروقی آنٹی گوسوامی کو انگلش اسٹورز میں بتا رہی تھیں، کہ سائینٹسٹ ہیں۔ اُن کا نام بھی ڈاکٹر کچھ ہے۔ مجھے یاد نہیں آ رہا۔ آنٹی فاروقی نے آنٹی گوسوامی کو بتایا تو تھا — تو وہ کلکتہ یونی ورسٹی میں زبیدہ آپا کے کلاس فیلو تھے۔ اور جب زبیدہ آپا ولایت گئی تھیں۔ تو وہاں مانچسٹر یونیورسٹی میں بھی کئی سال ان کے ساتھ پڑھا تھا — تو یہ زبیدہ آپا جو ہیں، یہ پچھلے پندرہ برس سے ڈاکٹر کے کچھ کے نام کی مالا جپ رہی ہیں“

”یہ کسی کے نام کی مالا کیسے جپتے ہیں؟“ میں نے دریافت کیا۔

”یہ پتہ نہیں“ دلما نے جواب دیا۔

جب میں گھر کے اندر آئی تو زبیدہ آپا کو غفور بیگم سے تبادلۂ خیالات کرتے پایا۔

اور تبھی یہ پتہ چلا کہ جس ریاست میں زبیدہ آپا کام کرتی ہیں وہ اجمیر

شریف کے بہت قریب ہے۔ اور اسی وجہ سے زبیدہ آپا بہت مذہبی ہو گئی ہیں۔ اور جب سے ان کو یہ اطلاع ملی ہے کہ ڈاکٹر محمود خاں خود اُن کی یعنی زبیدہ آپا کی سگی بھتیجی سائرہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں (جو ایک بے حد خوبصورت سترہ سالہ لڑکی ہے۔ اور کلکتہ کے لوریٹو ہاؤس میں پڑھ رہی ہے) تب سے زبیدہ آپا نماز پنجگانہ کے علاوہ چاشت اشراق، اور تہجد بھی پڑھنے لگی ہیں۔ اور یہاں وہ غفور بیگم سے پنج سورہ شریف، دعائے گنج العرش۔ اور درود تاج کے کتابچے مستعار لے کر پڑھا کرتی تھیں۔ کیونکہ یہ کتابچے سفر پر چلتے وقت وہ گھر بھول آئی تھیں۔ غفور بیگم نے ان سے کہا۔ کہ بٹیا روز رات کو سوتے وقت تسبیح فاطمہ پڑھا کیجئے — چنانچہ ایک مرتبہ جب وہ کھانے کے بعد اپنے کمرے میں بیٹھی تسبیح پھیر رہی تھیں تو میں نے جو جاسوسی پر لگی ہوئی تھی اُن کو دیکھ لیا اور صبح کو ملا کو اطلاع دی۔

"ہمیں معلوم ہو گیا — کل رات زبیدہ آپا ڈاکٹر کچھ کے نام کی مالا جپ رہی تھیں ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔"

ایک رات، دو بجے کے قریب نہال کے کمرے سے یک دل خراش چیخ کی آواز آئی۔ سب لوگ ہڑبڑا کر اپنے اپنے لحافوں سے نکلے اور بھاگتے ہوئے نہال کے کمرے کی طرف گئے۔ مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ باجی نے کواڑوں پر زور زور سے دستک دی۔ اندر سے کچھ منٹ بعد زبیدہ آپا نے

بڑی کمزور آواز میں کہا ——— "ٹھیک ہوں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم لوگ خدا کے لئے فکر نہ کرو ——— جاؤ ——— سو جاؤ ——— میں بالکل ٹھیک ہوں ——— سوتے میں ڈر گئی تھی"۔

"زبیدہ آپا ——— دروازہ کھولیئے ——— !" باجی نے چلّا کر کہا۔

"چلے جاؤ تم لوگ ——— ورنہ میں پھر چیخوں گی ———" زبیدہ آپا نے اندر سے ہسٹیریائی آواز میں کہا۔

صبح کو ان کا چہرہ بالکل اُترا ہوا تھا اور سفید تھا۔ ناشتے کے بعد جب کھانے کا کمرہ خالی ہو گیا تو انہوں نے باجی کو آہستہ سے مخاطب کیا ——— "میں نے کسی کو بتایا نہیں تھا ——— میں ایک چلّہ کر رہی تھی۔ انتالیس راتیں پوری ہو چکی تھیں۔ کل چالیسویں اور آخری رات تھی۔ حکم تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے، میں وظیفہ کے دوران میں مڑ کر نہ دیکھوں۔ ورنہ اُس کا سارا اثر ختم ہو جائے گا۔ اور کل رات ——— دو بجے کے قریب وظیفہ پڑھتے میں نے اچانک دیکھا کہ جا نماز کے سامنے ایک گدھے کی جسامت کا ہیبت ناک سیاہ کتّا میرے مقابل میں بیٹھا دانت نکوس رہا ہے ——— میں نے دہل کر چیخ ماری اور چلّہ ٹوٹ گیا۔ کتّا غائب ہو گیا ——— مگر میرا سارا کیا کرایا اکارت گیا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا ——— اب کچھ نہیں ہو سکتا ———" اُن کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اور انہوں نے عینک اُتار کر پلکیں خشک کیں۔ باجی ہکا بکا ہو کر انہیں دیکھنے

لگیں ــــ "مگر زبیدہ آپا ــــ آپ تو ــــ آپ تو سائنسداں ہیں۔ مانچسٹر یونی ورسٹی سے پڑھ کر آئی ہیں۔ اور ایسی توہم پرستی کی باتیں کرتی ہیں۔ ہوش کی دوا کیجئے ــــ آپ کو ہیلوسی نیشن (Hullicination) ہوا ہوگا ــــ گدھے کے برابر کتا ــــ اور وہ آپ سے آپ غائب بھی ہو گیا ــــ!" اتنا کہہ کر باجی کھلکھلا کے ہنس پڑیں۔

"ریحانہ خاتون ــــ" ڈاکٹر صدیقی نے سر نیہوڑا کر باجی کو گہری نظر سے دیکھا اور آہستہ آہستہ کہا ــــ "تم ابھی صرف بائیس برس کی ہو۔ تمہارے ماں باپ، اور محبت کرنے والے چچاؤں کا سایہ تمہارے سر پہ قائم ہے۔ تم ایک بھرے پُرے کنبے میں، اپنے چہیتے بہن بھائیوں کے ساتھ۔ سکھ کی چھاؤں میں زندہ ہو۔ اپنی پسند کے نوجوان سے تمہارا بیاہ ہونے والا ہے ــــ ساری زندگی تمہاری منتظر ہے۔ دنیا کی ساری مسرتیں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔ خدا نہ کرے تم پر کبھی ایسی قیامت گزرے جو مجھ پہ گزر رہی ہے۔ خدا نہ کرے کہ تمہیں کبھی تن تنہا اپنی کا مقابلہ کرنا پڑے ــــ کسی کی بے بسی اور اُس کے دکھی دل کا مذاق نہ اڑاؤ ــــ" اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی جو میز کے سرے پر بیٹھی جاسوسی میں مصروف تھی۔ کیونکہ گدھے کے برابر سیاہ کتا ایک انتہائی سنسنی خیز واقعہ تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ خاموش ہو گئیں۔ باجی نے پلکیں جھپکا کر مجھے اشارہ کیا کہ میں اڑنچھو ہو جاؤں۔ چنانچہ میں اڑنچھو

ہو گئی۔

اس واقعے کے دوسرے دن ڈاکٹر صدیقی کلکتہ روانہ ہو گئیں۔ اور ان کے جانے کے چند روز بعد ہی ایک انوکھی اور بن بلائی مہمان آن اُتریں۔

ڈالن والا کی سڑکیں عموماً خاموش پڑی رہتی تھیں۔ اکا دکا راہگیر یا موٹروں اور تانگوں کے علاوہ کبھی کبھار کوئی سکھ جوتشی ہاتھ میں سرٹیفکیٹوں کا میلا سا پلندہ سنبھالے اِدھر اُدھر تاکتا سامنے سے گزر جاتا تھا۔ یا موٹے موٹے "چائنا مین" زین میں بڑی لفاست سے بندھے ہوئے بے حد وزنی گٹھر سائیکلوں پر لادے چکر کاٹا کرتے تھے۔ یا کشمیری قالین فروش یا بزاز یا قیمتی پتھر فروخت کرنے والا پھیری لگا جاتے تھے۔

مسٹر پیٹر رابرٹ سردار خاں ان ہی پھیری والوں میں سے ایک تھے۔ مگر وہ اپنے آپ کو ٹریولنگ سیلزمین کہتے تھے۔ اور انتہا سے زیادہ چرب زبان اور لسّان آدمی تھے۔ موصوف مسلمان سے عیسائی ہو گئے تھے۔ ترکی ٹوپی اوڑھتے تھے۔ اور سائیکل پر پلاسٹک کے برتن بیچتے گھوما کرتے تھے۔ اور مہینے دو مہینے میں ایک بار ہماری طرف کا پھیرا لگا جاتے تھے۔ وہ اپنی ہر بات کا آغاز "خدا باپ کا شکر ہے" سے کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی تبلیغ بھی شروع کر دیتے تھے۔

اس دن مسٹر پیٹر رابرٹ سردار خاں جو سائیکل برساتی میں ٹکا کر برآمدے میں داخل ہوئے تو انہوں نے ناک کی سیدھ جا کر مہمان کمرے کے اندر جھانکا۔

جس کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ اور اطمینان سے اظہارِ خیال کیا ــــــ

"ہوں۔ تو یہ کمرہ تو ہمیشہ خالی ہی پڑا رہتا ہے ــــــ بات یہ ہے کہ میری ایک بہن ہیں۔ وہ لیڈی ڈاکٹر ہیں۔ اور چند روز کے لئے دہرہ دون آ رہی ہیں" اس کے بعد جواب کا انتظار کئے بغیر وہ سائیکل پہ بیٹھ کر غائب ہو گئے۔

تیسرے روز جاپانی جارجٹ کی ملاگیری ساری میں ملبوس ایک بے حد فربہ خاتون تانگے سے اتریں۔ مسٹر سردار خاں سائیکل پر ہمرکاب تھے۔ انہوں نے اسباب اتار کر مہمان کمرے میں پہنچایا۔ اور والدہ اور باجی سے اُن کا تعارف کرایا ــــــ "یہ میری بہن ہیں۔ آپ کے یہاں دو تین دن رہیں گی۔ اچھا، اب میں جاتا ہوں۔" پھر خاتون کو مخاطب کیا "بھئی تم کو جس چیز کی بھی ضرورت ہو بلا تکلف بیگم صاحبہ سے کہہ دینا ــــــ اپنا ہی گھر سمجھو۔ اچھا ــــــ بائی بائی ــــــ"

اور سائیکل پہ بیٹھ کر یہ جا وہ جا ــــــ

یہ ایک مسلمان بی بی تھیں۔ جنہوں نے یہ نہ بتایا کہ کہاں سے آ رہی ہیں۔ اور کہاں جائیں گی۔ محض اس امر سے انہوں نے آگاہ کیا کہ پرائیویٹ طور پر ہومیو پیتھک ڈاکٹری پڑھ رہی ہیں۔ اور شام کے وقت اپنے ٹین کے اٹیچی کیس میں سے ایک موٹی سی اردو کتاب نکال کر دکھائی جو اُن کی ہومیو پیتھک ڈاکٹری کا کورس تھا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ "دی رائل تحفہ ہارہ مونیم گائیڈ سیریز" کے رسالوں کے ذریعے انہوں نے اس فن میں بھی مہارتِ تامہ حاصل کر لی

ہے۔ اور انہوں نے "اے ماؤ، بہنو، بیٹیو، دنیا کی عزت تم سے ہے" سپاٹ اور بے سری آواز میں "مد باجے" پر گا کر سنائی۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ آزادی نسواں کی قائل ہیں اور اپنی مرضی سے کتخدائی کریں گی ـــــ تیسرے روز مسٹر سردار خاں دوبارہ نمودار ہوئے۔ وہ تانگا ساتھ لے کر آئے تھے جس میں بٹھا کر وہ ہومیوپیتھک لیڈی ڈاکٹر کو ہمراہ لے گئے۔

مسٹر پیٹر رابرٹ سردار خاں اس کے بعد پھر کبھی نہ آئے۔

دنیا میں بڑے عجیب و غریب واقعات ہوا کرتے تھے۔

ینگس ہمارا سیاہ رنگ اور سفید کانوں والا بدشکل اور چھوٹا سا ادو غلا کتا تھا وہ دن بھر برساتی کے کونے میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہتا تھا۔ چونکہ وہ نجس تھا، یعنی کتا تھا اس لیے اُسے گھر کے اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ جاڑوں میں وہ ایک کوٹھری میں پڑے ہوئے اپنے کھٹولے پر سو رہتا۔ رشیم کو ہان نکال کر اُس پر غرّاتی تو وہ اُس کا بھی برا نہ مانتا۔ وہ ایک بے حد وفادار اور مرنجاں مرنج طبیعت کا مالک۔ اور اپنی قسمت پر شاکر اور قانع تھا۔ کیونکہ خدا نے اُسے ایک نجس کتّا ہی پیدا کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رشیم کی اس گھر میں بے حد قدر و قیمت ہے۔ اُسے اس حقیقت کا بھی علم تھا کہ اس کمینی دنیا میں محض ظاہری رنگ روپ کی قدر کی جاتی ہے۔ ایک رواقی فلسفی کی مانند آنکھیں بند کئے وہ دن بھر غالباً یہی سب سوچتا رہتا تھا۔ اور اجنبی قدموں کی چاپ سنتے ہی آنکھیں کھول کر ذرا بھونکنا

شروع کر دیتا تھا۔ وہ اٹلی اور حبشہ کی جنگ کے زمانے میں میجر شیلٹن کی اعلیٰ نسل کتیا میگی کے یہاں پیدا ہوا تھا۔ میجر شیلٹن چونکہ بین الاقوامی سیاست سے گہری دل چسپی رکھتے تھے اس لئے انہوں نے اس کا نام بنگس رکھا تھا۔

جس روز باجی نے اپنی چند سہیلیوں کو چائے پر بلایا تو بجلی کا ایک تار روشنی کے انتظام کے لئے باغ میں پہنچا دیا گیا تھا اس روز موسم بہت خوش گوار تھا۔ اور باجی اور ان کی سہیلیاں غروب آفتاب کے بعد تک اوور کوٹ پہنے باہر ٹہلتی رہی تھیں۔ پارٹی کے بعد اپنی مہمانوں کو رخصت کرنے کے لئے ٹہلتی ہوئی سڑک پر چلی گئیں۔ اور بنگس برآمدے میں رکھے ہوئے دعوت کے سامان کی حفاظت کے لئے مستعدی سے سیڑھیوں پر بیٹھا رہا۔ جب باجی واپس آئیں تو انہوں نے جھک کر دور سے بنگس کو پچکارا۔ بنگس اس خلاف توقع اور غیر معمولی اظہار التفات سے بے انتہا خوش ہوا۔ اور زور زور سے اچھلنے کودنے لگا۔ اور باجی کو مزید خوش کرنے کے لئے اس نے وہ سلے کھیل تماشے دکھانے شروع کیے جو اسے برکت مسیح جمعدار نے سکھلائے تھے۔ اس طرح کھیلتے کھیلتے اس نے پام کے گملوں کے عقب میں پڑا ہوا بجلی کا تار منہ میں اٹھا لیا۔

تار میں کرنٹ موجود تھا۔ لہٰذا بنگس پٹ سے گر گیا۔ اور چند منٹ بعد اس کے منہ سے دھواں نکلا۔ کیونکہ بجلی نے اسے اندر سے جلا دیا تھا۔

ایک روز ڈاکٹر زبیدہ صدیقی کا خط باجی کے نام کلکتہ سے آیا۔ انہوں نے لکھا تھا:

"۔۔۔ جس روز میں یہاں پہنچی اسی ہفتے میں محمود صاحب نے میری بھتیجی سائرہ سے شادی کر لی۔ بڑی دھوم کی شادی ہوئی ہے۔ تم نے "السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا" میں دولہا دُلھن کی تصویر بھی دیکھی ہوگی۔

پی۔ ایس:۔ میں نے اب اللہ میاں کے خلاف اسٹرائیک کر دیا ہے۔ اور پرسوں میں نے بھی ڈاکٹر اُپّل سے سول میرج کر لی۔ ڈاکٹر اُپّل بردوان کالج میں پڑھاتے ہیں۔

پی۔ پی۔ ایس:۔ ڈاکٹر اُپّل ہندو ہیں۔

یہ اطلاع کہ میں نے ایک کافر سے شادی کر لی مسز فاروقی، مسز قریشی، اور مسز انصاری کو بھی دے دینا۔"

دعاگو زبیدہ اُپّل

دسمبر کے پہلے ہفتے میں جل دھرا کی حالت دفعتہً زیادہ بگڑ گئی۔ اُسے فوراً ہسپتال پہنچایا گیا۔ جہاں دوسرے دن اُس نے پران تج دیے۔

فقیرا دھاڑیں مار مار کر روتا پھرا۔ "صبر کر بچے ۔۔۔۔ صبر کر ۔۔۔۔" غفورن بیگم نے اُسے دلاسا دیا۔

"اناجی ۔۔۔ صبر کیسے کروں ۔۔۔ میرے لیے ماں تھی تو وہ۔ بھاوج تھی تو وہ

بیوی تھی تو وہ ——" اور وہ روتا دھوتا پھر چلا گیا۔

مگر تیسرے دن پھول چننے کے بعد جب وہ شمشان گھاٹ سے لوٹا تو بہت خوش تھا۔ اُس نے ہاتھ میں ایک مٹی کا کونڈا اٹھا رکھا تھا۔ جس میں جل دھرا کی راکھ تھی۔ اور اُس نے کہا کہ رات کو میں اسے اپنے سرہانے رکھ کر سوؤں گا۔ اور جل دھرا نے جس جنم میں جنم لیا ہو گا۔ اس کے پیروں کے نشان راکھ پر بن جائیں گے۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں، باجی ایم اے کے لئے فلسفے کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ اور بہت سخت قابل تھیں۔ فقرا کی بات انہوں نے بڑی دلچسپی سے سنی۔ اور رات کو کھانے کی میز پر بہت دیر تک مسئلہ تناسخ اور عوام کے توہمات کے متعلق والد سے تبادلۂ خیالات کرتی رہیں۔

رات کو سونے سے پہلے فقرا نے اپنی کوٹھری کی کنڈی اندر سے چڑھائی اور راکھ کا کونڈا چارپائی کے نیچے رکھ کر سو گیا۔

صبح سویرے وہ بے حد خوش خوش کھانے کے کمرے میں داخل ہوا۔ فرطِ انبساط سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ بیگم صاحب —— بڑی بٹیا —— بی بی ——" اُس نے اطلاع دی —— "میری جل دھرا گوریا بن گئی۔"

"گوریا بن گئی ——!" باجی نے دہرایا۔ اور جلدی سے شال لپیٹ کر شاگرد پیشے کی طرف دوڑیں —— میں بھی اُن کے پیچھے پیچھے سرپٹ بھاگی ——

فقیرا کوٹھری میں سے کونڈا باہر لایا۔ "بڑی بٹیا ------ دیکھ لیجئے ------ یہ دیکھیے ------" میں نے اور باجی نے آنکھیں پھاڑ کر راکھ کو دیکھا، جس پر چڑیا کے پنجوں کے نشان بہت واضح بنے ہوئے تھے۔

اس کے بعد سے فقیرا روز صبح کو گوریا چڑیوں کو دانہ ڈالتا ------ ان کے لئے پانی کی کٹوریاں بھر بھر کر رکھتا۔ اور اگر کوئی گوریا روشندان یا دریچے میں سے کسی کمرے میں داخل ہو جاتی تو وہ سارے کام چھوڑ کر چٹکی بجا بجا کر کہتا۔ "چہ چہ چہ ------ آہ ------ آہ ------ یے ------ یے ------" اور باجرے کے دانے ہتیلی پر ڈال کر ساکت کھڑا رہتا۔ اس مقصد کے لئے وہ باجرے کے دانے ہمیشہ جیب میں رکھتا تھا۔ اور اب اُسے مستقل یہ تشویش رہتی تھی کہ ریشم کسی گوریا کو نہ پکڑ لے۔

اس سال چلّے کا جاڑا پڑا تھا۔ ڈاٹنا روزا ابھی ہسپتال میں داخل تھی۔ مسٹر بیکٹ اب میونسپلٹی کے نل پر بھی نظر نہ آتے۔ اور اب وہ دن بھر پریڈ گراؤنڈز کی ایک بنچ پر دھوپ میں سر جھکائے بیٹھے رہتے۔ اور اسی طرح بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتے۔ اُن کی ٹوپی اُن کے پاس بنچ پر کاسے کی طرح رکھی رہتی۔ اور درختوں کے زرد پتے گر گر کر اُس میں جمع ہوتے رہتے۔

کرسمس نزدیک آگئی۔ اور کیرل گانے والوں کی ٹولیاں رات کے وقت ڈالن والا کی سڑکوں پر گھوم گھوم کر اکارڈین اور گٹار پر ولادتِ مسیحؑ کے

گیت گاتی پھرتیں۔ صبح منہ اندھیرے کوئلہ بیچنے والے پہاڑیوں کی آوازیں آتیں، جو چیتھڑوں اور گدڑیوں میں ملبوس، کوئلے کی بھاری کنڈیاں نواڑ کی پٹی کے ذریعے ماتھے سے باندھے "کوئلہ چاہیئے کوئلہ" چلاتے پھرتے۔ سورج اوپر آتا تو سامنے ہمالیہ کا برف پوش سلسلہ کرنوں میں جگمگا اٹھتا۔ رات کو جتنا پانی فقیرا چڑیوں کے لئے باہر رکھتا تھا، وہ صبح کو جما ہوا ملتا——رات گئے کسی پہاڑی راہ گیر کی بانسری کی آواز کہرے میں تیرتی ہوئی سنائی دے جاتی۔

کرسمس سے ایک دن پہلے سائمن نے بتایا کہ وہ صبح سویرے اُٹھ کر اسٹوو پر کرسمس پڈنگ تیار کرتے ہیں۔ گرجا جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد اپنی کوٹھری میں بیٹھ کر دن بھر انجیل مقدس پڑھتے رہتے ہیں۔ اور کرسمس کے دوسرے روز وہ پڈنگ لے کر آئیں گے۔ بڑے دن کے تحفے کے طور پر وہ باجی کے لئے گلابی نقلی موتیوں کا ننھا سا ہار، میرے لئے بالوں کے دو سرخ اور سبز ربن اور ریشم کے لئے ربڑ کی چھوٹی سی رنگین گیند لائے تھے۔ اور انہیں بڑے دن کے تحفے کے طور پر دس روپے دیئے گئے۔ جو اُن کے لئے اتنی بڑی اور غیر متوقع رقم تھی۔ کہ وہ چند لحظوں تک دس کے نوٹ کو آنکھیں پھاڑے دیکھتے رہے۔ اور پھر ذرا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے احتیاط سے اندر واسکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

کرسمس کو تین دن گزر گئے۔ مگر سائمن نہ آئے۔ چوتھے دن اُن کی خیر خبر لانے کے لئے فقیرا کو پادری اسکاٹ کے گھر بھیجا۔ اُس نے واپس آکر سر جھکا لیا۔ اور آہستہ سے کہا ——— "سیمن صاحب کی مٹی ہو گئی۔ پادری صاحب کا مالی بتا رہا تھا کہ بڑے دن کے روز اُس نے کوٹھری کا دروازہ کھولا تو سیمن صاحب چارپائی پر مرے ہوئے پڑے تھے۔ انہیں سردی لگ گئی۔"

"اُن کے پاس ایک ہی کمبل تھا بیگم صاحب ——— رات کو وہی کوٹ پتلون پہنے پہنے سوتے تھے۔

"بڑا جاڑا پڑ رہا ہے بڑی بٹیا۔ ہمارے ہاں گڑھوال میں تو لوگ باگ اکثر سردی سے اکڑ اکڑ کر مرتے رہتے ہیں۔ اب اتنا گرم کپڑا کہاں سے لائیں ——— سردی تو ہر سال ہی پڑتی ہے۔"

تیسرے پہر کو جب سائمن کے آنے کا وقت ہوا تو ریشم جو سردی کی وجہ سے پچھلے ایک ہفتے سے اپنی ملائم پشمینے کی شال میں لپٹی ٹوکری کے نرم و گرم گدیلوں میں ممٹی ممٹائی بیٹھی رہتی تھی۔ ٹوکری سے اُتر کر لنگڑاتی لنگڑاتی پھاٹک کی طرف چلی گئی۔ اور پلیا پر بیٹھ انتظار میں مصروف ہو گئی۔ کیونکہ سائمن روزانہ راستے میں میجر شیلٹن کے باورچی خانے سے مرغوں اور پرندوں کی مزیدار ہڈیاں اپنے میلے سے رومال میں احتیاط سے لپیٹ کر اس کے لئے لایا کرتے تھے۔

سامنے نہ آئے۔ دھوپ مدھم پڑ گئی۔ تو اُس نے اُکتا کر اندر واپس آنے سے پہلے ایک گوریا چڑیا پر تاک لگائی۔ گوریا پھر سے اُڑ کر سلور اوک کی شاخ پر جا پہنچی۔ ریشم نے اُس کے تعاقب میں درخت پر چڑھنا چاہا۔ مگر اپنی شکستہ ٹانگ کی وجہ سے جڑ پر سے پھسل کر نیچے آ رہی گوریا پھدک کر اُس سے اونچی شاخ پر چلی گئی۔ ریشم نے منہ اٹھا کر بڑی بے کسی سے کمزور سی میاؤں کی۔ گوریا نے پر پھیلائے اور کھلے، نیلے آسمانوں کی سمت اڑ گئی۔

قلندر

غازی پور کے گورنمنٹ ہائی اسکول کی فٹ بال ٹیم ایک دوسرے سے میچ کھیلنے گئی تھی۔ وہاں کھیل سے پہلے لڑکوں میں کسی چھوٹی سی بات پر جھگڑا ہوا اور مار پیٹ شروع ہو گئی۔ چونکہ کھیل کے کسی پوائنٹ پر جھگڑا شروع ہوا تھا، تماشائیوں نے بھی دلچسپی لی۔ جن لڑکوں نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی، انھیں بھی چوٹیں آئیں۔ اور اُن میں میرے بھائی بھی شامل تھے۔ جو گورنمنٹ ہائی اسکول کی نویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ ان کے سر میں چوٹ لگی۔ اور ناک سے خون بہنے لگا۔ اب سارے میدان میں ہنگامہ پھیل گیا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ اور جو لڑکے زخمی ہوئے تھے اس ہڑبونگ میں اُن کی خبر کسی نے نہ لی۔

اس بکھرے ہوئے ضلع میں ٹیلی فون نہیں تھے۔ سارے۔ سارے شہر میں صرف چھ موٹر بس تھی۔ اور ہاسپٹل ایمبولینس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

وہ اتوار کا ویران ساون تھا۔ ہوا میں زرد پتے اڑتے پھر رہے تھے۔ میں پیچھے کے لمبے چوڑے سنسان برآمدے میں فرش پر چپ چاپ بیٹھی گڑیا کھیل رہی تھی۔ اتنے میں ایک یکہ ٹھک ٹھک کرتا آ کر سیدھا برآمدے کی اونچی سطح سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اور ایک سترہ اٹھارہ سال کے اجنبی لڑکے نے بھائی کو سہارا دے کر نیچے اتارا۔ بھائی کے ماتھے سے خون بہتا دیکھ کر میں دہشت کے مارے فوراً ایک ستون کے پیچھے چھپ گئی۔ سارے گھر میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اماں بدحواس ہو کر باہر نکلیں اجنبی لڑکے نے بڑی رسان سے اُن کو مخاطب کیا۔

"ارے ارے دیکھیے گھبرائیے نہیں گھبرائیے نہیں۔ میں کہتا ہوں ...." پھر وہ میری طرف مڑا اور کہنے لگا "منی ذرا دوڑ کر ایک گلاس پانی تو لے آ۔ بھیا کے لیے۔"

اس پر کئی ملازم پانی کے جگ اور گلاس لے کر بھائی کے چاروں طرف آ کھڑے ہوئے۔ اور لڑکے نے ان سے سوال کیا "صاحب کدھر ہیں؟"

"صاحب باہر گئے ہوئے ہیں" کسی نے جواب دیا۔

"نہیں نہیں، دفتر میں بیٹھے ہیں" دوسرے نے کہا۔

لڑکا زیادہ دیر کیے بغیر آگے بڑھا۔ اور گیلری میں سے اِدھر اُدھر دیکھتا

ابا جان کے دفتر تک جا پہنچا۔ ابا جان دروازہ بند کئے کسی اہم مقدمے کا فیصلہ لکھنے میں مصروف تھے۔ لڑکے نے دستک دی اور داخل ہو گیا۔ میز کے سامنے جا کر بڑی خود اعتمادی اور سنجیدگی سے بولا۔

"صاحب آپ کے صاحب زادے ہمارے اسکول میں میچ کھیلنے آئے تھے۔ اور ان کو تھوڑی سی چوٹ آ گئی ہے۔ کیونکہ کھیل کھیل میں دنگا ہو گیا تھا۔ میرا نام اقبال بخت ہے۔ میں منشی خوش بخت رائے سکسینہ کا لڑکا ہوں، جو ڈسٹرکٹ کورٹ میں مختار ہیں۔ آپ سے میری درخواست ہے کہ ہمارا اسکول بند کرنے کا حکم نہ دیں۔ اور لڑکوں پر جرمانہ بھی نہ کریں۔ کیونکہ ایک تو ہمارے امتحان ہونے والے ہیں۔ اور دوسرے ہمارے لڑکے بہت غریب ہیں....."

ابا جان نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا۔ اور اُس کی مدلل بحث اور اطمینان بخش گفتگو سن کر بہت متاثر اور محظوظ ہوئے۔ انہوں نے بڑی شفقت سے اپنے پاس بٹھایا۔

اس طرح اقبال میاں کا ہمارے یہاں آنا جانا شروع ہوا۔ بھائی سے اُن کی گاڑھی دوستی ہو گئی۔ مگر وہ زیادہ تر گھر کی خواتین کے پاس بیٹھتے اور گرہستی کے معاملوں میں صلاح و مشورہ دیتے۔ بازار کے بھاؤ اور دنیا کے حالات پر روشنی ڈالتے یا لطیفے سناتے۔ جب وہ دوسری مرتبہ ہمارے یہاں آئے تھے۔ تب میں نے بھائی کو آواز دی تھی۔ "اقبال میاں آئے ہیں" وہ فوراً نہایت شان سے چلتے

ہوئے میرے نزدیک آکر بولے یہ دیکھو منی، میں تم سے بہت بڑا ہوں۔ مجھے اقبال بھائی کہو۔ کیا کہو گی ؟"

"اقبال بھائی ....." میں نے ذرا سہم کر جواب دیا۔ اقبال بھائی مجھے ہمیشہ منی ہی کہہ کر پکارتے رہے۔ مجھے ان کے دیئے ہوئے نام سے سخت چڑھ تھی۔ مگر ہمت نہ پڑھتی تھی کہ اُن سے کہوں۔ کہ میرا اصل نام لیا کریں۔

اب وہ سارے گھر کے لئے "اقبال میاں" اقبال بھائی اور اقبال بھیا بن چکے تھے۔ پہلو کے لان پر املتاس کا بڑا درخت ہمارے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا، کہ اس کے سایے میں کھاٹ بچھا کر فرصت کے وقت محفل جمتی تھی۔ اس کی صدرات ڈرائیور صاحب کرتے تھے۔ نائب صدر اقبال بھائی خود بخود بن گئے۔ اس محفل کے دوسرے رتن استاد یوسف خاں جمنا پانڈے مہاراج، چپڑاسی عبدل، بیرا اور بھائی تھے۔ میں بن بلائے مہمان کی حیثیت سے اِدھر اُدھر ملی رہتی تھی۔

استاد یوسف خاں کے کمرے کا تعلق اندر کے کمروں سے نہیں تھا۔ اور اس کا دروازہ اسی لان پر کھلتا تھا۔ استاد پرانے اسکول کے منجھے ہوئے شاستر سنگیت کار تھے۔ رام پور دربار سے ان کا تعلق رہ چکا تھا۔ شاعری بھی کرتے تھے۔ اور دن بھر نول کشور پریس لکھنؤ کے چھپے ہوئے پرانے ناول پڑھا کرتے تھے۔ بوڑھے آدمی تھے۔ آنکھوں میں سرمہ لگاتے تھے۔ اور نکیلی مونچھ رکھتے

تھے۔ دونوں وقت کا کھانا، ناشتہ اور چائے بڑے آدر سے کشتی میں سجا کر ان کے کمرے میں پہنچادی جاتی تھی۔ تیسرے پہر وہ اندر آکر بڑے تکلّف سے اماں کو گت بھیروی اور گت بھیم پلاسی سکھلاتے تھے۔ اور رامی بیٹھی ستار پر ٹن ٹن کیا کرتی تھیں اقبال بھائی استاد کے گہرے دوست بن گئے۔ اور آرائشِ محفل، طلسمِ ہوشربا، اسرارِ لندن اور شرر کے ناولوں کا لین دین دونوں کے بیچ چلتا رہتا۔ اقبال بھائی اس سال انٹرنس کا امتحان دینے والے تھے۔

ایک روز مجھے درخت کی شاخ سے لٹکتا دیکھ کر انہوں نے اماں سے کہا۔ منّی پڑھتی لکھتی بالکل نہیں۔ ہر وقت ڈنڈے بجایا کرتی ہے۔

"یہاں کوئی اسکول تو ہے نہیں —— پڑھے کہاں؟" اماں نے جواب دیا۔ "پچھلے دنوں میرے ایک پھوپھی زاد بھائی نے مجھے حساب سکھانے کی ہر ممکن کوشش کر دیکھی تھی اور ناکام ہو چکے تھے۔ اب اقبال بھائی نے والنٹیئر کر دیا۔ امتحان کے بعد میں اِسے پڑھا دیا کروں گا۔

اگلے اتوار کو اقبال بھائی نے میرا انٹرویو لیا —— "انگریزی تو اسے تھوڑی سی آگئی ہے۔ اُردو فارسی میں بالکل کوری ہے۔" انہوں نے اماں کو رپورٹ دی۔ اور اس کے بعد انہوں نے روزانہ نازل ہونا شروع کر دیا۔ ان کی تنخواہ دس روپے ماہوار مقرر کی گئی۔ روز شام کے چار بجے ان کا اِکّہ دُور پھاٹک میں داخل ہوتے دیکھ کر میری جان نکل جاتی۔ گرمیاں شروع ہو چکی تھیں۔ اقبال بھائی نے حکم

دیا ۔۔۔ ہم باغ میں بیٹھ کر تجھے پڑھائیں گے۔ تیرا دماغ جس میں بھوسا بھرا ہوا ہے۔ ٹھنڈی ہوا سے تازہ ہو گا ۔۔۔ لہذا پیچھے باغ میں فالسے کے درخت کے نیچے میری چھوٹی سی بید کی کرسی اور اقبال بھائی کی کرسی میز رکھی جاتی جب میں نیکی کے جنون میں ہوتی تو میں مالی سے باغ کی بڑی جھاڑو مانگ لیتی اور فالسے کے نیچے اقبال بھائی کی کرسی کی جگہ خوب جھاڑو دیتی اور یوں بھی پڑھائی کے مقابلے مجھے باغ میں جھاڑو دینا کہیں زیادہ اچھا لگتا تھا۔

اقبال بھائی جوڑ گھٹاؤ میں سر کھپانے کے بعد حکم دیتے "تختی لاؤ" تختی پر وہ بے حد خوش خطی سے لکھتے :-

قلم گوید کہ من شاہ جہانم
قلم کش را بہ دولت می رسانم

اپنے ٹیڑھے میڑھے حرفوں میں اس شعر کو کئی بار لکھتی۔ یہاں تک کہ میری انگلیاں دکھنے لگتیں۔ اور میں دعا مانگتی ۔۔۔ "اللہ کرے اقبال بھائی مر جائیں اللہ کرے !"

ایک مرتبہ میں سبق سنانے کے بجائے کرسی پر کھڑی ہو کر ایک ٹانگ سے ناچ رہی تھی۔ اچانک اقبال بھائی کو غصہ آگیا۔ انہوں نے میرے کان اس زور سے اینٹھے کہ میرا چہرہ سرخ ہو گیا اور میں چلا چلا کر رونے لگی۔ مگر اس کے بعد سے میں نے شرارت کم کر دی۔

اقبال بھائی ابھی مجھے پانچ چھ مہینے پڑھا پائے ہوں گے کہ ابا جان کا تبادلہ غازی پور سے اودھ کو ہو گیا۔

اگلے دو تین سال تک اقبال بھائی کے اس کے پاس کبھی کبھار خط آتے رہے۔

"اب ہم نے ایف۔ اے کرنے کا ارادہ بھی چھوڑ دیا ہے۔ انٹرنس میں ہمیں تھرڈ ڈویژن ملا۔ اس وجہ سے ہمارا دل ٹوٹ گیا ہے۔ پس اب ہم بھی منصرم، پیشکار، قانون گو، یا قرق امین کی حیثیت سے زندگی گزار دیں گے۔ یا حد سے حد والد صاحب قبلہ کی مانند مختار بن جائیں گے۔ اس لئے کبھی سوچتے ہیں قانون کا امتحان دے ڈالیں۔ اور اس اندھیرے شہر میں رہ کر کر بھی کیا سکتے ہیں؟"

پھر ان کے خط آنے بند ہو گئے۔ میں آئی۔ ٹی کالج لکھنؤ کی فرسٹ ایر میں پڑھ رہی تھی۔ اس دن ہمارے یہاں کچھ مہمان چائے پر آئے ہوئے تھے۔ سب لوگ بیٹھک خانے میں بیٹھے تھے کہ برآمدے میں آ کر کسی نے آواز دی۔

"اے بھائی، کوئی ہے؟"

"کون ہے؟" اماں نے کمرے میں سے پوچھا۔

"ہم آئے ہیں — اقبال بخت......"

اماں نے بے انتہا خوش ہو کر انھیں اندر بلایا۔ کمرے میں بہت جگمگاتے قسم کے لوگوں کا جماؤ تھا۔ اقبال بھائی چاروں طرف نظر ڈال کر ذرا جھجکے، مگر دوسرے لمحے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اماں کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔ پھر

اُن کی نظر مجھ پر پڑی اور انہوں نے بے حد خوشی سے چلّا کر کہا ۔

"اری منّی، تو اتنی بڑی ہو گئی ـــــ!"

میں نئی نئی کالج میں داخل ہوئی تھی اور اپنے "کالج کا اسٹوڈنٹ" ہونے کا احساس تھا ۔ اقبال بھائی نے جب سب لوگوں کے سامنے اس طرح "اری منّی" کہہ کر مخاطب کیا تو بے حد کوفت ہوئی ۔

اقبال بھائی میلا سا پاجامہ اور گھسی ہوئی شیروانی پہنے تھے ۔ اور ظاہر تھا کہ اُن کی مالی حالت خستہ تھی ۔ مگر انہوں نے مختصر میں اتنا ہی بتایا کہ کانپور میں ملازم ہو گئے ہیں ۔ اور پرائیویٹ طور پر ایف ۔ اے ۔ بی ۔ ٹی کر چکے ہیں ۔ پھر وہ ابا جان کے کمرے میں گئے ۔ اور ان کے پاس دیر تک بیٹھے رہے ۔

اس کے بعد اقبال بھائی پھر غائب ہو گئے ۔

دس سال بعد ـــــ مجھے لندن پہنچے چھ سات روز ہی ہوئے تھے ۔ میں بی ۔ بی ۔ سی کے اُردو سیکشن میں بیٹھی ہوئی تھی کہ کسی نے آواز دی ـــــ "ارے بھائی سکینہ صاحب آ گئے کہ نہیں!"

"آ گئے ـــــ!" یہ کہتے ہوئے اقبال بخت سکینہ پردہ اُٹھا کر کمرے میں داخل ہوئے ۔ گھسی ہوئی برساتی اوڑھے ـــــ اخباروں کا پلندہ اور ایک موٹا سا پورٹ فولیو سنبھالے ، میرے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک میز کی طرف چلے گئے ـــــ پھر انہوں نے پلٹ کر مجھے دیکھا ۔ پہلے انہوں نے مجھے نہیں

پہچانا۔ ٹکٹکی باندھ کر چند لمحوں تک مجھے دیکھتے رہے ——— "اری منّی ———" اُن کے منہ سے نکلا۔ پھر اُن کی آواز بھرّا گئی۔

وہ میرے پاس آکر بیٹھے! ابّا جان کی خیریت پوچھی ——— "ابّا جان کا کئی سال ہوئے انتقال ہو گیا۔ اقبال بھائی!" میں نے کہا۔ یہ سن کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اور ڈیسکش کے کارپردازوں نے اُن کو روتے دیکھ کر خاموشی سے اپنے اپنے کاغذات پر سر جھکا لئے۔"

انہوں نے مجھے بتایا کہ کانپور کی ملازمت اسی سال چھوٹ گئی تھی۔ پھر وہ سارے ملک میں جو تیاں چٹخاتے پھرے اسی سال اُن کے والد کا انتقال ہو گیا۔ وہ اکلوتے بیٹے تھے۔ ایک بہن کی کسی گاؤں میں شادی ہو چکی تھی۔ آزادی کے بعد جب قسمت آزمائی کے لئے انگلستان کناڈا اور امریکہ جانے کی ہوا چلی تو وہ بھی ایک دن غازی پور گئے ——— اپنا پشتینی مکان فروخت ہوا۔ اور اُس کے روپے سے جہاز کا ٹکٹ خرید کر لندن آپہنچے۔ پچھلے چار سال سے وہ لندن میں تھے۔ اور یہاں بھی طرح طرح کے پاپڑ بیل رہے تھے۔

کسی کو ان کے متعلق ٹھیک سے معلوم نہ تھا کہ وہ کرتے کیا ہیں۔ مجھ سے بھی انہوں نے ایک مرتبہ گول مول لفظوں میں صرف اتنا ہی کہا ——— "ریجنٹ اسٹریٹ پالی ٹکنیک میں اکنامکس پڑھ رہا ہوں۔" جس ادارہ کا انہوں نے نام لیا میں اس کی اصلیت سے بخوبی واقف ہو چکی تھی۔ جب لوگ اس غیر واضح

لہجے ہی یہ کہتے کہ وہ ریجنٹ اسٹریٹ پالی ٹکنیک جرنلزم پڑھ رہے ہیں — یا اکنامکس پڑھ رہے ہیں، یا فن سنگ تراشی یا فوٹوگرافی سیکھ رہے ہیں تو آگے کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو سکتی تھی۔

لیکن بہت جلد مجھے معلوم ہو گیا کہ اقبال بھائی لندن کے ہندوستانی اور پاکستانی طالب علموں کی کمیونٹی کے اہم ستون کی حیثیت رکھتے تھے۔ کوئی ہنگامہ، جلسہ، جلوس، جھگڑا فساد، جشن، میچ، تہوار ان کے بغیر مکمل نہ ہو سکتا تھا۔ تصویروں کی نمایش ہے تو ہال وہ سجا رہے ہیں۔ ناچ گانے کا پروگرام ہے، تو میکروفون لگا رہے ہیں۔ ڈرامہ ہے تو ریہرسل کے لئے لوگوں کو پکڑتے پھر رہے ہیں۔ دعوت ہے تو باورچی خانے میں مستعد کھڑے ہیں۔ کبھی کبھی وہ منظر پہ سے غائب ہو جاتے اور اطلاع ملتی کہ وہ اتوار کے روز پیٹی کورٹ پہن کر منڈی میں لوگوں کو قسمت کا حال بتانے پائے گئے، یا گلاسگو کے کسی بازار میں ہندوستانی جڑی بوٹی فروخت کرتے نظر آئے۔ ایک دفعہ معلوم ہوا کہ ساؤتھ کینجگٹن کے عالی شان فلیٹ میں ٹھہرے ہیں۔ کبھی وہ سوہو کے نفیس ریستوران میں نظر آتے۔ کبھی مزدوروں کے چائے خانوں ہیں دکھلائی پڑتے۔ اقبال بھائی شاعری بھی کرتے تھے۔ آسٹریلیا اور ایم۔ سی۔ سی۔ کے میچ کے زمانے ہیں انہوں نے ایک مرثیہ لکھا:۔

ہر تازہ وکٹ پہ ہمہ تن کانپ رہا ہے

بار ہے بڑا سخت ہتھن کانپ رہا ہے
کس شور کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

اقبال بھائی کو فنِ موسیقی، علم نجوم، پامسٹری، ہومیو پیتھی، طب یونانی، آیور وید کے لے کر، پولٹری فارمنگ کاشتکاری اور باغبانی تک ہر چیز میں دخل تھا۔ ہم دو تین لوگوں نے مل کر ایک فلم سوسائٹی بنائی جس میں ہم بمبئی سے فلمیں منگوا کر ہندوستانی اور پاکستانی پبلک کو دکھاتے۔ اس دن اقبال بھائی برات کا دولہا بنے ہوتے، ٹکٹ بیچ رہے ہیں۔ مہمانوں کو لا لا کر بٹھا رہے ہیں۔ فلم شروع ہونے سے پہلے اسٹیج پر جا کر مس مہتاب، یا مس نسیم بانو، یا مس ہیّ کو گلدستہ پیش کر رہے ہیں۔ اسی زمانے میں انہوں نے یہ بھی طے کر لیا کہ بمبئی جا کر ایک عہدِ آفرین فلم پروڈیوس کریں گے۔ فلم کی کہانی، مکالمے، گیت خود لکھیں گے اور ڈائریکٹ بھی خود ہی کریں گے۔ ہیرو کے بڑے بھائی یا باپ کا رول بھی ادا کریں گے۔ اور کل ملا کر فلم انڈسٹری پر رولر پھیر دیں گے۔

اقبال بھائی اتنے برسوں سے یہاں تھے، مگر شراب کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے، شراب خانوں کے قریب نہیں پھٹکتے تھے۔

ایک روز وہ مجھے راستے میں نظر آئے اس عالم میں کہ ہاتھ میں ایک بہت قیمتی پھولوں کا بڑا سا گچھا ہے اور لپکے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ مجھے دیکھ کر بولے۔ آؤ۔ آؤ! میں ذرا ایک دوست کو دیکھنے اسپتال جا رہا ہوں تم ساتھ چلو۔

اسپتال کے اندر جا کر وہ کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک اسلامی ملک کے سفیر کی بیگم صاحبہ بیمار تھیں۔ اقبال بھائی نے گلدستہ میز پر رکھا اور نہایت خلوص سے مریض کی مزاج پرسی میں مصروف ہو گئے۔ اتنے میں سفیر کی بیٹی کمرے میں آئی اور بے حد تپاک سے ان سے ملی۔ میں حیرت سے یہ سب دیکھتی رہی۔ باہر آکر کہنے لگے "بھئی یہ لوگ ہمارے دوست بن گئے ہیں۔ کیا کریں! بہت اچھے لوگ ہیں!"

"آپ کی ان صاحبزادی سے کس طرح ملاقات ہوئی؟ میں نے پوچھا۔

"لمبا قصہ ہے۔ پھر کبھی بتائیں گے۔ انہوں نے چھوٹا سا جواب دیا۔

میں اس لڑکی کو ایک آدھ بار دیکھ چکی تھی۔ وہ بے حد بد دماغ تھی۔ یونی ورسٹی میں پڑھتی تھی۔ اور حد سے زیادہ اینٹی انڈین مشہور تھی۔ اس وقت بھی اسپتال کے کمرے میں اس نے کوئی ناگوار سیاسی چرچا شروع کر دیا۔

"بھائی اگر ہندوستان کو گالیاں دے کر اُس کا دل بڑا ہوتا ہے" اقبال بھائی نے زینے سے اُترتے ہوئے مجھ سے کہا ___ "تو اس میں میرا کیا ہرج ہے" اس کو اسی طرح سکون ملتا ہے۔

اس کے کچھ عرصے بعد ہی ایک شام وہ انڈر گراؤنڈ میں مل گئے۔ ساتھ ہی وہ لڑکی اور اُس کی کزن بھی تھی۔ لڑکی نے مجھ سے کہا۔ "ہم لوگ ایک مجلس میں جا رہے ہیں۔ آپ بھی چلیے۔"

"میں تو نہ جا سکوں گی۔ میں نے تھیٹر کے ٹکٹ خرید لئے ہیں!" میں نے معافی

چاہی۔

اقبال بھائی نے بڑے صدمے سے مجھے دیکھا ــــ "محرم کی ساتویں تاریخ کو تھیٹر جا رہی ہو؟" میں بے حد شرمندہ ہوئی ــــ مجھے یاد نہ رہا تھا" میں نے جواب دیا۔

"آپ شیعہ ہیں یا سنی؟" دوسری لڑکی نے سوال کیا۔

"میں قادیانی ہوں" میں نے جواب دیا۔

"قادیانی!" وہ خاموش ہو گئی۔ چند منٹ بعد صغیر کی لڑکی نے خیال ظاہر کیا۔ اقبال صاحب تو بڑے مومن آدمی ہیں۔ آج کل کے شیعاؤں میں اپنے مذہب کا اتنا درد کہاں.... ؟" اتنے میں اسٹیشن آگیا اور وہ تینوں ٹرین سے اتر گئے۔

اگلے روز بی بی سی میں اقبال بھائی سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا ــــ "اقبال بھائی، آپ یہ فراڈ بھی کرنے لگے! ان لڑکیوں کے سامنے آپ نے خود کو مسلمان کیوں ظاہر کیا ہے؟ نہ صرف مسلمان، بلکہ شیعہ بھی!"

جواب ملا ــــ "دیکھو مَنّی، دنیا میں اس قدر تفرقہ ہے کہ سب لوگ ایک دوسرے کی جان کو آئے ہوئے ہیں۔ میری جب اس لڑکی سے ملاقات ہوئی تو وہ میرے نام کی وجہ سے مجھے مسلمان سمجھی اور میرے سامنے ہندوؤں کی اور ہندوستان کی خوب برائیاں کیں۔ اس کے بعد اگر میں اُسے بتا دیتا کہ میں بھی ہندو ہوں تو اس کو کس قدر پچھتاوا ہوتا۔ اور پھر اس میں میرا ہرج کیا ہے۔ میرے خاندان میں سیکڑوں

برس سے فارسی نام رکھے جاتے ہیں۔ اس سے میرے خاندان کے دھرم پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ اب اگر میں نے خود کو مسلمان ظاہر کر دیا تو دنیا پر کون سی قیامت آ جائے گی ۔۔۔ بتاؤ ۔۔۔ بتاؤ! ارے واہ رے منّی! اتنی بڑی افلاطون بنتی ہو۔ مگر دماغ کے جالے صاف نہیں ہوئے۔ عقل میں وہی بھوسا بھرا ہے۔"

ایک شام میں اپنی دوست زاہدہ کے یہاں گئی، وہ پکنگ میں مصروف تھی۔ صبح سویرے وہ اپنے سارے خاندان کے سمیت دو مہینے کے لئے کراچی واپس جا رہی تھی۔ میں کچھ دیر تک اس کے یہاں بیٹھی۔ پھر مجھے یاد آیا کہ اقبال بھائی نے آسٹریلین طالب علموں کی ایک فیسٹی ول میں مدعو کیا ہے۔ چند روز پہلے ایک نیا ہینڈ بیگ خرید کر زاہدہ کے یہاں چھوڑ آئی تھی۔ چلتے وقت خیال آیا کہ اسے لیتی چلوں۔ ہینڈ بیگ زاہدہ کی سنگار میز پر رکھا تھا۔ وہ دوسرے کمرے میں اسباب باندھ رہی تھی۔ میں نے اسے آواز دی ۔۔۔ "زاہدہ میں بیگ لئے جا رہی ہوں ......" "اچھا ......" اُس نے جواب دیا۔ میں نیچے آ گئی۔

آسٹریلین طالب علموں کے یہاں اقبال بھائی ہال کے بیچ میں کھڑے آسٹریلیا اور ہندوستان کے دوستانہ تعلقات پر دھواں دھار تقریر کر رہے تھے۔ میں برابر کے کمرے میں چلی گئی۔ جہاں بہت سے لڑکے لڑکیوں کا جمگھٹ تھا۔ اور چار پانچ ویٹر چائے بنا بنا کر سب کو دے رہے تھے۔ میں نے نیا ہینڈ بیگ وہیں ایک کھڑکی میں رکھ دیا۔ اور چائے پینے کے بعد ہال میں لوٹ آئی۔

چلتے وقت مجھے ہینڈ بیگ کا خیال آیا۔ میں اُسے اندر سے اُٹھا لائی۔ اور اقبال بھائی کے ہاتھ میں دے دیا۔ شاید اس کا کھٹکا کھل گیا تھا۔ زینے سے اُترتے ہوئے انہوں نے کھٹکا بند کیا اور بولے

"اتنے ڈھیر سارے نوٹ!" میں بے دھیانی میں ان کی بات پوری طرح نہیں سنی۔ اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگی رہی۔ اسٹیشن پر اقبال بھائی نے بیگ مجھے تھما دیا۔ گھر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ زاہدہ کی کار باہر کھڑی ہے۔ اور دونوں میاں بیوی انتہائی بدحواسی کی حالت میں لینڈ لیڈی مسز ڈینگ فلڈ سے کچھ پوچھ رہے ہیں۔ زاہدہ مجھے دیکھ کر ہکلانے لگی، — "وہ بیگ ..... وہ بیگ ...."

"ہاں ہاں — میرے پاس ہے تو ..... کیوں؟"

"اس میں میں نے پورے پانچ سو کے نوٹ ٹھونس دیئے تھے۔ تمہارے جانے کے بعد یاد آیا۔ اور تمہاری بھلکڑ عادت کا خیال کر کے جان نکل گئی کہ اگر تم نے بٹوہ راستے میں کہیں اِدھر اُدھر چھوڑ دیا تو کیا ہوگا — یا اللہ تیرا شکر! یا اللہ تیرا شکر ..... یا اللہ .....!"

دوسرے روز بی بی سی میں میں نے اقبال بھائی کو یہ سنسنی خیز واقعہ سنایا۔ اطمینان سے بولے "وہ تو میں نے بیگ میں پہلے ہی دیکھ لیا تھا، کہ نوٹ ٹھونسے ہوئے ہیں۔"

"آپ نے مجھے اسی وقت کیوں نہ بتایا ____؟"

"میں نے کہا تو تھا، تم نے سنا ہی نہیں ——!"

"آپ کو یہ خیال بھی نہ آیا کہ میرے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آگیا ہے جسے میں اطمینان سے ادھ کھلے بیگ میں لئے پھر رہی ہوں۔"

"میں نے سوچا کہیں سے آہی گیا ہوگا۔ پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اور دو گھنٹے وہ بیگ اسی طرح کھڑکی میں رکھا رہا۔ اگر اُس وقت چوری ہو جاتا تو زاہدہ کو کیا منہ دکھاتی۔ یا اللہ! —— یا اللہ!"

"دیکھ منّی! ہونی کو کوئی انہونی نہیں کر سکتا۔ تیری گوٹیاں کی قسمت میں تھا کہ اس کا روپیہ اُسے صحیح سلامت مل جائے اب تو کیوں فکر کر رہی ہے؟ یہ بتا، تو نے اچھما کے لئے بات کی؟"

اچھما کو سو کٹی ایک پریشان حال اُداس سی لڑکی تھی۔ جو بہت دن سے ملازمت اور ایک سستے سے کمرے کی تلاش میں تھی، حال ہی میں مسز وینگ فلڈ کے تہ خانے میں ایک کمرہ خالی ہوا تھا۔ جس کا کرایہ صرف ڈھائی پونڈ ہفتہ تھا —— مسز وینگ فلڈ کا اصرار تھا کہ وہ اپنے مکان میں ہر چلتے پھرتے ایرے غیرے کو کرایہ دار نہیں رکھتیں۔ اور صرف بہترین خاندانوں کو اعلیٰ طبقے کے لوگوں کو اپنے یہاں رہنے کی خوش نصیبی بخشتی ہے۔ ان کے جنت مکانی شوہر برٹش کولونیل سروس میں تھے اور مسز وینگ فلڈ برسوں کولمبو میں بڑی میم صاحبہ کی حیثیت سے زندگی گزار چکی تھیں۔ ان کے سسر نائٹ تھے —— وغیرہ وغیرہ

لیکن میاں کے مرنے اور انگریزی سامراج کے زوال کے بعد دلیش واپس آکر انہیں لینڈ لیڈی بننا پڑا تھا۔ اکثر زینے پر چڑھتے یا اترتے ہوئے وہ میرا راستہ روک کر اپنے خوشگوار ماضی کے قصّے سنانے لگتیں۔

ایک دن انہوں نے بڑے رازدارانہ لہجے میں بے حد اداسی سے مجھ سے کہا تھا۔" ایک بات سنو، اتنے اچھے اچھے جنٹل مین تمہارے دوست ہیں۔ ان میں سے کسی ایک سے میری شادی کروا دو۔" رات کو جب میں نے تہ خانے کے کمرے کے بارے میں ان سے کہا تو نہ جانے وہ کسی اچھے موڈ میں تھیں کہ انہوں نے اچّھاکوسوکٹی کے بارے میں یہ تک نہیں پوچھا کہ وہ کیا کرتی ہے اور ہر ہفتے کرایہ ادا کر سکے گی یا نہیں۔ چنانچہ دو تین روز میں اچّھاکوسوکٹی وہاں آ گئی۔"

میرا فلیٹ چوتھی منزل پر تھا۔ دوسری منزل پر اور لوگوں کے علاوہ ایک ٹیلی ویژن ایکٹرس اڈوینا کارسٹیل بھی رہتی تھی۔ جس کے بارے میں مسز وینگ فلڈ مجھ سے کہہ چکی تھی، میں تو اسے کبھی اپنے یہاں جگہ نہ دیتی، مائی ڈیئر، وہ بڑی خاندانی لڑکی ہے بس ذرا اس کی زندگی پٹڑی سے اتر گئی ہے۔" میری اس سے شناسائی صرف اس حد تک تھی کہ زینے پر مڈبھیڑ ہو جاتی۔ وہ مسکرا کر ہلو، کہہ دیا کرتی تھی۔ مسز وینگ فلڈ نے اطلاع دی تھی کہ اکثر وہ دن بھر کمرے میں اکیلی بیٹھی شراب پیا کرتی ہے۔ وہ اپنے شوہر پر بری طرح عاشق تھی۔ مگر اس۔

اُس بے چاری کو طلاق دیدی تھی۔ تبھی سے اس کا یہ حال ہو گیا تھا

ایک رات دو بجے کے قریب دھم سے میری آنکھ کھل گئی۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ تو سامنے پولیس کا نسٹبل کھڑا تھا۔ اور اُس کے پیچھے مسز وینگ فلڈ مارے بدحواسی کے آئیں، بائیں، شائیں کر رہی تھی "غضب ہو گیا، غضب ہو گیا ـــــ" انہوں نے کہا ـــــ "اڈوینا نے تمہارے غسل خانے کی کھڑکی میں سے کود کر ...... خودکشی کر لی ...."

"میرے غسل خانے کی کھڑکی میں سے؟"

"ہاں، سب سے اونچی کھڑکی ـــــ بے چاری اڈوینا کو یہی نظر آئی ....."

کانسٹبل غسل خانہ کے اندر گیا۔ کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ کھڑکی کے نیچے ٹب میں اڈوینا کا ایک سلیپر پڑا تھا۔ غسل خانہ کا دروازہ لینڈنگ پر کھلتا تھا۔ اور اڈوینا کارسٹیبل بڑے اطمینان سے اس میں داخل ہو کر نیچے کود گئی تھی۔ میرے ذہن میں صبح کے تہلکہ پسند اخباروں کی سرخیاں کوند گئیں۔ اب رپورٹر میرا انٹرویو کریں گے۔ اس کھڑکی اور ٹب کی تصویریں کھینچیں گی۔ اللہ جانے کیا کیا ہو گا .... نیچے سے آوازوں کی بھنبھناہٹ بلند ہوئی "زندہ ہے .... زندہ ہے!" میں نے جھانک کر نیچے دیکھا۔ اڈوینا کو ایمبولینس میں لٹایا جا چکا تھا "زندہ ہے .... ؟" مسز وینگ فلڈ ذرا مایوسی سے پوچھا۔ اور کانسٹبل کے ساتھ تیزی سے نیچے اتر گئی۔

صبح کو یہ حادثہ میں نے بی بی سی کینٹین میں دوستوں کو سنایا۔ اتنے میں اقبال بھائی آگئے۔ پورا قصہ سن کر بولے "کس اسپتال میں ہے؟" میں نے بتایا۔ اس کے بعد ہی دوسری باتیں شروع ہو گئیں۔

اس بات کو چند ہی ہفتے گزرے تھے کہ رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے شور سے پھر میری آنکھ کھل گئی۔ کھڑکی میں سے میں نے جھانک کر دیکھا کہ گراؤنڈ فلور کی سیڑھیوں پر اقبال بھائی دم بخود کھڑے ہیں۔ اور مسز ویننگ فلڈ اُن پر بُری طرح برس رہی ہے۔ میں گھبرا کر نیچے اُتری۔ مسز ویننگ فلڈ تقریباً ہسٹریکل انداز میں چیخ رہی تھیں۔

"مسز ویننگ فلڈ کیا بات ہے؟" میں نے سختی سے پوچھا۔

وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر میری طرف مڑیں "تم خود فیصلہ کر لو — جو غنڈا ہوگا اُسے غنڈا ہی کہا جائے گا....."

جب انہوں نے اقبال بھائی کو غنڈا کہا تو مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے منہ پر تھپیڑ لگا دیا ہو۔ اقبال بھائی سر جھکائے کھڑے رہے

مسز ویننگ فلڈ گرجتی رہیں "تم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے یہاں یہ جنٹل مین لڑکیوں کے کمرے میں رات کو نہیں ٹھہر سکتے۔ یہ میرا قانون ہے۔ ابھی میرے یہاں ایک خودکشی کی واردات ہو چکی ہے مجھے مکان کی نیک نامی کا بھی خیال کرنا ہے۔ میں صرف اعلیٰ خاندان....."

"مسز وینگ فلڈ، اصل بات بتایئے! کیا ہے؟ آپ مسٹر سکینہ کیا کہہ رہی تھیں؟"

میں نے آگ بگولہ ہو کر پوچھا

"ان سے پوچھ رہی ہوں کہ یہاں رات کے ساڑھے بارہ بجے مس کو کسو گٹی کے کمرے میں کیا کر رہے تھے؟"

اقبال بھائی جیسے مہذب اور وضع دار آدمی کو میری موجودگی میں ایسی لچر باتیں سننی پڑ رہی ہیں۔ اُن کا چہرہ غم و غصہ سے سرخ ہو گیا۔ مگر وہ خاموش رہے۔

وہ غصّے سے بے قابو ہو کر چند منٹ تک اسی طرح چلاتی رہیں۔ گیلری کے دروازے کھلے اور بند ہوئے۔ اور اوپر منزلوں کے دریچوں میں سے سر نکال کر لوگوں نے جھانکا۔ اقبال بھائی چپ کھڑے رہے۔ پھر اچانک وہ خاموش ہو گئیں۔ اور اپنے کمرے میں جا کر دروازہ زور سے بند کر لیا۔

نیچے تہ خانے میں اچھا کو سو گٹی تیز بخار سے نیم بے ہوش پڑی تھی۔ اقبال بھائی رات کے گیارہ بجے دوا لے کر اُس کے پاس پہنچے تھے۔ اور گھنٹے بھر سے اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی وقت مسز وینگ فلڈ نے زینے کے دروازے میں جا کر چلانا شروع کر دیا تھا۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ اچھا بیمار ہے۔ میں نے شرمندہ ہو کر کہا "میں بھی دس بجے کے بعد واپس آئی ہوں!"

"مجھے خود معلوم نہ تھا۔" اقبال بھائی نے کہا۔ "دس بجے اُس کا فون آیا کہ

اُس کی طبیعت سخت خراب ہے ـــــ" پھر انہوں نے آہستہ سے برساتی کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور ایک لفافہ نکال کر مجھے دیا ـــــ "اسے روپے کی ضرورت ہو گی۔ صبح کو اُسے دے دینا" اتنا کہہ کر وہ سر جھکائے ہوئے سیڑھیاں اُتر کر پھاٹک سے باہر چلے گئے۔ میں نے لفافہ کھولا اُس میں دس پونڈ کے نوٹ تھے۔ یہ دس پونڈ اقبال بھائی نے جانے کون کون سے جتن کر کے کمائے ہوں گے۔ میں انہیں سر جھکائے گھسی ہوئی برساتی اوڑھے، تیز تیز قدم رکھتے سنسان سڑک پر ایک طرف کو جاتے دیکھتی رہی۔

دوسرے دن میں چند ہفتے کے لئے شہر سے باہر جا رہی تھی۔ واپس آ کر میں نے جگہ بدل لی۔ مجھے مسز ویننگ فلڈ سے کراہت ہونے لگی تھی۔ لینڈ لیڈیاں زیادہ تر بھٹیارنوں جیسی ہوتی ہیں۔ مگر مسز ویننگ فلڈ جس انتہائی گھٹیا انداز میں اقبال بھائی کے اوپر چیخی تھیں اس منظر کی یاد میرے لئے بہت تکلیف دہ تھی۔

اچھا کوسوکٹی تندرست ہو چکی تھی۔ اُسے کہیں نوکری بھی مل گئی تھی۔ مگر اپنے لئے ساری دوڑ دھوپ کر ڈالنے اور اپنے کام نکلوا لینے کے بعد اُس نے اقبال بھائی کی طرف سے ایکا ایک بے رخی اختیار کر لی تھی۔ لیکن وہ اسی وضع داری سے اُس سے شناسائی نبھاتے رہے۔

ایک روز فون کی گھنٹی بجی۔ اور ایک خاتون کی آواز آئی "ہلو...."

ہلو.... میں مسز آلو دیہارے بول رہی ہوں۔

"مسز آلو دیہارے.....؟" میں نے دہرایا۔

"ہاں، تم مجھے پہچانتی نہیں؟ میں تمہاری پرانی لینڈ لیڈی ہوں۔ پہلے والی مسز ڈینگ فلڈ۔ میری شادی ہو گئی ہے۔ آج شام کو میرے ساتھ آکر چائے پیو۔"

شام کو مسز آلو دیہارے اپنی بیٹھک والے کمرے کے دروازے پر خندہ پیشانی سے مجھ سے ملیں۔ کمرے کے آتش دان پر ایک تصویر رکھی تھی، جس میں مسز آلو دیہارے اپنی عمر سے کوئی دس سال چھوٹے ایک سنگھالی آدمی کے ساتھ پھولوں کا گچھا ہاتھ میں لئے کھڑی تھیں۔ دولہا کے برابر میں اقبال بخت سکسینہ کوٹ میں کارنیشن سجائے مسکرا رہے تھے۔

"مسٹر سکسینہ میرے شوہر کے بیسٹ مین تھے۔" مسز آلو دیہارے نے اطلاع دی۔

"اقبال بھائی.....!" دوسرے روز میں نے اُن سے پوچھ ناچھ کی۔

"دیکھو منّی، بات یہ ہوئی کہ اس رات جو بی بی پنجے جھاڑ کر اس بُری طرح میرے پیچھے گئیں، تو میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ حد سے زیادہ فرسٹریشن اور تنہائی کا شکار ہیں۔ ان کی مدد کرنی چاہیئے۔ تو میں نے بتایا تھا کہ وہ کالے آدمی تک سے شادی کرنے کو تیار ہیں میں اس آلو دیہارے کو جانتا تھا جو کسی دولت مند بیوہ کی تلاش میں تھا۔ بڑا شریف اور غریب لڑکا ہے میں نے مسز

وِنگ فلڈ کا پتہ اسے بتا دیا۔ دو لوگوں کی زندگی بن گئی۔ اس میں کوئی ہرج ہوا میرا؟"

اقبال بھائی بہیئت ہندوستانی طالب علموں کا جتھا "سالانہ یوتھ فیسٹیول" کے لئے پراگ جا رہا تھا۔ اس سال حکومتِ پاکستان نے اپنے طالب علموں کو کمیونسٹ ملکوں میں جانے کی ممانعت کر دی تھی۔ اور وہ اس وجہ سے بہت اُداس تھے۔ جماعت کے پراگ روانہ ہونے سے ایک روز پہلے ایک تقریب میں ایک بنگالی طالب علم نے افسوس سے کہا "ہم لوگ اس سال نہیں جا سکے گا۔ اِدھر ورلڈ کا سارا کنٹری ہو گیا۔ خالی پاکستان نہیں ہو گا۔" اقبال بھائی فوراً اس کے پاس گئے اور ملائمت سے بولے "حفیظ الرحمن بھائی دل چھوٹا نہ کرو۔ پاکستان کی نمایندگی میں کر دوں گا۔"

پراگ میں دنیا بھر سے آئے ہوئے نوجوان ایک شاندار کنسرٹ میں اپنے اپنے ملکوں کے لوک گیت سنا رہے تھے۔ اتنے میں اسٹیج پر خاموشی چھا گئی۔ ایک لڑکی نے اناؤنس کیا۔ اب ہمارے عزیز ملک پاکستان کے برادر نمایندے اپنے دیش کے مزدوروں کا گیت سنائیں گے۔"

پاکستان کے نام پر بہت دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ اور سفید کھڑکھڑاتی ہوئی شلوار، سیاہ شیروانی، اور بھورے رنگ کی جناح کیپ پہنے بے حد رعب اور سنجیدگی سے چلتے ہوئے مسٹر اقبال بخت مائیکروفون کے سامنے آئے۔ پاکستان میں ترقی پسندوں کی عوامی تحریک کی ناکامیابی کی وجہ سے

پر اختصار سے روشنی ڈالی اور پھر کہا ــــ ساتھیو، اب میں آپ کو اپنے محنت کش طبقے کا ایک گیت سناتا ہوں۔ اور بے حد پاٹ دار آواز میں۔ اُنہوں نے شروع کیا۔

بوجھ اُٹھالو ہیّا ہیّا
بوجھ اُٹھالو ہیّا ہیّا
محل بنے گا راجہ جی کا
پیٹ پلے گا ہمارا تمہارا
گاڑ لینا کیسے بھائی
ایسے بھائی
اونچا کر لو ہیّا ہیّا
بوجھ اُٹھالو شیر بہادر
ہیّا ہیّا ہیّا ہیّا

حاضرینِ مجلس پر ایک گیت کا بے انتہا اثر ہوا۔ اور ہمیشہ کی طرح سامعین نے ساتھ ساتھ آواز ملائی شروع کر دی ــــ مگر آگے چل کر سید مطلبی فرید آبادی کے اس مشہور گیت کے باقی بول اقبال بھائی کے ذہن سے بالکل اتر گئے۔ دراصل اُن کو یاد ہی صرف تین بول تھے۔ لیکن انہوں نے بڑے اطمینان سے گانا جاری رکھا۔

پیالی اُٹھالو   کیسے بھائی
ایسے بھائی   ہیّا ہیّا
چمچا اُٹھالو
چمچا اُٹھالو   ہاں ہاں بھائی
ہیّا ہیّا

ہزاروں نے ایک ساتھ دہرایا۔

چمچا اُٹھالو
چمچا اُٹھایا   ہاں ہاں بھائی
ہیّا ہیّا

اس طرح جو لفظ اقبال بھائی کے دماغ میں آتے گئے، وہ ہیّا ہیّا کے ساتھ جوڑتے چلے گئے۔ اور تالیوں کے طوفان میں ان کا گیت انتہائی کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔

چیکوسلواکیہ سے واپسی کے کچھ دن بعد اقبال بھائی نے اطلاع دی۔ میں نے سانپوں کا کاروبار شروع کر دیا ہے۔

"سانپوں کا کاروبار؟"

"کئی سو بندر بھی ہیں۔" انہوں نے ذرا ملائمت سے آگے کہا۔ "دراصل" انہوں نے کھنکھار کر کہنا شروع کیا۔ "بات یہ ہے منّی، کہ یہ اپنے خالد صاحب

جو ہیں نا، ان کے سسر مسٹر چراغ دین امریکہ کے چڑیا گھروں اور تجربہ گاہوں کو سانپ اور بندر سپلائی کرتے ہیں۔ مجھے انہوں نے اپنے فرم میں نوکر رکھ لیا ہے۔ اور میں اب وہاں کا کام سنبھالنے امریکہ جا رہا ہوں۔" چنانچہ اقبال بھائی سانپوں کا کاروبار کرنے امریکہ چلے گئے۔"

ایک روز ڈاک کے ذریعہ مجھے اڈوینا کرسٹائل کا مختصر سا خط ملا، جو آئرلینڈ سے آیا تھا۔ اڈوینا کرسٹائل نے لکھا تھا "ساری دنیا نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اپنے وجود سے نفرت ہو چکی تھی۔ میں نے موت کا سہارا ڈھونڈا تھا۔ مگر مرنے میں بھی اپنی زندگی ہی کی طرح ناکام رہی۔ سال بھر تک میں پلاسٹر آف پیرس میں جکڑی اسپتال میں پڑی رہی اور مسٹر سکسینہ ہر ہفتے، ہر موسم میں، ہر حالت میں گھنٹے بھر کے لئے میرے پاس آ کر بیٹھتے تھے۔ اور مجھے سمجھاتے تھے کہ زندہ رہنے کے لئے ہمت نہ ہارنا کس قدر ضروری ہے۔"

مجھے معلوم نہیں، آج کل وہ کہاں ہیں؟ یہ خط میں آپ کو اس لئے لکھ رہی ہوں، کہ ان کو میرا سلام پہنچا دیجیئے۔"

مگر مجھے بھی معلوم نہ تھا کہ مسٹر سکسینہ آج کل کہاں ہیں؟ انہوں نے امریکہ پہنچ کر کسی کو ایک کارڈ تک نہ بھیجا تھا۔ میں وطن واپس آ گئی۔

اقبال بھائی کے بارے میں کسی کو بھی معلوم نہ ہوا کہ وہ کون سی وادی اور کون سی منزل میں ہیں۔ لیکن کوئی چار سال ہوئے میری ایک چچازاد بہن تعلیم

ختم کر کے سان فرانسسکو سے لوٹی تو اُس نے اطلاع دی ـــــ "میں نے اقبال بھائی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ـــــ ہالی وڈ میں خاص الخاص بے وربی ہلس پر ....."

"رہتے ہیں۔ ایک بہت عالی شان محل میں جس میں دو سوئمنگ پول ہیں۔ گیڈلک کار ہے۔ ایک فلیٹ ہے۔ وغیرہ وغیرہ.... مجھے انہوں نے کھانے پر بلایا اپنے یہاں۔ نیگرو بٹلر.... اور.... اور...."

راوی نے آگے بتایا کہ سانپوں کے کاروبار کے سلسلے میں امریکہ پہنچنے کے تیسرے دن ہی مسٹر چراغ دین اور مسٹر اقبال بخت سکسینہ کے بیچ کچھ اختلاف ہو گئے۔ جس کے نتیجے کے طور پر مسٹر سکسینہ کو اپنی ملازمت سے استعفیٰ دینا پڑا۔ اس کے بعد سنہری موقعوں کے اس دیش میں وہ بھانت بھانت کی ملازمتیں اور مزدوریاں کرتے کیلیفورنیا پہنچے، وہاں سکھ اور پنجابی مسلمان زمینداروں کے کھیتوں پر کام کرتے رہے۔ وہاں سے ہالی وڈ تشریف لے گئے۔ اور یورپ کے بارے میں بنائی جانے والی فلموں میں چینی رکشا والے، ہندوستانی فقیر، قلی اور سپیرے اور عرب بدو کے ایک ایک، دو دو منٹ والے رول بخیر و خوبی ادا کرتے رہے۔ اور ایک ریستوران میں ویٹر بن گئے۔ ایک مشہور فلم پروڈیوسر کی کروڑ پتی بیوہ اس جگہ کبھی کبھی کھانا کھانے آیا کرتی تھی۔ وہ لاولد اور بے حد بوڑھی عورت تھی، جسے آنکھوں سے بھی

کم سجھائی دیتا تھا اور وہ بے   . ورلی ہلس پر اپنے شاندار محل میں شدید تنہائی میں زندہ تھی۔ ہالی ووڈ حسن اور جوانی کا پجاری ہے۔ ایک اَٹھتر سال بوڑھی اور اندھی عورت سے دو منٹ بات کرنے کا بھی وہاں کسی کے پاس وقت نہ تھا۔ جب وہ ریستوران میں آ کر کونے پر اپنی خاص میز پر بیٹھ جاتی، تو اقبال بھائی بڑی محبت سے اُس کی مزاج پُرسی کرتے۔ بوڑھی ان کی بے حد شکر گذار ہو گئی۔ اور اُس سے اُن کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ پھر وہ اکثر اُن کے یہاں جاتے اور اُسے اخبار اور رسالے پڑھ کر سناتے۔ اس بوڑھی کی کمپنیں اپنی غرض کے لئے بھاری تنخواہ لیتی تھی۔ اقبال بھائی محض جذبۂ انسانیت کی بنا پر اس کے پاس بیٹھے رہتے۔ آخر اُس نے اصرار کیا کہ وہ اس کے ساتھ چل کر رہیں۔ چنانچہ اقبال بھائی بے ورلی ہلس کے اس محل میں رہتے ہیں۔ اور بوڑھیا شاید قانونی طور پر ان کو اپنا بیٹا بنانے والی ہے۔

"اقبال بخت کی داستان . . . . ." یہ ساری کہانی سن کر کسی نے کہا "کامیابی کی کلاسک داستان ہے۔"

چھ مہینے بعد ایک اور صاحب واپس آئے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے اقبال بھائی کو اسی ریستوران میں ویٹر کے یونیفارم میں دیکھا۔ تب یہ معلوم ہوا کہ اس کروڑپتی بوڑھیا کا انتقال ہو گیا۔ اُس نے اپنی ساری جائداد پیرس کے کسی سبزی فروش کے نام چھوڑ دی ہے۔" اقبال بھائی اپنے ریستوران میں

ویٹر کے کام پر واپس آچکے ہیں۔

آج تیسرے پہر شاردا مہتا کے گھر کے سامنے سے گزر رہی تھی کہ اُس نے آواز دے کر مجھے روک لیا۔ وہ اسی وقت کار میں سوار ہو رہی تھی۔ "کہاں جا رہی ہو؟" اُس نے پوچھا۔

میں نے بتایا "میں بھی اسی طرف جا رہی ہوں۔"

"آؤ تم کو راستے میں اتار دوں گی۔ ست سنگ کا وقت تین بجے تھا۔ مجھے دیر ہو گئی۔"

شاردا مہتا ایک سیدھی سادی، نارمل، مذہبی قسم کی ہاؤس وائف ہے۔ جب سے اُس کی اکلوتی لڑکی کو پولیو ہو گیا ہے تب سے پوجا پاٹ، مندروں، یاتروں، سادھو سنتوں، پیروں فقیروں، درگاہوں اور منتوں مرادوں کا سلسلہ اس کے یہاں بہت ہو گیا ہے۔

اپ نگر میں پہنچ کر ایک گجراتی سیٹھ کی شاندار عمارت میں شاردا کی کار داخل ہوئی۔ ست سنگ ختم ہو چکا تھا۔ "ارے ست سنگ ختم ہو گیا ـــــ!" میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں، میں گرو جی کے درشن تو کر لوں گی۔ وہ کل امرناتھ جا رہے ہیں۔ مجھے پانچ منٹ لگیں گے۔ تم بھی اُتر آؤ ـــــ" اس نے جواب دیا۔

سامنے برآمدے میں ایک غیر ملکی خاتون سفید ساڑھی پہنے، چندن کا بڑا سا ٹیکا ماتھے پر لگائے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھی چند خواتین کو گیت کا پاٹھ پڑھا رہی تھیں۔ اُن کی عمر چالیس پینتالیس کی رہی ہو گی۔ اور بول چال سے امریکن معلوم ہوتی تھیں۔ شاردا نے نزدیک جا کر ان کو پرنام کیا۔ "یہ ماتا جی ہیں" اُس نے چپکے سے مجھے بتایا۔ اور مجھے اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

کمرے میں سفید چاندنی بچھی تھی۔ جس پر جا بجا گیندے کے پھول اور گلاب کی پنکھڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ شردھالو ابھی اٹھ کر گئے تھے، اس لئے چاندنی پر سلوٹیں پڑی تھیں۔ کھڑکیوں میں تازہ پھول سجے تھے۔ لوبان جل رہا تھا۔ ایک طرف ہارمونیم کھڑتالیں اور تانپورے رکھے تھے۔ بیچ میں چندن کی چوکی پر سفید براق کپڑے پہنے کھچڑی بالوں کی لٹیں کندھے پر چھٹکائے گروجی بیٹھے تھے۔ وہ خاموش بیٹھے دریچے سے باہر دیکھ رہے تھے مجھے یہ دیکھ کر قطعی تعجب ہوا کہ وہ اقبال بھائی تھے۔

انہوں نے شاید ایک بار پھر مجھے نہیں پہچانا۔ یا پہچانا تو ظاہر نہیں کیا چند لمحوں تک ٹکٹکی باندھے وہ مجھے دیکھتے رہے اور پھر اسی طرح خلا میں نظریں جما دیں۔

شاردا نے جھک کر بڑی شردھا سے اُن کے پاؤں چھوئے۔ اور مجھے

ہٹی۔ اور اُس نے آنکھوں سے مجھے اشارہ کیا کہ میں اُس کے ساتھ باہر چلوں۔ لیکن شاروا کو یہ دیکھ کر بے حد تعجب ہوا کہ میں آہستہ سے آگے بڑھی اور میں نے جھک کر گروجی کے چرن چھوئے۔

بچپن میں اقبال بھائی نے میرے کان اینٹھے تھے۔ مجھے ڈانٹ ڈانٹ کر انتہائی سخت گیری سے پڑھنا لکھنا سکھایا تھا۔ اور اُستاد کا رتبہ ماں باپ کے برابر ہوتا ہے۔ وہ دنیا کے لئے جانے کس چکر میں کس طریقے سے گروجی بن گئے تھے۔ لیکن اُن کو گروجی سمجھنے کا حق صرف مجھ کو پہنچتا تھا۔

اُنہوں نے ہاتھ اُٹھا کر خاموشی سے مجھے آشیرواد دیا۔ اور اسی طرح سامنے کی طرف دیکھتے رہے۔ میں نے دبے پاؤں دہلیز تک پہنچ کر چپل پہنی، اور شاروا کے ساتھ باہر آگئی۔

اب مردوں اور عورتوں کی ایک قطار درشن کے لئے اندر جارہی تھی۔

اب برآمدے سے اُترتے ہوئے میں نے سوچا کہ اگر میں ان سے سوال کرتی "اقبال بھائی آپ نے اب کی مرتبہ اتنا لمبا چوڑا فراڈ کیوں کیا؟ تو وہ جواب دیتے ــــ "دیکھ منّی! دنیا سکون کی تلاش میں دیوانی ہوگئی ہے۔ اگر میں اس بھیس میں چند دکھی روحوں کو تھوڑی سی شانتی دے سکتا ہوں تو اس میں میرا کیا ہرج ہے؟"

اور کیا معلوم اقبال بھائی خود بھی نجات کے راستے پر پہنچ گئے ہوں۔

اور اپنے دل کا بھید وہ خود جانیں ۔ دوسرے جاننے والے کون ۔۔۔۔؟

فن کار

بڑی بڑی آنکھوں والے خوش شکل نوجوان نے گھسی ہوئی بشرٹ میلی پتلون اور شکستہ جوتے پہن رکھے تھے۔ اس نے ریستوران کے اندر جا کر کاونٹر کے پیچھے بیٹھے ہوئے ایرانی سے کچھ دریافت کیا۔ ایرانی نے انکار میں سر ہلا دیا تو نوجوان نے خاموشی سے چار مینار کا ایک پیکٹ خریدا اور کچھے برآمدے کی ایک بنچ پر بیٹھ کر سامنے کی رونق دیکھنے لگا۔

برآمدہ دراصل ایک بڑا سا چھپر تھا، لیکن اندر پختہ ہال کی دیواروں پر سبز رنگ کے ٹائل لگے تھے اور ایک بڑے سے آئینے پر ایک بے حد بھدی اور بھیانک "سینری" پینٹ کی گئی تھی ــــ سنگِ مرمر کی گندی میزوں پر زائرین ناشتہ کرنے میں مصروف تھے۔ اور ایک کونے میں "لوائے" ایک

گندے پانی کی بالٹی میں پلیٹیں ڈبو ڈبو کر نکال رہا تھا۔ چھپر کے باہر پہاڑی کے دامن میں موٹریں، لاریاں اور ڈانڈیاں کھڑی تھیں۔ سرخ مٹی کے کچے راستے پر بگولے اڑ رہے تھے۔ اور سامنے پہاڑی کی تین مہیب چوٹیاں دھوپ میں چمکنے لگی تھیں۔

اس وقت صبح کے نو بجے تھے۔

نوجوان کی نظریں منظر کا جائزہ لیتے لیتے مس موہنی بالا پر جا کر رکیں۔ جو اپنی طویل کار سے ڈانڈی میں سوار ہو رہی تھی۔ اس کی فربہ ممی نے ٹفن باسکٹ اٹھا رکھی تھی۔ دوسری ڈانڈیوں میں بوڑھے پارسی اور بیمار یاتری سوار ہو رہے تھے۔ بیشتر زائرین جوق در جوق پہاڑ کی سیڑھیاں چڑھنے میں مصروف تھے۔ لاریوں کے اڈے اور پہاڑیوں کے درمیان ایک جوہڑ سا تھا۔ جس میں پتھروں کی پگڈنڈی بنی تھی۔ ایک بے حد لمبے قد کا "زنانہ" سرخ بال کندھے پر چھٹکائے پگڈنڈی کے وسط میں کھڑا تھا۔ مس موہنی بالا کی ڈانڈی جب اس کے پاس سے گزری تو اس نے ہاتھ مٹکا کر کہا ـــــ مراد پوری ہونے پر پورے سو روپے لوں گی"۔

موہنی بالا سہم کر اپنی جاپانی چھتری کی اوٹ میں چھپ گئی ـــــ نوجوان سگریٹ پھینک کر چھپر سے نکلا اور ڈانڈی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

پہاڑی کے نیچے سیمنٹ کا نیا راستہ بن رہا تھا درگاہ کے برہمن مجاور پھاٹک کے پاس کرسی پر بیٹھے زائرین کو انگریزی کا پمفلٹ دیتے جا رہے تھے جس میں سڑک پکی بنانے کے لئے عطیوں کی درخواست کی گئی تھی۔

نوجوان نے پھاٹک میں داخل ہو کر سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کیا۔ یہاں سے پہاڑی کے گھنے جنگل میں بنی ہوئی فقیروں کی صاف ستھری جھونپڑیاں شروع ہوتی ہیں۔ جن کے سامنے مقدس تصاویر، مالائیں اور تسبیحیں بک رہی تھیں۔ ایک فقیر نے ایک تین سالہ بچے کو شیو مہاراج کے بھیس میں ایک چٹان پر بٹھا رکھا تھا۔ بچہ بڑے صبر سے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ سیڑھیوں کے دونوں جانب ان گنت کوڑھی صدائیں لگا رہے تھے۔ جھونپڑیوں کے مختصر برآمدوں میں کاسے رکھے تھے۔

ایک زمانہ تھا جب وہ کالج میں پڑھتا تھا۔ اور سوچا کرتا تھا کہ ہیرو بنے گا اور مس موہنی بالا۔ کا لیڈنگ مین کہلائے گا۔ یہ بچگانہ خواب تو خیر بہت جلد ٹوٹ گیا مگر آج اس وقت بے ضرر سا تعاقب کرنے میں کیا حرج تھا۔؟ لہٰذا وہ ڈانڈی کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

کوڑھیوں کی اس افراط کے علاوہ جو وطن عزیز کے دو بڑے فرقوں، ہندو اور مسلمان سے تعلق رکھنے کا فخر رکھتے تھے۔ پہاڑی پر ہر وضع کا اپاہج موجود تھا اندھے، لنگڑے، لولے، لنجے اور ایسے بھکاری اور بھکارنیں جن کے محض دھڑ ہی سالم تھے۔ چٹانوں پر آڑھے ترچھے لیٹے صدائیں لگا رہے تھے۔ لمبے چوغے والے آنکھوں میں سرمہ لگائے، ہزار دانہ تسبیح پھراتے قلندر، مجذوب، بھنگ کے نشے میں مگن سادھو، فقیروں کی یہ عظیم الشان "کامن ویلتھ" یقیناً لرزہ خیز اور

حیرت انگیز تھی۔ یاتریوں کی قطاروں میں سندھی تاجر اور جاریٹ نائلوں کی ساڑھیوں میں ملبوس ان کی خواتین۔ ٹرانزسسٹر سنبھالے بانکے، چھیلے لڑکے بوہرے، خوجے، پارسی، گجراتی، مرہٹے، پنجابی، ہندو اور مسلمان سب ہی رواں دواں ہانپتے کانپتے، بھکاریوں کے سامنے سکے پھینکتے، چوٹی کی طرف چڑھنے میں منہمک تھے۔

اوپر جاکر جنگل گھنا ہو گیا تھا۔ ایک ریستوران میں چند منٹ سستا کر نوجوان پھر آگے بڑھا۔ ہر کٹھن چڑھائی کے بعد صاف ستھرے چائے خانوں میں زائرین کے گروہ چائے اور شربت سے تازہ دم ہونے میں مصروف تھے۔ نیچے گہری گھاٹیاں تھیں، اور لق ودق میدان، کھیت بہت دور عظیم الشان شہر تھا اور سمندر اور ساری دنیا موہنی بالا کی ڈانڈی اب نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ ایک ریستوران میں قوالی ہو رہی تھی۔ چاروں طرف درختوں میں چاند تارے والے ہرے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ نیچے ایک جھرنا گر رہا تھا۔ ایک کوڑھی چٹان پر لیٹا اپنے زخمی ہاتھوں سے روٹی کھانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ نوجوان چڑھائی طے کرتا رہا۔ اچانک ایک بھیانک آواز اس کے کانوں میں آئی۔

"بڑے بڑے سیٹھ آئے۔ ہُو ــــــ بڑے بڑے صاحب آئے ــــــ ہُو ــــــ بڑے دھنی آئے ہو ــــــ" یہ صدا چٹانوں سے ٹکراتی اور گونجتی اور بہت دور سے آ رہی تھی اور اس کی یکسانیت .... ہولناک تھی۔ نوجوان نے متحیر ہو کر اسے سنا اور پھر آگے بڑھا۔

بہت سے موڑوں سے گزرنے کے بعد اس آواز کا سرچشمہ اچانک اس کے سامنے آگیا۔ وہ ایک بے حد لمبا فقیر تھا۔ جو شاید اپنی پلکیں بھی نہیں جھپکاتا تھا اور ایسا لگ رہا تھا گویا کسی قدیم مصری ممی کو سیدھا کھڑا کر کے اس میں کوک بھر دی گئی ہو۔ اور وہ ممی۔ بے تکان رٹے جا رہی ہو—— بڑے بڑے سیٹھ آئے ہو—— بڑے بڑے——" اس نے گیروا چوغہ پہن رکھا تھا اور ایک اونچی خطرناک اور تنہا چٹان پر ڈنڈا سنبھالے اس طرح کھڑا تھا جیسے زائرین کے مقدر میں جو کچھ لکھا ہے اس کا پیغامبر ہو۔ یاتریوں کا جلوس چٹان کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ لمبے فقیر نے چند غریب یاتریوں کو نگاہِ غلط انداز سے دیکھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ایک ہائی کلاس اور نگ چڑھا فقیر تھا اور ایک منفرد تکنیک اور شخصیت کا مالک ہونے کی وجہ سے ہما شما کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

پہاڑی کا راستہ ابھی آدھا طے ہوا تھا۔ ذرا اوپر جا کر نوجوان کو چند خوش باش بچیاں نظر آئیں جو سیڑھیوں کے کنارے کھیل کود میں مشغول تھیں۔

"اری کم بختو—— کام کا وقت آگیا——" ان کی ماں نے جو دوسری چٹان کے نیچے کاسہ لئے بیٹھی تھی۔ زور سے انہیں ڈانٹا—— ٹکڑا اور خالی ٹین کے ڈبے نکالے اور چٹائی کنارے پر بچھا کر ہاتھ پھیلا دئے—— نوجوان کو یہ منظر دیکھ کر بے اختیار ہنسی آگئی—— بچیوں کی چودہ پندرہ سال بڑی بہن نوجوان کو ہنستا دیکھ کر بُرا مان گئی۔ اور ہونٹ نکال کر بسورنے لگی۔ نوجوان نے

دس پیسے اس کے سامنے پھینکنے اور سوچ میں ڈوبا آگے بڑھ گیا — اگلے ریستوران میں پہنچ کر اس نے لیمونیڈ کی ایک بوتل خریدی اور چھوکرے سے کہا کہ اسے نیچے لڑکی کو دے آئے۔ پھر وہ اور آگے بڑھا۔ راستے کے ڈھال پر ایک جھونپڑی نظر آ رہی تھی نوجوان اس کے نزدیک ایک پتھر پر سستانے کے لئے بیٹھ گیا۔ جھونپڑی میں ابھی صبح ہو گئی تھی خاتون خانہ چائے کے برتن دھو رہی تھیں۔ اس کا کام فارغ ہو کر انہوں نے ایک ٹرنک میں سے ایک چیتھڑا ساڑی نکالی۔ اپنی ثابت ساڑی اتار کر گوڈر زیب تن کیا اور ایک رکابی میں سے بکری کا خون انگلی پر لے کر چہرے اور باہوں پر زخموں کے نشان بنائے اس دوران میں صاحب خانہ اپنے پیروں پر گندی پٹیاں باندھ چکے تھے پھر شہتیر میں سے بیساکھی اتار کر انہوں نے اپنے نونہالوں کو آواز دی — "منگو — چھنگو — شبراتی — ارے شبراتی بے غیرت کہاں ہے؟"

ایک دس سالہ لڑکا موہنہ پھلائے جھونپڑے کے پچھواڑے بیٹھا گٹکے کھیل رہا تھا۔

"ابے آج کیا دھندے پر نہیں جانا؟" والد نے گرج کر پوچھا۔

"ابا — ابا — یہ شبراتی کا بچہ کہتا ہے کہ آج سے بھیک نہیں مانگوں گا۔ اسکول میں پڑھے گا اور کام کرے گا" بڑے لڑکے نے اندر سے آواز لگائی۔

والد نے باہر آ کر لڑکے کے ایک تھپڑ رسید کیا۔ حرام زادے موالی۔ کبھی

تیسرے باپ دادا نے بھی کام کیا تھا جو تو کام کرے گا؟ بدمعاش ایک اور تھپڑ پڑا تو بچے نے موہنہ پھاڑ کر رونا شروع کیا متحیر نوجوان کو جھاڑی میں سے جھانکتا دیکھ کر اچانک والدہ دہاڑیں "——ارے کون ہے رے؟"

"کچھ نہیں بڑی بی——ذرا سستا رہا تھا——" نوجوان نے گھبرا کر جواب دیا۔

"بڑی بی! ارے بڑی بی ہوگی تیری اماں بھیا جوانا مرگ میں تجھے بڑی بی دکھائی دیتی ہوں؟ صبح صبح آ کر پرائی بہو بیٹیوں کو تاکتا ہے۔ آگ لگے تجھے——"

"اری نیک بخت، چپ ہو جا اب۔ معقولیت پسند صاحبِ خانہ بیوی کو سمجھایا اور کراہتے ہوئے باہر نکلے۔

نوجوان لپک کر پہاڑ کی چوٹی کی طرف بڑھ گیا۔

اب گہما گہمی بہت بڑھ گئی تھی۔ روضہ بالآخر قریب آ چکا تھا۔ چائے خانوں میں بے حد رونق تھی پھولوں اور ہاروں کی دوکانیں خوشبو سے مہک رہی تھیں بڑی بڑی دوکانیں دلوتاؤں کے مدینے اور اس درس گاہ کی رنگین تصاویر، دیگر تبرکات اور اگربتیوں کے رنگین پیکٹوں سے جگمگا رہی تھیں۔ گلیوں میں تازہ چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ لنگر تقسیم ہونے والا تھا۔ فوجی نوجوانوں کی ایک ٹولی "حاجی بابا کی جے" کے نعرے لگا رہے تھے۔ دوسری طرف سے اسکول کے بچیوں کا ایک گروہ آ رہا تھا۔ ان کے ماسٹر دھوتی باندھے، ماتھے پر تلک لگائے "حاجی بابا کی جے بولتے اوپر چڑھنے لگے۔

مزار کے صحن میں بھیڑ لگی تھی۔ عود و لوبان سے بوجھل اس فضا میں برہمن۔ مجاور کی لڑکیاں نو گزی مرہٹی ساڑیاں پہنے روضے کی کنجیاں سنبھالے ایک نقشین دروازے سے نکل کر دوسرے دروازے میں داخل ہو گئیں ـــــ نوجوان جو خود کو ملحد سمجھتا تھا صحن سے نکل روضے کے عقب میں جا نکلا۔ جہاں گھنے درختوں کی چھاؤں میں چند مزار تھے۔ اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ پہاڑی کے پیچھے ڈھال پر درختوں کے کنج میں چھپی ہوئی کٹیوں میں مسلمان بزرگ اور ہندو یوگی خاموشی اور گمنامی کے عالم میں عبادت اور مراقبے میں مصروف تھے۔ نوجوان کو پھریری سی آئی۔ ایک دنیا یہ بھی ہے۔ اس نے سوچا۔

"تم چوٹی پر پہنچ کر بہت حیران سے نظر آتے ہو۔ کسی نے اسے مخاطب کیا۔ اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ نورانی چہرے اور سفید داڑھی والے ایک بزرگ نے ایک کٹیا سے نکل کر پہاڑی چشمے کی طرف جاتے ہوئے اس کے سامنے ٹھٹھک گئے تھے۔ ان کے پس منظر میں ایک مہیب چٹان استادہ تھی۔

"جی ـــــ جی نہیں تو ـــــ" نوجوان نے ذرا جھینپ کر کہا۔ مگر یہ پہاڑ خاصہ حیرت انگیز ہے۔

"دنیا کی کون سی چیز حیرت انگیز نہیں ـــــ زندگی، موت، دکھ، سکھ، عورت، مرد، ہر شے پُراسرار ہے اور موت کا نقارہ دن رات بج رہا ہے۔

"پھر کرنا کیا چاہیئے۔

"بے تعلقی ــــــــ"

نوجوان نے ایک لمحے کے لئے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور اس کی ویران زندگی سراب کے ریلے کے مانند اس کے سامنے سے گزر گئی۔ وہ کالج سے نکل کر کلرک بھی نہیں بن سکا تھا۔ اور اس کے بچپن کی محبوبہ کانتا دیوی کے نام سے مشہور ہیروئن بن چکی تھی۔ وہ اپنا قصبہ چھوڑ کر اس کے پیچھے اس شہر تک آیا تھا مگر کانتا دیوی جواب وزیروں اور دوسرے "وی۔ آئی۔ پی" لوگوں سے کم رتبے کے لوگوں سے بات نہیں کرتی تھی۔ اسے پہچاننے ہی سے منکر تھی ہا ہتی کا بیتی وہ شہرت اور کامیابی کے پہاڑ کی اس چوٹی پر پہنچ چکی تھی۔ جہاں موہنی بالا پہلے سے براجمان تھی۔ ماضی کی وہ سیدھی سادھی لڑکی جو اب کانتا دیوی کہلاتی تھی اس کے شب و روز آج کل محض موہنی بالا کو نیچا دکھانے کی فکر میں گزر رہے تھے۔ موہنی بالا کی ممی اور مس کانتا دیوی کی ممی دونوں وقتاً فوقتاً پریس کو ایک نہ ایک بیان دیتی رہتی تھیں کانتا دیوی اس خستہ حال نوجوان کو جس سے کسی زمانے میں اسے خود بھی شدید عشق تھا۔ کب کا بھول چکی تھی۔

نوجوان نے آنکھیں کھولیں تو بزرگ عصا ٹیکتے چشمے کی طرف چل پڑے تھے۔

"سب دل کے بہلاوے اور پریوں کی کہانیاں ہیں ــــــــ"

نوجوان نے ذرا تلخی سے انہیں آواز دی۔

"کیا ——؟" انہوں نے ٹھٹھک کر دریافت کیا۔

"یہی سب —— یہ درگاہ۔ اور یہ سارا چکر —— بے تعلقی کا فلسفہ بھی میرے لئے اتنا ہی بے معنی ہے۔ جتنی یہ روایت کہ یہ پہاڑ حاجی بابا کے ایک نعرے سے تین حصّہ زمین میں دھنس گیا تھا۔

بزرگ نرمی سے مسکرانے لگے۔ نوجوان کو احساس ہوا کہ وہ ان کے ساتھ بے ادبی سے پیش آیا ہے۔ آخر بوڑھے آدمی تھے لہذا ان کا دل رکھنے کے لئے اس نے کہا" وہ سامنے والی چوٹی کیسی ہے؟

بڑی عجیب سی شکل کی چٹان ہے۔ جیسی دیوتی بیٹھی ہو۔

"یہ چٹان بھی" بزرگ نے جواب دیا پہلے ایک عورت تھی پھر وہ درختوں میں غائب ہو گئے۔

نوجوان گہرا سانس لے کر پھر پہاڑی کے بارونق حصّے کی طرف مڑا اب ایک شخص نے جسے نوجوان مجاور سمجھا اس کا پیچھا کیا۔

"آپ یہاں کے مجاور ہیں؟ مگر افسوس ہے کہ میرے پاس نذر دینے کے لئے کچھ نہیں" نوجوان نے کہا۔

"مجاور میں نہیں ہوں صاحب۔ اگلے وقتوں کے برہمن راجہ کی اولاد یہاں کی مجاور رہے —— ماچس ہو گی۔؟"

نوجوان نے سگریٹ کا سارا پیکٹ اسے تھما دیا۔

" صاحب ـــــ" اس آدمی نے نوجوان کو ذرا غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اگر بھوک لگی ہو تو چل کر لنگر میں کھا لیجئے۔ میں بھی ادھر ہی جا رہا ہوں۔

نہیں نوجوان نے تقریباً گرج کر جواب دیا۔

" آپ بڑے پریشان سے نظر آ رہے ہیں" اجنبی نے ڈھٹائی سے کہا۔ نوجوان نے غیر ارادی طور پر اپنی پتلون کی جیب پر ہاتھ پھیرا۔ مگر فاؤنٹین پن ابھی باقی تھا۔

" کبھی صندل کے موقعے پر آیئے ـــــ" اجنبی کہتا رہا۔ شاید نوجوان نے اسے غلط سمجھا تھا ـــــ"

" بابا کی پالکی سارے پہاڑ کا گشت لگاتی ہے۔ بڑی زبردست آتش بازی ہوتی ہے، رات کو شیر ببر آتا ہے۔ ہندو مسلمان بڑی عقیدت سے حاضری دیتے ہیں ـــــ"

یہی مسلمان ہندو شہر واپس جا کر بلوہ ہوتا ہے تو ایک دوسرے کو چھرا بھی مارتے ہیں ـــــ نوجوان نے بے حد اکتا کر کہا۔ اور جلدی سے واپس مڑ گیا۔ اجنبی سر ہلا کر آگے بڑھا اور ایک موٹی سیٹھانی کے تعاقب میں معروف ہو گیا۔

" جانے کون تھا یہ شخص۔ میری طرح بے کار، آوارہ، بے مقصد ـــــ کیا عجب جگہ ہے یہ فقیروں کی پہاڑی ـــــ کمال ہے ـــــ"

نوجوان نے سوچا۔

پہاڑی سے اُترتے وقت مصری ممی یعنی لمبے فقیر کی آواز اسی طرح سنائی دی۔ راستے پڑتا ہوا اس کا سایہ ڈوبتے سورج کی روشنی میں اب بے حد طویل اور لرزہ خیز معلوم ہو رہا تھا۔ دوسرے فقیروں کی چادروں پر سکوں کی اب ڈھیریاں بن چکی تھیں۔ یاتری تھکے ہارے، بیمار مضطرب آسودہ، صحت مند، مسرور، پر اُمید اور جذبۂ عقیدت سے سرشار اب قطار اندر قطار واپس اتر رہے تھے۔ نوجوان جو اب بہت زیادہ تھک چکا تھا۔ نشیب میں اتر کر ایک مختصر سی خاصی آرٹسٹک جو نپڑی کے برآمدے میں ٹک گیا۔ جس کے کنارے پر کاسہ بڑی نفاست سے رکھا تھا۔ سرمگیں آنکھوں اور سرخ داڑھی والے ایک بڑے میاں کشکول کے پیچھے بیٹھے تھے۔ انہوں نے لیمن ڈراپس تباشوں اور چنوں کا ایک بہت ہی مختصر سا خوانچہ بھی لگا رکھا تھا۔ ایک سفید صاف ستھری تولیہ کھونٹی سے ٹنگی تھی۔ اندر سے ایک جوان عورت ساری سے سر ڈھانپے برآمدے میں آئی اور کاسے کے پیچھے گویا اپنے آفس ڈیسک پر بیٹھ گئی۔ اندر تیل کے اسٹوو پر کیتلی چڑھی ہوئی تھی۔

"آپ یہاں کب سے ہیں" نوجوان نے دو آنے کے چنے خریدتے ہوئے دوستانہ لہجے میں سرخ داڑھی والے سے دریافت کیا۔

"بیس سال ہو گئے۔"

"آمدنی اچھی ہوتی ہے ؟ میرا مطلب ہے آپ کی اس دوکان سے"

"مہنگائی اتنی بڑھ گئی ہے" "مگر اللہ کا شکر ہے" نوجوان پر شک بھری نظر

ڈال کر انہوں نے جواب دیا۔

"آگ لگے اس آمدنی کو ——" جوان عورت بڑبڑائی۔

سرخ داڑھی والے نے مسکرا کر عورت کو دیکھا —" یہ میری دوسری زوجہ ہیں۔ یہاں ان کا دل گھبراتا ہے کہتی ہیں شہر میں چل کر رہو۔"

"برسات میں یہاں مشکل پڑتی ہو گی ——" نوجوان نے اظہار خیال کیا۔

"جی ہاں برسات میں زائرین بھی نہیں آتے۔ اور سانپ بچھو بھی بہت ہوتے ہیں میری جوان بیاہی لڑکی کا انتقال ہو گیا پچھلے سال تب سے میرا دل بھی یہاں سے اُچاٹ ہو گیا ہے۔ مرحومہ سامنے والی جھونپڑی میں رہتی تھی میں نے بیاہ کر کے رخصت کیا بھی تو اس طرح کہ نظروں کے سامنے رہے۔ کلیجے کو ٹھنڈک رہے

ایک بچہ اپنی نشانی چھوڑا غریب نے۔"

انہوں نے ایک چھنگلیا سے پلکیں خشک کیں۔ گھنے اندھیرے درختوں میں بسیرا لینے والے پرندوں نے چہچہانا شروع کر دیا تھا۔

نوجوان بہت متاثر ہوا۔ شاید مدتوں سے "باہر کی دنیا" کے کسی فرد نے اس طرح بیٹھ کر اس بڑھے شخص سے اس کا دُکھ درد نہ سنا تھا۔

"ارے —— محمد اکرم ——" بوڑھے نے آواز دی پھر نوجوان سے کہا۔

"میری بچی کا شوہر —— جی ہاں —— وہ بھی —— یہی کام کرتا ہے ——"

سامنے کی جھونپڑی سے گیرواکرتا پہنے تسبیح پھراتا اور ذرا لنگڑاتا ایک جوان

اور بے حد صحت مند فقیر قریب آیا۔ اس نے بھی نوجوان کو شبہ کی نظروں سے دیکھا مہدی رچی داڑھی والے بڑے میاں نے بیوی کو اشارہ کیا۔ وہ اندر سے چائے بنا کر لائی اور ایک پیالی نوجوان کو پیش کی۔

ایک بیس اکیس سالہ خاصی خوب صورت لڑکی چار سالہ بچہ گود میں اٹھائے درختوں میں سے نمودار ہوئی۔ اور سرخ پٹوں والے کو مخاطب کیا۔

"لو سنبھالو اپنے نواسے کو ماموں۔ میں روٹی پکانے جا رہی ہوں۔ مبارک ہو آج نواسے نے تین روپے کمائے ہیں۔

لڑکی نے بچے کو سائبان میں لٹا کر بڑے سلیقے سے ڈیڑھ روپے کی ریزگاری ماموں کے حوالے کی اور ڈیڑھ روپیہ ساری کے آنچل میں باندھ کر اٹھلاتی ہوئی نیچے اتر گئی۔

"سارا کنبہ یہی ہے ماشاء اللہ" نوجوان نے ذرا رشک سے پوچھا۔

"جی ہاں یہ میری بھانجی تھی۔ بڑی سگھڑ بچی ہے۔ میری ہمشیرہ اور بہنوئی، وہ نیچے والی جھونپڑی میں رہتے ہیں ——— بہنوئی ——— نابینا ہیں۔"

نوجوان اٹھ کھڑا ہوا اور اس مہربان اور ہنر مند کنبے کو خدا حافظ کہہ کر اور نیچے اترا۔

سورج کی نرم اور ترچھی کرنوں نے ڈالیوں میں چھن چھن کر ماحول کو دفعتاً زیادہ پُراسرار بنا دیا تھا۔ فقیر اپنے مقررہ ٹھکانوں سے اٹھ رہے تھے ———

چٹائیاں لپیٹی جا رہی تھیں۔ کوڑھی اور اپاہج اسی طرح پڑے تھے۔ اتنے میں ایک مرہٹی عورت اُودا کاشٹہ باندھے کیک بسکٹ کا بکس سر پر اٹھائے تیز تیز قدم رکھتی پگڈنڈیوں پر نمودار ہوئی۔ ہر بھکاری کے سامنے جا کر بکس اتارا۔ بھکاریوں نے خاموشی کے ساتھ اس سے سستی خشک ڈبل روٹیاں اور بسکٹ خریدے عورت نے ان سے پیسے لئے اور دوسرے فقیروں کی طرف چلی گئی۔

چنانچہ سب ہی خوش حال نہیں تھے۔ بیشتر اپاہج خشک باسی ڈبل روٹی پر گزر کر رہے تھے۔

نوجوان آخری سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے پہنچا ایک بار پلٹ کر اس نے پہاڑی پر نظر ڈالی۔ اور باہر نکلا جبر ٹہر کے پرے، سرخ بالوں والا زنانہ ایک بنچ پر بیٹھا چپ چاپ چائے پی رہا تھا۔ موٹر بس اور لاریاں روانہ ہو رہی تھیں دھوبنی بالا بھی کب کی غائب ہو چکی تھی، کل صبح تک کے لئے پہاڑی خاموشی اور ..... اندھیرے میں ڈوب رہی سی۔

نوجوان نے پنواڑی کی دوکان سے دس پیسے کا ان لینڈ لیٹر خریدا اور ریستوران کے بڑے چھپر میں پہنچ کر بنچ پر بیٹھ گیا۔ اور خط لکھنا شروع کیا۔

والدہ صاحبہ تسلیم

مجھے اطلاع ملی تھی کہ یہاں ایک ریستوران میں۔ کیشیر کی جگہ خالی ہے لیکن صبح جب میں یہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ جگہ بھر چکی ہے۔

بہرحال آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اس شہر میں تین سال تک بیکار رہنے اور دھکے کھانے کے بعد آج بالآخر ایک نہایت ہی اچھا کاروبار میری سمجھ میں آگیا ہے، بہت آرام وہ کاروبار ہے آمدنی بھی امید ہے معقول ہوگی قیام و طعام کا انتظام مناسب اور فضا بارونق ہے۔ میرے رفیق کار۔ ہنرمند۔ اہل فن بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ سچے فنکار ہیں۔

اپنا پتہ آئندہ خط میں لکھوں گا

آپ کا تابعدار بیٹا

چند روز بعد "مصری ممی" نے بڑے غصے سے دیکھا کہ مقابل کی چٹان پر ایک سیاہ داڑھی مونچھ اور پٹوں والے بارعب فقیر کا مسکن بن چکی ہے جو لمبا کرتا اور سفید کنٹوپ پہنے تسبیح ہزار دانہ پھیرتے ہوئے گرج دار آواز میں لگ چکا ہے۔ جب سیٹھوں کی ٹولی سامنے سے گزرتی ہے تو وہ ولدوز آواز میں

زر کی جو محبت تجھے پڑ جائے گی بابا

دکھ اس میں تری روح بہت پائے گی بابا

پڑھتے ہیں۔ عوام کے لئے۔

دنیا کے انہیں فنوں میں یاں کس کا رہا ڈنکا

نت بھنگ پی اور عاشق دن رات بجا ڈنکا

موجود ہے، اپٹرڈیٹ یا تریوں کے سامنے بے نقط کی اڑنگ بڑنگ انگریزی اڑانا شروع کر دیتے ہیں اور دفعتاً جب جذب طاری ہوتا ہے تو نعرہ لگاتے ہیں۔

سب بکواس، کھائے گھاس۔ کردوں تیرا ستیاناس۔ پلادوں جوتے کا مکسچر — بولو کون بھوانی —"

نوچندی جمعرات کو جب مس کانتا دیوی درگاہ جاتے ہوئے سامنے سے گزریں۔ تو شاہ صاحب ڈنڈا ہوا میں لہرا کر حسبِ عادت چلائے۔

" بولو کون بھوانی —" کانتا نے دہل کر سر اٹھایا اور اوپر اونچی چٹان پر کھڑے شاہ صاحب کو دیکھا۔

شاہ صاحب فرماتے رہے،" ایمان پاک آدمی بے باک — حق اللہ — پاک ذات اللہ —"

کانتا دیوی ایک کمزور دل آدمی تھیں۔ ذرا سہم کر آگے بڑھنے لگیں۔ تو شاہ صاحب گرجے" احد ہما الابنلا بافراط خاصتہ من الشراب۔

— کھڑا کھیل فرخ آبادی —"

کانتا دیوی لرز کر ٹھٹک گئیں ان کے سوا کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ ان کی ممی کسی زمانے میں فراخ آباد کی رنگریزن تھیں۔ کانتا دیوی سر ڈھانپ کر اور ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ اب شاہ صاحب پر حال آچکا تھا۔ اور وہ جھوم

جھوم کر قوالی کا ایک مصرع دہرا رہے تھے

اخلاص کے رنگ میں رنگ دے لکالال رے چُنریا

کانتا دیوی مبہوت ہو کر انہیں دیکھتی رہیں۔ شاہ صاحب نے ان کی طرف بے پرواہ ہو کر اپنی بڑ ہانکنی شروع کی "دریا کی لہر ——— اللہ کا قہر۔ ہنڈیا میں چڑھا۔ ہر دیگی چمچے کو مونہہ نہ لگا ——— جوتے کا مکسچر پلا ———"

مس کانتا کی آنکھیں بھر آئیں۔ ان کا سب سے بڑا پروڈیوسر جو ہر وقت ان کی خوشامد میں لگا رہتا تھا ان دنوں ایک بہت بڑی "پکچر کے لئے مس موہنی بالا سے کنٹریکٹ کر چکا تھا۔

شاہ صاحب نے سُریلی آواز میں یک لخت گانا شروع کر دیا۔

ہمارے شمس آباد میں دو گھوڑے رہتے تھے

ڈبکوڈبکو می کند۔ ازیک تو جبہ پار گُن

سمجھنے کے لئے مجذوب کا اشارہ کافی ہے۔ مس کانتا دیوی سر جھکا کر کھڑی ہو گئیں۔ تب شاہ صاحب نے آنکھیں کھول کر نعرہ لگایا۔

مچھلی بیچے گی "

"حضور، میرے لئے کوئی حکم ———؟" کانتا دیوی نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھائے بغیر پوچھا۔

"مچھلی بیچے گی؟" شاہ صاحب نے دہرایا

"کون حضور ——؟"

"وہی —— اور کون ——"

کانتا دیوی نے جلدی سے اُن کے پاؤں چھونا چاہا ہے۔ مگر انہوں نے پیچھے ہٹ کر کہا "دھت بھاگ جا عورتیا ——"

"شاہ صاحب ——"

"پیر ہٹیلے کا مُرغا ——"

"جی شاہ صاحب ——؟"

"پیر ہٹیلے کا مُرغا ——"

کانتا دیوی ایک لمحے کے لئے سوچ میں پڑ گئیں۔ مگر فوراً ہی انہیں یاد آیا کہ نرخ آباد میں ان کی محلے کی عورتوں کے وہاں بارہ مہینے نذر نیاز کا سلسلہ رہتا تھا۔ شیخ سدو کا بکرا —— پیر دین دار کا کونڈا —— مشکل کشا کا دونہ شہید کا ملیدہ —— حضرت عباس کی حاضری —— بی بی کی بڑیا —— پریوں کا طبق —— پیر ہٹیلے کا مُرغا —— کانتا دیوی کی ممی لطیفن لوا بھی ایک زمانے میں مسجد کے طاق بھرا کرتی تھیں۔ یورپ کے نئے نئے سفروں اور تعلمی مصروفیات سے بھرپور موجودہ زندگی میں مس کانتا دیوی کو یہ سب کہاں یاد رہ سکتا تھا۔ مگر شکر کہ اس وقت یاد آ گیا انہوں نے فوراً سو روپے کا نوٹ نکال کر شاہ صاحب کے قدموں میں رکھا ——

"بھگ جاؤ ربا ۔۔۔ ہٹ ہٹ ہٹ ۔۔۔" شاہ صاحب نے آنکھیں بند کر کے ڈانٹ بتائی۔ مس کانتا دیوی نے ادب سے ان کو تسلیم کیا۔ اور خوش خوش آگے چلی گئیں۔

تب شاہ صاحب نے اپنے فرغل کی جیب سے وہ نوٹ بک نکالی جس میں انہوں نے اپنی والدہ کو خط لکھ کر سارے پیروں کی نذر نیاز کی تاریخیں منگوا کر درج کر لی تھیں ۔۔۔ شاہ صاحب نے نوٹ بک کے ایک کالم میں ایک نشان بنایا اور پاؤں کے انگوٹھے کے ذریعہ نوٹ گدڑی کے نیچے سرکانے کے بعد بھجن گانے میں مصروف ہو گئے کیوں کہ مارواڑیوں کی ایک ٹولی اب پہاڑ کی سیڑھیاں طے کرتی اُوپر آ رہی تھی۔

یاد کی اِک دھنک جلے

جب کبھی میں آگ بجھانے والا انجن شہر کی سڑکوں پر سے گزرتا دیکھتی ہوں تو مجھے ناصر چچا یاد آجاتے ہیں۔ فائر بریگیڈ اور ناصر چچا بچپن سے میرے ذہن میں لازم و ملزوم ہیں۔

ناصر چچا مٹیا برج کلکتہ کے ایک ماضی پرست، قدامت پسند اور وضعدار خاندان کے ایک فرد تھے۔ وہ ابّا جان کے بہت پرانے دوست تھے۔ اور بے حد شگفتہ طبیعت اور بہت پڑھے لکھے انسان تھے۔ اُردو فارسی اور انگریزی ادبیات کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ اور فائر بریگیڈ کے محکمے میں ملازمت کرتے تھے۔

بمبئی میں فائر بریگیڈ کے ہیڈ کوارٹرز (شاید وہ ہیڈ کوارٹرز ہی تھے) کے اوپر ان کا بہت لمبا چوڑا فلیٹ تھا۔ جس طرح کے پرانی وضع کے فلیٹ ہوا کر

اب بمنٹ کے جگمگاتے ہوئے دس منزلہ رہائشی بلاک تعمیر کئے جا رہے ہیں۔

اس فلیٹ میں سیاہ و سفید چینی کے ٹکڑوں کی پچی کاری کا فرش تھا۔ اونچی چھتوں والے لق و دق کمرے اور لمبے لمبے برآمدے، جن کے چوبی جنگلے سبز روغن کے تھے۔ سامنے کے رخ پر سمندر تھا۔ جس میں رات کے وقت دور لائٹ ہاؤس کی روشنی جھلملاتی تھی اور پانی سے ابھری ہوئی اکا دکا بھوری چٹانیں اور پہاڑیاں نظر آتی تھیں۔ جن میں ایک زمانے میں پرتگال کے بحری قزاقوں کے اڈے تھے۔

ناصر چچا کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے اکلوتے بچے علی اصغر کی پرورش ایک گوانی آیا کے سپرد تھی۔ سعیدہ چچی بچے کو تین سال کا چھوڑ کر اللہ میاں کے گھر سدھاری تھیں۔ اور مرتے وقت اسے گریسی کو سونپ گئی تھیں اور اس سے کہا تھا کہ اگر تم اسے چھوڑ کر چلی گئیں اور کہیں اور نوکری کر لی تو قیامت کے روز تم سے پوچھوں گی۔

گریسی گہری سانولی رنگت اور مضبوط کاٹھی کی اڑتیس سالہ بختی اور وفادار صورت تھی۔ وہ بیس برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔ اور دس برس تک ادھر ادھر ٹھوکریں کھانے کے بعد ناصر چچا کے یہاں نوکر ہو گئی تھی اور آٹھ سال قبل جب سعیدہ چچی کلکتے سے بمبئی آئی تھیں تب سے وہ ان کے پاس ملازم تھی۔ ان کی آخری بیماری میں گریسی نے دن رات ایک کر کے ان کی خدمت کی تھی۔ اور ان کے انتقال کے بعد سے علی اصغر کو بے حد دلسوزی سے پال رہی تھی

اور اس پر جان چھڑکتی تھی۔

میرے اسکول میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں تو ایک مرتبہ ابا جان چند ہفتے کے لئے مجھے اپنے ساتھ بمبئی لے آئے اور جب ہم لوگ اسٹیشن سے ناصر چچا کے گھر پہنچے تو گریس نے انتہائی جوش و خروش سے لپک کر ہمارا استقبال کیا۔ اور دوسرے ملازمین کی موجودگی کے باوجود سوٹ کیس اور ہولڈال خود اٹھا کر اندر لے گئی۔ اس کے موٹے موٹے ہونٹ خوشی کے مارے کھلے ہوئے تھے۔ اس کے بے انتہا چمکیلے دانت تھے۔ اور چمکیلی آنکھیں۔ اس نے سبز کنارے والی اودے رنگ کی سوتی ساری پہن رکھی تھی۔ اور بڑے سے جوڑے میں بمبئی کے رواج کے مطابق سفید پھولوں کا گجرا لپیٹا ہوا تھا۔ اپنی طرف کی سفید لہنگے پہننے والی مرگلی اور بدمزاج آیاؤں کے مقابلے میں وہ مجھے بڑی شاندار اور ہنس مکھ معلوم ہوئی۔

ابا جان اور ناصر چچا برآمدے کی آرام کرسیوں پر بیٹھ کر باتوں میں مصروف ہو چکے تھے اور میں جنگلے پر سے اچک کر سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ کہ وہ جھاڑن سے ہاتھ پونچھتی دروازے میں نمودار ہوئی "صاحب، کھانا کیا بنائے گا؟" اس نے مستعدی سے استفسار کیا۔

"بھئی تبلا دو کیا کھاؤ گے۔ گریس کھانا ایسا خوش ذائقہ پکاتی ہے کہ بامن کی بیٹی کلمہ بھرے۔" ناصر چچا نے ابا جان سے کہا۔

"آرڈر" دے کر وہ باورچی خانے کی سمت چلی گئی۔

چچا کا آٹھ سالہ لڑکا اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے جا چکا تھا۔ میں سارے گھر میں گھومتی پھری اور باورچی خانے میں جھانکا جہاں گریس ساری کا پلّو کمر میں گھرنسے کھانا تیار کرنے میں جٹی تھی اور دوسرے نوکروں پر حکم چلاتی جا رہی تھی۔

تیسرے پہر کو فراغت پاکر وہ پچھلے برآمدے میں اپنے کمرے کے سامنے چٹائی بچھا کر بیٹھ گئی اور مجھ سے باتیں کرنے لگی۔

وہ عجیب بے تکی اور اوٹ پٹانگ قسم کی کھچڑی زبان میں بات کرتی تھی جس سے میرے کان اب تک نا آشنا تھے، اور تب وہ مجھے اپنی طرف کی کھڑکھڑاتے لٹھے کے بڑے گھیر والے لہنگوں اور سفید براق ململ کے ڈوپٹوں میں ملبوس مرگلی اور بدمزاج مگر نستعلیق آیاؤں سے اور بھی مختلف معلوم ہوئی جو اتنی شستہ گفتگو کرتی تھیں۔ گریس دراصل بمبئی کے بیشتر عوام کی مانند ایک ہفت زبان خاتون تھی۔ اس کی ماما کونکنی اور پاپا گوا کے باشندے تھے۔ وہ کونکنی اور گوانی زبانوں کے علاوہ مرہٹی اور گجراتی بھی بولتی تھی۔ اور اردو اور انگریزی کا قتل عام بھی کرتی رہتی ہیں اس کا شوہر جس سے اس نے بقول خود "لو میرج بنایا تھا" بمبئی کے ایک ہوٹل آرکسٹرا میں ڈرم بجاتا تھا۔ اور شادی کے تیسرے سال ہی ایک حادثہ میں مر گیا تھا۔

اس کے والدین بھی عرصہ ہوا مر چکے تھے۔ اس کا اکلوتا بھائی پی اینڈ۔ او کے اسٹیم مور جہاز پر کیبن اسٹیورڈ تھا اور وہ بھی مر چکا تھا۔ بمبئی میں اس کی صرف ایک

"سگی والی" تھی جو اس کی خالہ زاد بہن تھی اور کبھی کبھی اس سے ملنے آجاتی تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد گریس نے بمبئی میں مختلف جگہوں پہ آیا گیری کی تھی۔ ایک اسکول بس پر بچوں کو لانے لے جانے پر مامور رہی تھی۔ اور تاج محل ہوٹل میں لیڈیز کلاک روم کی اٹنڈنٹ کے فرائض انجام دیئے تھے۔ "جب ہم ادھر اپنی میم صاحب کے پاس نوکری کیا تو ہم کو لگا جیسے ہم جنت میں آگیا ہے —— ہمارا میم صاحب بالکل اینجل کی موافق تھا۔ اسی لئے جلدی سے ہیون (HEAVEN) — کو چلا گیا۔" اس نے ساری کے کونے سے آنسو خشک کیے اور چٹائی پر اکڑوں بیٹھ کر کہتی رہی —— "ہم صاحب میم صاحب کے پاس نوکری کیا تو جوزف کی ڈیتھ کے بعد ہم کو زندگی میں پہلی بار عزت ملا اور ہم کو لگا کہ ہمارے سر پہ بھی چھت ہے —— صاحب ہمارا اب بھی بہت کھیال کرتا ہے —— صاحب تمہارے ڈیڈی کا بہت ذکر کرتا تھا۔ جس روز اس کے پاس تمہارا ڈیڈی کا تار آیا کہ تم لوگ ادھر آتا ہے تو ہمارا صاحب خوشی کے مارے رات کو بہت دیر تک ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا۔ اور اپنے سامنے سارا فلیٹ ہم سے ٹھیک کروایا —— اب تم کو جس چیز کو دل چاہے ہم کو بول دینا۔ ادھر تمہارا آنٹی زندہ نہیں ہے مگر ہم ان کا سرونٹ تو ابھی زندہ ہے ——"

ہم لوگ ناصر چچا کے وہاں کئی دن مقیم رہے۔ صبح سویرے ابا جان اور ناصر چچا سمندر کے رُخ والے برآمدے میں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے، جو زیادہ تر میری

سمجھ میں نہ آتیں۔ مگر میں بڑے ذوق و شوق سے ان دونوں کی گفتگو سنتی پٹنہ اسکول کی شاعری غالب کا فارسی کلام، عرفی اور نظیری۔ ملکی سیاست نازی جرمنی کے مسائل مہرنخ۔ واردھا آشرم اور جانے کیا کیا۔

ناصر چچا کے گھر کا بڑا باقاعدہ انتظام تھا جسے گریس کسی ماہر ایڈمنسٹریٹر کی مانند خاموشی اور ضابطے سے ڈائریکٹ کرتی تھی۔ صبح صبح کمروں کے گلدانوں میں تازہ پھول لگ جاتے۔ چچا کے سارے پائپ صاف کر کے مختلف میزوں پر راکھ دانیوں کے پاس رکھ دیئے جاتے۔ پالش کے بعد ان کے بوٹ پچھلے برآمدے میں ایک قطار میں موجود ہوتے۔ ناشتے کی میز پر تازہ اخبار رکھے ملتے۔ کمروں کا فرش صابن سے دھلتا ــــــــ دروازوں اور دریچوں کی چٹخنیاں براسو سے صاف کی جاتیں۔ سارا گھر آئینے کی طرح پڑا چمکتا رہتا۔ کھانے کے کمرے کے وکٹورین سائیڈ بورڈ پر رنگ برنگ اچار۔ مربوں اور چٹنیوں کے مرتبان موجود رہتے۔ گھر کا خرچ گریس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بڑی جزرسی سے کام لیتی اور پچھلے زینے پر کھڑے ہو کر سودے والوں سے الجھا کرتی۔ اور کسی گہرے رنگ کی سوتی ساڑھی اور کہنیوں تک پھنسی ہوئی آستینوں والے کھدی بلاؤز میں ملبوس جوڑے میں پنی سجائے۔ ننگے پیر، غلط سلط انگریزی یا بمبئی کی مخصوص اردو بولتی تندہی اور جان فشانی سے گھر سنبھالنے میں مصروف رہتی۔

وہ چچا کی آنکھیں دیکھتی تھی، اگر چچا کسی کو ناپسند کرتے تھے تو وہ بھی اسے

منہ نہ لگاتی تھی۔ اور فوراً دکھا سوکھا اور بعض اوقات تحقیر آمیز رویہ اختیار کر لیتی۔ چچا جن لوگوں کو پسند کرتے تھے ان کے لئے گریس کی جان بھی حاضر تھی۔

اتوار کے دن میری کی عید ہوتی تھی، کیونکہ اس دن ڈھیروں باتصویر اخبار اور رسالے آتے تھے۔ برآمدے میں ایک لمبی میز پر اخبار اور رسالوں کے انبار سلیقے سے چنے ہوئے تھے۔ بمبئی کرانیکل، اور اسٹیٹسمین اور ٹائمز آف انڈیا، اور السٹریٹڈ ویکلی، ساقی کے سالنامے اور افسانہ نمبر، ان ہی دنوں ٹائمز آف انڈیا کی صد سالہ سالگرہ کا خاص نمبر آیا تھا جس میں سو سال قبل کے چرچ گیٹ کی بڑی سی رنگین تصویر تھی کہ انگریز لوگ گھوڑا ـــــ گاڑیوں اور پالکیوں سے اتر رہے ہیں اور نیٹو لوگ ہاتھ باندھے چاروں طرف کھڑے ہیں۔ میں ان رسالوں کی ورق گردانی کرتی یا پھر سمندر کی لہریں گنا کرتی۔ ناصر چچا کا لڑکا مجھ سے تین چار سال چھوٹا تھا۔ اور میری اس سے دوستی بالکل نہ ہو سکی۔ یوں بھی اپنی عمر سے بڑے لوگوں سے میری زیادہ منتی تھی۔ اصغر بہت بدتمیز اور شریر تھا وہ دن بھر گریس کو تنگ کیا کرتا۔ پڑھائی میں اس کا جی بالکل نہیں لگتا تھا۔ گریس اسے ڈانٹتی رہتی ـــــ "اسگر جلدی اپنا لیسن سیکھو ـــــ" اور جواباً وہ اسے طرح طرح سے دق کرنے میں لگا رہتا۔ شاید وہ غیر شعوری طور پر گریس کو پسند بھی نہ کرتا تھا۔ اور اس کی وجہ غالباً یہی رہی ہوگی کہ گریس کے دل میں اس کے لئے جو شدید جذبہ ملکیت تھا۔ اصغر کا ننھا سا دماغ اس سے بغاوت پر آمادہ رہتا تھا۔

"اصغر کی تربیت بے حد غلط ہو رہی ہے" ناصر چچا افسوس سے اظہار خیال کرتے "گریسی کے بے جا لاڈ پیار نے اسے بالکل برباد کر دیا ہے۔ مگر میں گریسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔ بیگم مرحومہ اس سے اپنی چھوٹی بہن کی طرح محبت کرتی تھیں۔ اب میں اس کے ساتھ کس دل سے سختی کروں؟"

جب اصغر، ہم جائیں گا۔ ہم کھائیں گا۔ ہم تم کو بولا —— قسم کی زبان میں باتیں کرتا تو ابا جان بھی بڑے صدمے سے کہتے۔ یہ مٹیا برج اور عظیم آباد کے اس خاندان کا فرد ہے جو اردو ادب کی تاریخ میں اپنا مقام رکھتا ہے۔"

فلیٹ کے پچھواڑے کی عمارت میں خادمین کے کوارٹرز تھے۔ خادمین زیادہ تر مرہٹے تھے۔ اور ان میں سے ایک کی بڑی خوش شکل بیوی نو گزی ساری پہنے بالوں میں تازہ بیتی سجائے نل کے پاس بیٹھی برتن مانجھا کرتی۔

دوپہر کو میں چپکے سے نیچے اتر جاتی جہاں نچلی منزل پر ناصر چچا کے اسسٹنٹ مسٹر جیکب ابراہام کا فلیٹ تھا۔ مسٹر ابراہام بنی اسرائیل، یعنی ہندی نژاد یہودی تھے۔ اور ان لوگوں کی مادری زبان مرہٹی تھی۔ جمعے کے روز مسز ربیکا ابراہام پیتل کی زنجیر میں چھت سے لٹکتے ہوئے خوبصورت لیمپ کو روشن کر کے تین نصف دائروں کے سروں پر لگی ہوئی چھ موم بتیوں کا مخصوص عبرانی شمعدان جلاتیں اور توراۃ اور زبور کی تلاوت کرتیں۔ ان کے ڈرائنگ روم کی دیوار پر حضرت موسیٰؑ کی ایک بڑی سی رنگین تصویر لگی تھی کہ وہ اپنی قوم کو دریائے نیل کے پار

لیے جا رہے ہیں۔ میں اوپر واپس آ کر اباجان، یا ناصر چچا سے یہودیوں کے متعلق سوالات کرتی۔ ایک روز میں نے ایک انگریزی کتاب میں پڑھا —— موسیٰ کی مانند تم نے مجھے قید و بند سے نکالا۔ اور فرعون کی مانند میں تمہارا شکر گزار ہونے سے منکر رہا۔ اور لہٰذا صحرا میں نیست و نابود ہو گیا —— اس کا کیا مطلب ہے؟" میں نے اباجان سے پوچھا۔

"اس کا مطلب آپ ابھی نہیں سمجھ سکتیں۔ جب بڑی ہو جائیں گی تو سمجھیں گی۔" انھوں نے جواب دیا۔

شام کو میں، اباجان اور ناصر چچا کے ساتھ ساحل پر ٹہلتی ہوئی تاج محل ہوٹل اور گیٹ وے آف انڈیا تک جاتی۔ اور منڈیر پر کھڑے ہو کر سامنے سے گزرنے والے پُر وقار سفید جہازوں کو دیکھا کرتی

سڑک پر سے گزرتے ہوئے پارسیوں کے آتش کدے کے آدھے شیر اور آدھے انسان والے مہیب ستون نظر آتے۔ اور برستی بارش میں موٹر یا بس کے شیشوں میں سے مجھے وہ بہت پُر اسرار معلوم ہوتے۔ جوہو کے کنارے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ایک عقاب نما بڈھا پارسی کاونٹر پر آئس کریم بیچتا تھا۔ وہ بھی بے حد پُراسرار معلوم ہوتا۔ دنیا مجموعی طور پر بے حد پُر اسرار تھی۔

صبح کو اخبار پڑھتے پڑھتے ناصر چچا سر اٹھا کر مجھ سے کہتے —— اچھا صاحب! یہ بھی ہو گیا ——؟

کچھ بزرگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ بچوں سے ایک بے معنی سا فقرہ دہرا دیتے ہیں جو دوسروں کے لیئے بے معنی ہوتا ہے مگر بزرگ اور بچّے کے درمیان ایک خفیہ کوڈ کا درجہ رکھتا ہے۔ جن لوگوں کو بچّوں سے بہت محبت ہوتی ہے ان کے اور بچوں کے درمیان دوستی کا ایک ان کہا رابطہ موجود رہتا ہے، "اچھا صاحب ——— یہ بھی ہو گیا ——— وہ بھی ہو گیا ——— میرا اور ناصر چچا کا خفیہ کوڈ کا تھا۔

جب چچا میرے لئے کوئی پروگرام بناتے تو چپکے سے کہتے ——— "آج تمہیں جوہو لے جائیں گے۔ وہاں سمندر میں خوب مزے سے اپنے نہانا ——— کیوں صاحب؟" یا ——— "آج سینما چلیں گے ———" (سینما سے ان کی مراد صرف انگریزی سینما ہوتی تھی جو وہ سال میں ایک آدھ بار دیکھ لیتے تھے۔)

یا ——— "آج ہم اور تم تاج چلیں گے۔ خوب مزے سے اپنے ڈٹ کر آئس کریم کھانا ——— سمجھے صاحب؟"

ناصر چچا سے میری دوستی دو سال پرانی تھی۔ دو سال قبل، سردیوں کے زمانے میں ناصر چچا ہمارے ہاں دہرہ دون آئے تھے۔ اور آبا جان کے دوسرے دوستوں کی مانند میری ان سے فوراً دوستی ہو گئی تھی۔ آبا جان کے ان گنت دوستوں میں سے علی گڑھ والے چچا لعز عمرا چچا عبدالغفار[1]، چچا مشتاق زاہدی، چچا رضا علی[2]

---

[1] قاضی عبدالغفار مرحوم۔

[2] سید رضا علی مرحوم، مصنف اعمالنامہ

اور چچا عنایت اللہ؁ سے میری بہت گاڑھی چھنتی تھی۔ اور اب ان شفیق چچاؤں میں ناصر چچا کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ جن کو اتنی دور بمبئی میں رہنے کی وجہ سے میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

شام کو میں ناصر چچا کو ڈالن والا کی خاموش اور معطر سڑکوں پر چہل قدمی کے لئے لے جاتی اور ایک مستعد گائیڈ کی طرح اپنے نزدیک سارے اہم لینڈ مارک، ان کو دکھلاتی جاتی۔ اپنے واقف کار کتوں، بلیوں اور پرندوں سے ان کا تعارف کراتی۔ اور آس پاس کے مکانوں کے متعلق بے حد اہم اطلاعات انہیں فراہم کرتی۔ دیکھئے چچا وہ یوکلپٹس کے پیڑ ہیں نا ان کے پیچھے ہماری دوست دَملا رہتی ہے۔ اور وہ سامنے عطیہ کا گھر ہے۔ اور چچا وہ پکیا پر انگریز کھڑا ہے نا وہ سخت رنگی ہے۔ اور وہ سامنے مسز مکرجی رہتی ہیں۔ چچا معلوم ہے آپ کو یہ مسز مکرجی ان کے میاں پادری مکرجی کہتے ہیں کہ یہ پاگل ہے۔ اور یہ تو رات رات بھر باغوں میں گھوما کرتی ہے اور کہتی ہیں کہ ان کو نیند بالکل نہیں آتی۔ اور وہ سارے ڈالن والا میں گھوم گھوم کر بروک بانڈ کے خالی ڈبے جمع کیا کرتی ہیں۔

اور فرنچ کٹ داڑھی والے پادری مکرجی اپنے السیشن کتے کے ساتھ سر جھکائے سامنے سے ٹہلتے ہوئے آتے۔ دو منٹ رک کر ہم لوگوں سے بات کرتے اور آگے چلے جاتے۔ ناصر چچا پھر اپنی ہوا خوری شروع کر دیتے۔ اور میں اچھلتی

؁ مولوی عنایت اللہ دہلوی مرحوم

کودتی ان کے آگے آگے چلتی رہتی۔

چچا کو میں نے بڑے جوش و خروش سے اپنی خفیہ جائے پناہ دکھلائی تھی۔ یہ ہمارے گھر کے عقب میں سرخ رنگ کی ایک دو منزلہ عمارت تھی جس میں ان گنت برجیاں شہ نشین اور مینارے بنے ہوئے تھے۔ یہ دراصل مشرقی پنجاب کی کسی چھوٹی سی ریاست کے حکمران کی بنوائی ہوئی کوٹھی تھی۔ اور اس کا نام پری محل تھا۔ یہ بالکل سنسان پڑی تھی۔ اور عجیب بات تھی اس کے کمروں کے دروازے کھلے رہتے تھے۔ اور ایسا لگتا تھا جیسے عمر عیار کے طلسم والے کسی ساحر نے چھو منتر کہہ کر اک رتی بستی محلسرا کو پل کی پل میں اجاڑ دیا ہو۔ اور اس کے دروازے اسی طرح کھلے کے کھلے رہ گئے ہوں۔ میں اکثر اس کے زینوں اور برجیوں پر چڑھ جاتی اور مجھے مطلق ڈر نہ لگتا۔ کیونکہ ویران ہونے کے باوجود اس مکان میں وحشت نہ تھی۔ پری محل واقعی پری محل تھا۔ ناصر چچا جس روز دہرہ دون آئے میں نے اسی روز ان سے کہا۔ چلیئے آپ کو پری محل دکھلائیں۔ اور ان کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی وہاں لے گئی۔ تیز سبز گھاس کے قطعے پر ایستادہ کرسمس کیک ایسا مکان سناٹے میں ڈوبا، ہمیشہ کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ یہاں میں کھیلا کرتی ہوں۔ میں نے اطلاع دی۔ ناصر چچا نے چھڑی پہ ٹیک لگا کر اس پر نظر ڈالی —— اور کہا —— ہوں —— یہ بھی خوب ہے۔

جب وہ چچا عنایت اللہ سے ملنے گئے تو میں مصر رہی کہ وہ چچا عنایت اللہ کے نجی چڑیا خانے کو زیادہ تفصیل سے دیکھیں۔ اس چڑیا خانے کے سارے جانوروں

اور پرندوں سے میرے پرانے مراسم تھے۔ چچا عنایت اللہ حسب معمول بجری پر کرسی ڈالے دھوپ میں بیٹھے تھے اور ان کے سامنے میز پر بہت سارے کاغذات رکھے تھے اور انہوں نے ناصر چچا سے پوچھا تھا۔

"تم آج کل کہاں رہتے ہو؟"

"بمبئی میں"

"بمبئی میں کیا کرتے ہو؟"

"آگ سے کھیلتے ہیں ——" ناصر چچا نے جواب دیا تھا۔

اور بمبئی آکر میں نے دیکھا تھا کہ چچا کا کام واقعی بہت خطرناک تھا۔ اکثر رات کو فون کی گھنٹی بجتی اور انہیں آتشزدگی کی کسی بڑی واردات پر معائنے کے لئے جانا پڑتا۔ ان کے کمرے میں برقی گھنٹی لگی تھی۔ جس کا تعلق فائر بریگیڈ کے دفتر سے تھا۔ وہ اکثر وقت بے وقت لگاتار بجے چلی جاتی اور چچا پل کی پل میں غائب ہو جاتے۔ رات کو چچا اپنا یونیفارم، نل بوٹ اور آہنی خود پلنگ کے برابر کرسی پر رکھ کر سوتے تھے تاکہ خطرے کی گھنٹی بجتے ہی تیار ہو کر فوراً موقعہ واردات پر پہنچ جائیں۔

ایک روز صبح ناصر چچا ناشتے کی میز پر آئے تو بہت اداس تھے۔

"رات ایک سہ منزلہ عمارت میں آگ لگ گئی۔ اور ایک مولوی صاحب مع اپنے خاندان کے جل کر ختم ہو گئے۔" انہوں نے ملول آواز میں کہا۔ "میں ان مرحوم کو جانتا تھا۔ بے خدا ترس اور نیک بزرگ تھے۔ اور بہت غریب۔

ساری زندگی فقر و فاقے ہیں، پیٹ کی آگ بجھانے کی تگ و دو میں کٹی اور رات اس قہرناک آگ نے خاتمہ کر دیا ـــــ یہ اللہ میاں کے ہاں کس قسم کا انصاف ہے سجّاد ـــــ" انہوں نے ابّا جان سے کہا" اسی عمارت میں ایک بیٹھ رہتا تھا۔ جو شہر کا مشہور بدمعاش ہے اور سینکڑوں غریبوں اور مظلوموں کا خون چوس کر اس نے الغاروں دولت جمع کی ہے۔ وہ معہ اپنے خاندان کے صحیح و سالم بچ گیا۔ اس پر ذرا آنچ نہ آئی۔ اور مولوی حمیدالدین اور ان کے افلاس زدہ بیوی بچے جل کر کوئلہ ہو گئے۔"

گریس اس وقت میز کے سرے پر کھڑی تھی۔ اس نے فوراً زیر لب کچھ پڑھنا شروع کیا اور کمرے سے غائب ہو گئی۔

گریس کی عادت تھی کہ ناصر چچا جب آگ بجھانے نکلتے تو وہ ان کی خیریت کی منت مان کر اپنے کمرے میں جناب مریمؑ کے چھوٹے سے مجسمے کے سامنے ایک موم بتی جلا دیتی۔ اور جب وہ صحیح سلامت واپس آجاتے تو زیر لب جانے کیا کیا بڑبڑا کر دوسری موم بتی جلاتی۔ وہ عام رومن کیتھولک عورتوں کی مانند بے انتہا مذہبی اور خوش عقیدہ تھی۔ اتوار کو گرجا جاتی تھی۔ لیکن اس کے علاوہ دن بھر جو چھوٹے چھوٹے معرکے اس کی روزمرہ کی زندگی ۔۔ ہوتے ان کے سلسلے میں شکایت کرنے یا فوری امداد طلب کرنے کے لئے وہ بھاگی بھاگی جناب مریمؑ کے پاس جاتی اور موم بتی روشن کر کے باوازِ بلند کونکنی زبان میں ایک کیتھولک

دعا دہراتی اور اپنی مخصوص انگریزی یا اردو میں اس چینی کے مجسمے سے تیز تیز گفتگو کرنے کے بعد آکر اپنے کام میں دوبارہ منہمک ہوجاتی۔

ایک روز صبح وہ سارے میں نعمت خانے کی کنجی تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ کنجی ڈھونڈنے میں لگ گئی۔ جب کنجی نہ ملی تو وہ فوراً اپنے کمرے میں پہنچی۔ موم بتی جلائی اور غصے سے کہنا شروع کیا

"دیکھو میاں، اگر تم نے دس منٹ کے اندر میری کنجی ڈھونڈ کر نہ دی تو آج سے میری تمہاری دوستی ختم —— ہم تمہارے کو بولے دیتا ہے صاحب کو لنچ میں دیری ہوجائے گا تو وہ ہماری جان نکال لے گا۔ تمہارا کیا بگڑے گا تم نے تو کبھی آپا گیری نہیں کی۔"

اگر ناصر چچا کھانا کھاتے میں کسی روز گریس کی پکائی ہوئی کسی چیز کی تعریف کر دیتے تو وہ فوراً مجسمے کے سامنے جاکر شکرانے کی موم بتی جلاتی۔

ناصر چچا گریس یا دوسرے نوکروں سے شاذ و نادر ہی کوئی غیر ضروری بات کرتے تھے۔ گھر کے معاملات کے سلسلے میں وہ کافی کم سخن تھے۔ اور گریس کو خانہ داری کے سیاہ و سفید کا مالک بنا چکے تھے۔ اور یوں بھی اِن کی متاہلانہ زندگی کو ختم ہوئے اتنا عرصہ گزر گیا تھا کہ انہیں اپنی تنہائی کی عادت ہو گئی تھی۔ اور شاید انہوں نے اپنے خیالوں اور اپنی یادوں کی دوسراتھ میں خلوص سے زندہ رہنا سیکھ لیا تھا۔

ناصر چچا سرخ و سفید، بھاری بھر کم، بلند قامت اور کافی رعب و داب والے انسان تھے۔ وہ مالی لحاظ سے بہت خوشحال تھے۔ سرکاری تنخواہ کے علاوہ کلکتے میں ان کی خاصی جائیداد بھی تھی۔ اور گرلیس برابر اس فکر میں گھلتی رہتی تھی۔ کہ صاحب بڑا فضول خرچی کرتا ہے۔

بمبئی کے مقتدر اور اہم مسلمانوں میں ان کا شمار کیا جاتا تھا۔ وہ متعدد اسلامی اداروں کے سرپرست اور اعزازی عہدیدار تھے اور اپنی نرم دلی رکھ رکھاؤ اور وضعداری کے لئے مشہور تھے۔

ایک روز تین بھاری بھر کم بیبیاں ذرا ہانپتی کانپتی زینہ چڑھ کر برآمدے میں آئیں اور بڑی تمکنت سے آن کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئیں۔ جب ناصر چچا کمرے میں آئے تو وہ تینوں اٹھیں اور اسی تمکنت سے ان کے قریب پہنچیں۔ ان کی قائد خاتون کے ہاتھ میں دو ڈبے تھے اور بھاری بھاری اطلسی غرارے پہنے فرش پر ایک قطار میں چلتے ہوئے انہیں دیکھ کر مجھے "مشرق کے تین مجوسی بادشاہوں" کا خیال آیا جو حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے متعلق تصاویر میں منقش لبادوں میں ملبوس ہاتھ میں تحائف اٹھائے ایک قطار میں چلتے دکھلائے جاتے ہیں۔ قائد خاتون نے ڈبہ کھول کر ایک تصویر چچا کے ملاحظہ کے لئے پیش کی۔ انہوں نے تصویر کو سرسری نظر سے دیکھا اور میز پہ رکھ دیا۔ ان بیبیوں نے تقریباً یک زبان ہو کر کورس کے سے انداز میں کہا کہ بات طے ہو گئی ہے اور کل شام

کو وہ منگنی کی رسم ادا کرنے لڑکی والوں کے گھر جا رہی ہیں۔ پھر انہوں نے ڈبیہ کھول کر ایک انگوٹھی نکالی اور کہا کہ یہ نرونم بھاؤ کے ہاں سے خرید لی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے گرلیس کو آواز دی۔ اور جب وہ کمرے میں آئی تو اس سے کہا کہ گیارہ سیر مٹھائی گیارہ سیر پھل اور گیارہ سیر خشک میوہ خرید لائے اور کل شام کے پانچ بجے تیار رہے۔ یہ حکم دے کر تینوں بیبیاں اسی طرح سرسراتی ہوئی زینے سے نیچے اتر گئیں۔

یہ تینوں بیبیاں ناصر چچا کے ایک مقامی دوست کی بیوی، بھاوج اور بہن تھیں۔ سرفراز دلہن اور جمیلہ بہن کہلاتی تھیں اور کئی برس سے چچا سے مصر تھیں۔ کہ اب ان کو اپنا گھر بسا لینا چاہیئے۔ یہ تینوں چچا کی بہن اور بھاوج بنی ہوئی تھیں اور ان کے خاندان والیوں کی حیثیت سے انہوں نے لڑکی پسند بھی کر لی تھی۔ اور ناصر چچا کو محض یہ اطلاع دینے آئی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ہم نے اس طرح زبردستی سے کام نہ لیا تو ناصر بھائی تو ساری عمر اسی طرح گزار دیں گے۔ اور گھر کا گھر داہو جائے گا۔ اور دکھیا اصغر کی جو ریڑھ لگے گی وہ الگ۔

ناصر چچا بہت دنوں تک شدت سے انکار کرتے رہے تھے۔ مگر غالباً اصغر کی تربیت کا خیال کر کے انہوں نے اب آن کے حامی بھر لی تھی۔ کیونکہ لڑکی خاص الخاص لکھنؤ کے ایک ایرانی نژاد خاندان کی تھی۔ اور کم از کم اس کی وجہ سے اصغر کو زبان اور لہجہ تو سدھر جائے گا۔

شام کو انہوں نے ابا جان سے کہا۔

" جمیلہ بہن تو نسبت ہی طے کر آئی ہیں۔ مگر لڑکی والوں کی شرط یہ ہے کہ ساری رسمیں ادا کریں گے۔ یہ سخت چھچھورے پن کی بات ہے۔ لاحول ولا قوۃ ـــــــ"

پھر انہوں نے مڑ کر مجھے دیکھا، جو حسب معمول جنگلے پر لٹک رہی تھی۔ اور کہا ـــــــ

"کیوں صاحب ـــــــ یہ بھی ہو گیا ـــــــ"

دوسرے روز گریس بازار سے سارا سامان خرید لائی اور گودام میں جا کر وہ بڑے صندوق کھولے جن میں سعیدہ پھپی کا سامان مقفل تھا۔ میں سائے کی طرح گریس کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اور بڑے اشتیاق سے ساری تیاریوں کو دیکھ رہی تھی۔ گریس نے صندوق کھول کر گوٹے لچکے کے خوان پوش نکالے ـــــــ "یہ میم صاحب نے اپنے ہاتھ سے بنائے تھے۔" اس نے کہا اور آنسو کا ایک قطرہ پٹ سے سرخ پونچھ کے ایک خوان پوش پر گر گیا ـــــــ پھر وہ اپنے کمرے میں جا کر تیار ہوئی۔ پھول دار جارجٹ کی ساری پہنی ـــــــ بالوں میں پینی سجائی اور سانولے چہرے پر سفید پاؤڈر لگا کر باہر نکلی۔

"بڑی پیاری ساری ہے گریسی ـــــــ" میں نے کہا۔

"یہ ہمارا میم صاحب دیا تھا" اس نے نچی آواز میں کہا "میم صاحب ہمیشہ غرارا پہنتا تھا۔ اپنا ساری ہم کو دے دیتا تھا۔ ہم نے سب بیٹی میں رکھ چھوڑا ہے ـــــــ"

میں بھی ایک گلابی اورگنڈی کا پارٹی فراک پہن، بالوں میں ربن لگا، موزے

جو نئے ڈانٹ چلنے کے لئے مستعد ہو چکی تھی اور دلہن کو دیکھنے کے اشتیاق میں مری جا رہی تھی۔

ارجمند بھابھی کی بیوک میں سوار ہو کر قافلہ عمر پارک روانہ ہوا۔

لڑکی کے گھر پہنچ کر ہم لوگ ایک جلوس کی صورت میں زینے کی سمت بڑھے جلوس کی قائد ارجمند بھابھی تھیں پیچھے پیچھے گریس نے مٹھائی کا خوان اٹھا رکھا تھا اور جمیلہ بہن کی خادماؤں نے بقیہ کشتیاں اور ریسیاں سنبھالی ہوئی تھیں۔ انگوٹھی کی سُرخ ڈبیا سرفراز دلہن کے پرس میں محفوظ تھی۔ دروازے پر لکھنوی غراروں میں ملبوس بہت سی دبلی اور موٹی بیبیوں نے ہمارا سواگت کیا اور اوپر لے گئیں۔

ان کے ذرا اندھیرے سے ڈرائنگ روم میں قسم قسم کا فرنیچر سجا ہوا تھا۔ شیشے کی ایک بڑی سی الماری میں چاندی اور ای پی ان ایس کے ظروف اور کولائیڈ کے بنے اور دوسرے کھلونے اور بیبیاں اور گھونگے اور چھوٹا سا تاج محل اور خاندان کے سپوتوں کے جیتے ہوئے کپ اور ٹرافیاں اور دوسرا الم غلم اٹا ٹوٹ بھرا ہوا تھا۔ کارنس پر سگھڑ بیٹیوں کے ہاتھ کے سیاہ مخمل پر کاڑھے ہوئے سارس اور طوطے فریموں میں مزّین تھے۔ کرسیوں اور صوفوں کے ان گنت ساٹن کے کشنوں پر مزید سارس اور طوطے اور بڑا سا سایہ پہنے چھتری اٹھائے ہولی ہوکس کے پودے کے پاس کھڑی ہوئی میمیں کڑھی تھیں ——

ہم لوگ صوفوں پر بٹھا دیئے گئے۔ گریس دوسری آیاؤں کے ساتھ گیلری میں

کھڑی رہی اور دروازے میں سے اس نے اس کمرے کو ذرا ناقدانہ نگاہوں سے دیکھا۔ کیونکہ ناصر چچا کا جھل جھل کرتا ڈرائنگ رُوم بقول اس کے، انگریز لوگ کا گول کمرہ معلوم ہوتا تھا۔ سعیدہ چچی بے حد خوش ذوق تھیں اور ان کے ہاتھ کی سجائی ہوئی چیزیں گریس نے جوں کی توں اپنی اپنی جگہ پر رکھی رہنے دی تھیں۔ اور اگر کوئی ملازم جھاڑ پونچھ کرتے میں کوئی چیز انچ بھر اس کی جگہ سے سرکا دیتا تو وہ اسے کھانے کو دوڑتی تھیں۔

تیکھی مگر دزدیدہ نگاہوں سے کمرے کا معائنہ کرنے کے بعد گریسی کواڑ سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

ڈرائنگ روم سمدھیانے والیوں سے بھرنا شروع ہوا۔ اور ہجوم کی وجہ سے دم گھٹنے لگا۔ گریسی کھڑے کھڑے تھک گئی ہوگی میں نے سوچا اور مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ اجنبیوں کے اس مجمع میں داور اجنبیوں میں تینوں مجوسی بادشاہ یعنی ارجمند بھابھی۔ سرفراز دلہن اور جمیلہ بہن بھی شامل تھیں۔ مجھے گریسی اچانک بے حد اپنی معلوم ہوئی اور میرا جی چاہا کہ اس کی دوسراتھ کے لئے جا کر اس کے پاس گیلری میں کھڑی ہو جاؤں۔ آخر میں نے اس سے کہا ـــــ "گریس ادھر آ کر بیٹھ جاؤ۔" وہ دروازے کے قریب ایک کرسی پر اس طرح ٹک گئی جیسے جلتی ہوئی انگیٹھی کے کنارے پر بیٹھی ہو اور اندر ہی اندر کھول رہی ہو۔

میری سمجھ میں نہ آیا کہ گریس کو اتنا غصہ کیوں آ رہا ہے۔ اتنے میں بجلی فیل

ہوگئی اور برقی پنکھا بند ہو جانے کی وجہ سے حبس بڑھ گیا۔ خواتین اصغر علی محمد علی کے وہاں کی خوشبوؤں سے مہک رہی تھیں۔ ان کی گودیوں میں ٹھنسے ہوئے بچے گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہے تھے۔ شور و غل اور گرمی کی وجہ سے جی لوٹ رہا تھا۔ مگر ابھی چھم چھم کرتی دلہن آنے والی تھی۔ اور اس کے بعد آئس کریم آئے گی۔ میں دونوں چیزوں کے انتظار میں صبر سے بیٹھی رہی۔ اتنے میں ایک دم ایک لمحے کے لیے سناٹا سا ہوا اور "لڑکی" دجو دراصل ایک بہت لمبی چوڑی لحیم شحیم گوری چٹی پینتیس سالہ مجرد خاتون تھیں، سر ذرا سا خم کیے اطمینان سے پٹر پٹر چلتی ہوئی آکر دھم سے بیٹھ گئی۔ اور صوفے کے سپرنگ بج اٹھے۔

"ارے گریسی۔ ادھر آ ——" جمیلہ بہن نے آواز دی "ذرا مصری کی تھالی تو لانا ——"

گریس نے خاموشی سے ایک گنگا جمنی تھالی پیش کی۔ اور اس پر سے مصری کی ڈلی اٹھا کر جمیلہ بہن نے مولا کا نام لیا اور پان اور ڈلی لڑکی کے منہ میں رکھی۔ امام ضامن باندھا اور انگوٹھی پہنائی —— لڑکی ساری کارروائیاں ٹکر ٹکر دیکھا کی —— اور چند منٹ بعد اٹھ کر اسی طرح پٹر پٹر کرتی کمرے سے چلی گئی ——

مجھے بڑی سخت مایوسی ہوئی، کیونکہ اپنے وہاں جتنی منگنیاں اور شادیاں میں نے دیکھی تھیں۔ ان میں دلہنیں شرم کے مارے دوہری ہو جاتی تھیں۔ میزبان خواتین چائے کے انتظامات میں مصروف ہوئیں اور تینوں مجوسی

بادشاہ فوراً آپس میں کھُسر پھُسر میں منہمک ہو گئے۔

"رنگت تو اجلی ہے، مگر ہے پھیکی شلجم۔" ارجمند بھابھی نے کہا۔

"اس غریب کی بیاہ کی عمر ہی نکل چکی ہے۔ میں کہے دیتی ہوں۔ چالیس کے پیٹے میں ہے۔" —— سرفراز دلہن نے کہا۔

"دلہن کی باتیں۔ چوبیس سال کی ہو گی حد سے حد دکھیا۔"

"چونڈہ تو سفید ہو چلا ہے۔ رکھی ہے چوبیس سال کی۔" سرفراز دلہن نے کہا۔

"اے نہیں۔ نگوڑی اچھی خاصی ہے۔ اے ہاں اور کیا —— شریف لوگ ہیں۔ شیعہ۔ سیّد۔ دیکھے بھالے۔" ارجمند بھابھی نے کہا۔

"یہ تو ہی ہے اور پھر یہ کہ جو بندھ گیا سو موتی۔ راجہ کے گھر آئے رانی کہلائے۔"

چائے آئی۔ اور اب شرائط کا قضیہ شروع ہوا

"ہم نے نواب زادہ صاحب کو کہلوا دیا ہے۔ مہر ایک لاکھ سے کم نہیں بندھے گا۔" لڑکی کی ماں نے کہا۔

"اے بہن کیا غضب کرتی ہے۔ ایک لاکھ ——" ارجمند بھابھی نے کہا۔

"ہمارے کے یہاں تو بہن شرعی مہر بندھتا ہے۔" سرفراز دلہن نے کہا۔

"اور پاندان کا خرچ پچاس روپے مہینہ ——" لڑکی کی خالہ نے کہا۔

"ہمارے کے یہاں تو بہن شرطیں ہی نہیں ہوتیں ——" ارجمند بھابھی نے کہا۔

اب تو حاضرات محفل نے ایک ساتھ بولنا شروع کر دیا۔ اور بڑا غل مچا۔ بچے اور زور زور سے رونے لگے۔ حبس اور بڑھتا گیا۔ اور مجھے اتنی گرمی اور حبس کی وجہ سے یک لخت چکر سا آگیا۔ اور میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ میری سراسیمگی دیکھ کر گرلیس آگے بڑھی اور اس نے اونچی آواز میں مضبوطی سے اعلان کیا

"میم صاحب ـــــ ہماری بابا گھر جانا مانگتا ہے۔"

تینوں مجوسی بادشاہ پاندان کے خرچ اور مہروں کے جھگڑے میں اس قدر پھنس چکے تھے کہ انہوں نے بھی فرار مناسب سمجھا۔

ارجمند بھابی دوپٹہ سنبھالتی ہوئی اٹھیں "اچھا تو میں ان کو ـــــ جمیلہ کے بھائی کو ـــــ میرا مطلب ہے اپنے اُن کو ـــــ اپنے مسٹر کو بھیجوں گی وہ آپ ... صاحب سے بات کریں گے۔ نواب زادہ صاحب نے ـــــ ہمارے نام بھائی نے تو سارا معاملہ ہم پہ چھوڑ دیا ہے۔"

ارجمند بھابی نے سمدھنوں سے کہا

جلوس زینہ اتر کے نیچے پہنچا۔

"اچھا بہن خدا حافظ۔"

"اللہ نگہبان۔"

"مہروں کا جو فیصلہ ہو اطلاع جلد بھجوا دیجیے گا ـــــ اور بھی بچی کے بے

شمار پیغام تھے۔ مگر ہم تو خاندان دیکھتے ہیں۔"

"اللہ حافظ ــــ اللہ حافظ۔"

جلوس ناصر چچا کے گھر واپس آ پہنچا۔ ابا جان چند روز کے لئے کسی کام سے مدراس جا چکے تھے۔ چچا برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ اصغر ایک کونے میں بیٹھا کلینو سے کھیل رہا تھا۔

"اے مبارک ہو ناصر بھائی ـــــ" ارجمند بھابی نے زینے ہی پر سے آواز دی۔ ماشاء اللہ سے چاندی سی دلہن ملی ہے۔"

برآمدے میں پہنچ کر تینوں بیبیوں نے تقریباً یک زبان کہنا شروع کیا۔

"سگھڑ ایسی کہ دسوں انگلیاں دسوں چراغ ـــــ اس کی کشیدہ کاری دیکھی تم نے دلہن! میں کہتی ہوں اس اجڑے گھر میں چار چاند لگا دے گی۔ کیوں دلہن؟" ارجمند بھابی نے کہا۔

"یہ تو ہئی ہے" سرفراز دلہن نے کہا۔

"اور لڑکی کے باپ جہیز میں موٹر دینے کو کہہ رہے ہیں" جمیلہ بہن نے کہا۔

"بس اب وہ جم جم اس گھر میں آ کر اترے ـــــ ہم تو اپنے بھائی کی خوشی چاہتے ہیں ـــــ" ارجمند بھابی نے کہا۔

"یہ تو ہئی ہے ـــــ" سرفراز دلہن نے کہا۔

ناصر چچا سگار کی راکھ جھاڑ کر مسکرائے۔ اور تینوں بیبیوں کی اس گفتگو سے

بہت محفوظ نظر آئے۔ ناصر چچا شدید دسنس آف ہیومر کے مالک تھے۔
گریس خوان پوش اور سینیاں واپس رکھنے کے لئے گودام کی طرف جا چکی تھی۔

اس رات چچا کہیں ملنے ملانے چلے گئے۔ علی اصغر اپنے کمرے میں سو چکا تھا۔ میں سارے گھر میں ادھر ادھر گھومتی پھری چچا کے البم کی ساری تصویریں دوبارہ دیکھ ڈالیں، جن میں ایک بہت پیاری سی شکل کی سعیدہ چچی نفیس غرارے میں ملبوس، گودی میں علی اصغر کو اٹھائے کھڑی تھیں۔ یا گریس علی اصغر کو بچہ گاڑی میں بٹھا رہی تھی۔ اور سعیدہ چچی پاس کھڑی ہنس رہی تھیں۔ دارجیلنگ۔ کلکتہ۔ مہابلیشور۔ پونہ ہر جگہ ناصر چچا اور سعیدہ چچی اکٹھے اور کس قدر مسرور نظر آرہے تھے۔
دفعتہً گریس کے کمرے کی طرف سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی جانور غرا رہا ہو۔ عجیب غیر انسانی سی آواز۔ میں جلدی سے پچھلے برآمدے میں سے نکل کر ادھر گئی۔ اور گریس کے کمرے کی کھڑکی میں جھانکا ——— جناب مریم کا مجسمہ گریس کے پلنگ کے سرہانے ایک چھوٹی سی میز پر رکھا رہتا تھا۔ اس وقت گریس اس کے سامنے کرسی پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ اور ہل ہل کر آگ برساتی آواز میں کہہ رہی تھی
ڈیو سوا اینڈ سو ——— ہم تمہارے دیول میں اکھا نو ہفتے کا "نو وینا"[1] بنایا۔ تمہارا دیول کا چکر لگاتے لگاتے ہمارا پاؤں تھک گیا۔ تمہاری پہاڑی کی سیڑھیاں چڑھتے

---

[1] Novena

چڑھتے ہمارا جان لگ گیا۔ روزیری کرتے کرتے ہمارا عقل چکرا گیا۔ ہمارا کھوپڑی پلپلا ہو گیا۔ ہمارا اَگج گھوم گیا ــــــ اور تم نے ہمارے ساتھ فورنیٹی کیا۔ تم ایک کنڈم ہے ــــــ تم اور تمہارا دلارا بیٹا دونوں کنڈم ــــــ ڈیم فراڈ ــــــ دیکھ لی تمہاری خدائی۔

'لو' اینڈ 'پٹی' اینڈ 'مرسی' ــــــ اس نے زور سے پھونک مار کر شمع بجھا دی اور بڑے استہزا اور حقارت سے منہ چڑا کر بولی ــــــ "بڑی ورجن میری بنتی ہے۔ ورجن میری ــــــ" پھر اس نے اپنا سر میز کے کنارے پر رگڑنا شروع کر دیا۔

اس کا چہرہ بدلا ہوا تھا، جیسے وہ شدید اندرونی جسمانی کرب میں مبتلا ہو۔ میں ڈر سی گئی۔ یہ کوئی دوسری گریس تھی۔ یہ وہ گریس نہیں تھی۔ جو بڑے پیار سے میرے فراکوں پر استری کرتی تھی۔ مجھے اپنے ساتھ بازار لے جاتی تھی اور میرے لئے چاکلیٹ خریدتی تھی۔ جو رات کو مجھے گوا کی لوک کہانیاں کونکنی گانے اور پرتگالی دھن میں گوا کے لوک گیت سناتی تھی۔ یہ کوئی دیونی تھی یا کوئی ایسی بد روح جسے سخت ترین سزا دی گئی ہو۔ اور جس کے جسم پر کوڑے لگائے جا رہے ہوں، مگر وہ کوڑے نظر نہ آتے ہوں۔

کوڑے مجھے بھی نظر نہ آئے۔ لیکن اتنا احساس ضرور ہوا کہ سخت شدید تکلیف ہے۔ درد قولنج یا اپنڈی سائیٹس کا دورہ پڑا ہے۔ کیونکہ ایسا سُنا ہوا اور انتہائی اذیت میں مبتلا چہرہ میں نے لکھنؤ میں ایک مرتبہ اپنی کزن کا دیکھا تھا ــــــ

ل ROSARY- d c

جنہیں اپنڈی سائیٹس ہوا تھا۔

جناب مریم سے اس کے جس قسم کے بے تکلف تعلقات تھے ان کو دیکھتے ہوئے اس کا یہ غصّہ تو جائز تھا مگر وہ تو جناب مریم کو باقاعدہ گالیاں دے رہی تھی مجھے اور زیادہ ڈر لگا۔ اب گریسی کے سر پر چھت گر پڑے گی۔ وہ حضرت مریم علیہ السّلام کی شان میں گستاخی کر رہی ہے۔

پھر مجھے فوراً خیال آیا کہ اس بے وقوف کو چاہیئے کہ ڈاکٹر کو فون کرے۔ حضرت مریم ڈاکٹر تو ہیں نہیں کہ میز پر گڑیا ایسی کھڑی کھڑی اسے نسخہ لکھ کر دے دیں گے۔

میں کھڑکی میں متحیر اور پریشان کھڑی رہی۔ دفعتاً مجھے نچلی منزل والی مسز ربیکا ابراہام کی بات یاد آئی۔ جنہوں نے کل ہی مجھ سے کہا تھا ـــــ کہ عیسائیوں کا یہ عیسیٰ و مریم کا چکر بڑا سخت گناہ ہے۔ عیسائیوں نے سچے دین موسوی کو مسخ کر دیا۔ خدائے واحد کو تین ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جو شدید کفر کی بات ہے۔ اور شرک گناہ عظیم ہے اور اسی وجہ سے یہ سارے مشرکین سیدھے جہنم میں جائینگے۔

"گریسی بھی جہنم جائے گی۔؟" میں نے فکرمند ہو کر پوچھا تھا۔

"ہاں، اگر راہ راست پر نہ آئی اور عیسیٰ کو خدا کا بیٹا اور خدا مانتی رہی تو دوزخ کے علاوہ اس کا ٹھکانہ اور کہیں نہیں ہے۔ خدا کے منتخب بندے صرف بنی اسرائیل ہیں۔"

میں گرلیں کے اس خوفناک مستقبل کے مسئلے پر ابا جان یا ماموں جان سے سوالات کرنے ہی والی تھی کہ ابا جان مدراس چلے گئے۔ اور گھر میں منگنی کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔

میں دہشت زدہ سی دریچے کے باہر کھڑی رہی اور سمجھ میں نہ آیا کہ گرلیں کی کس طرح مدد کروں۔

اب اس کی آنکھوں کا دریا بہہ رہا تھا۔ اور وہ پرسکون آواز میں آہستہ آہستہ انگریزی میں کہہ رہی تھی ـــ ماں ـــ تم مزے سے مسکرائے جا رہی ہو ـــ تم تو بیس برس کی عمر میں بیوہ نہیں ہوئیں ـــ تم تو جانتی ہی نہیں کہ آدمی کا پیار کیسا ہوتا ہے ـــ تم نے تو دس برس تک در، در کی ٹھوکریں نہیں کھائی۔ تم تو فٹ پاتھ پر کبھی نہیں سوئیں۔ تمہیں کیا پتہ کہ سیکیورٹی اور گھر اور پوزیشن کا کیا مطلب ہے۔

تمہارے اکلوتے بیٹے پر تو کوئی سوتیلی ماں نہیں آئی۔ تم کو پتہ بھی نہیں سوتیلی ماں کیسی ہوتی ہے ـــ" مدر ـــ دیلو اچے مائے ـــ دیلو اچے مائے ـــ"

اس نے اپنے ہاتھ میز پر پھیلا کر مجسمہ باہنوں کے حلقے میں لے لیا ـــ اور اس کے ننھے منے سفید پیروں پر سر رکھ کر چپ ہو گئی۔

میں کھڑکی میں سے ہٹ کر اپنے کمرے میں آ گئی اب میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ یہ سب کیا ہے۔ دنیا واقعی حد سے زیادہ پراسرار تھی۔ پھر میں نے رابعہ آپا اور رضوان بھائی کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ جو میرے بڑے محبت

والے اور دلچسپ کزن تھے۔ اور جن کے گھر میں صبح کو جانے والی تھی۔ خوش ہو ہو کر یہ سوچتے ہوئے کہ ماٹنگا میں کتنے مزے آئیں گے، تھوڑی دیر بعد میں سو گئی۔

دوسرے روز صبح سویرے رابعہ آپا، رضوان بھائی مجھے اپنے وہاں ماٹنگا لے گئے۔ یہ ایک نوجوان جوڑا تھا۔ اور ان کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی۔ ان کے وہاں ہر وقت ان کے ہم عمر دوستوں کا مجمع رہتا۔ اور خوب ہڑبونگ ہوتی۔ ان کا چھوٹا سا فلیٹ ناصر چچا کے خاموش مکان کے مقابلے میں بہت پر رونق تھا۔ پڑوس میں ایک نامور فلمی اداکار کا گھر تھا۔ جس کے دو موٹے موٹے لڑکے سامنے خاموش سڑک پر رولر اسکیٹنگ کیا کرتے اور ان کا پشاوری ملازم گلی زینے میں کھاٹ پر بیٹھا حقہ گڑگڑایا کرتا اور بچوں کو ڈانٹتا رہتا۔ دوپہر کو سڑک کے آمنے سامنے ساری رہائشی عمارتوں میں ایک ساتھ ریڈیو پر فلمی ریکارڈ بجتے۔ اور کانن دیوی کی سریلی آواز سارے میں گونجتی "من میرے آندھی بن جا"

——اور "تم من موہن——تم سکھیں سنگ ہنس ہنس کھیلو پھاگ——میری دنیا سونی کر کے بستی نئی بسائی تو نے——اب میں جا کر کسے سناؤں اپنے من کا راگ——" اور برابر کے فلیٹ میں ایک سکھ لڑکی ان ریکارڈوں کے ساتھ ساتھ آواز ملا کر گایا کرتی۔

چند روز بعد ابا جان مدراس سے لوٹ کر ماٹنگا آگئے۔ اور اس کے اگلے ہفتے جب ہم ناصر چچا کے گھر واپس پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہاں ایک کرائسس

آگے گزر چکا ہے۔

اس وقت شام کے پانچ بجے تھے، برآمدے میں ارجمند بھابھی۔ سرفراز دلہن اور جمیلہ بہن بید کی کرسیوں پر براجمان تھیں۔ گریسی ساری کا پلو کمر سے کھونسے دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ ناصر چچا حسب عادت پائپ ہاتھ میں لئے ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔

ارجمند بھابھی کہہ رہی تھیں —— "اے میں تو کہتی ہوں اللہ کا شکر ہے کہ ہزار پانچ سو ہی کے ماتھے گئی۔ اگر کہیں خدانخواستہ دو لاکھ بڑھا لیے ہوتے اور پھر یہ معلوم ہوتا تو ناصر بھائی کیا کچہری چڑھتے۔ خدانخواستہ الٹی آنتیں گلے پڑ جاتیں۔ شریفوں میں چھٹم چھٹا فارغ خطی، خلع طلاق کے ٹنٹوں کا کسے دماغ ہے۔"

"جبھی تو میں کہوں کہ اس کی ماں ایک لاکھ مہر پر کیوں اڑی ہوئی تھیں۔" سرفراز دلہن نے کہا۔

ابا جان کو اپنے کمرے کی طرف جاتے دیکھ کر ناصر چچا نے آواز دی

"ارے بھائی —— وہ شادی ہماری —— القط ہو گئی!"

"ارے —— کیوں! خیریت؟" ابا جان نے ٹھٹھک کر پوچھا۔

"لڑکی کو مالیخولیا ہے۔" ناصر چچا نے مختصراً جواب دیا۔

"اوہو —— بڑا افسوس ہوا ——" ابا جان بولے۔

"لڑکی کو ہسٹریا کے دورے پڑتے ہیں بھائی صاحب ——"

ارجمند بھابھی نے سر پہ دوپٹہ سنبھالتے ہوئے آبا جان سے وضاحت کی "ان لوگوں نے چھپا رکھا تھا۔ میں نے جو ٹوہ لگائی تو معتبر ذرائع سے پتہ چل گیا۔۔۔ بڑی اللہ قسم خیریت ہو گئی۔ میں تو ناصر بھائی سے کہہ رہی ہوں کہ شکرانے کی مجلس کروائیں۔

"میرا تو پہلے ہی شادی کا ارادہ نہ تھا۔ یہی لوگ پیچھے پڑی تھیں۔ اب کہتی ہیں کہ لڑکی بالکل نیم پاگل ہے۔ اور ہسٹریا کی مریض بھی ہے تو بھائی ممکن ہے یہ اطلاع غلط ہی ہو مگر میں اس عمر میں آن کریر۔۔۔ نہیں لے سکتا۔۔۔ یہ میرے ساتھ بھی بے انصافی ہوگی۔ اور اس لڑکی کے ساتھ بھی۔۔۔"

ابا جان ہاتھ منہ دھونے کے لئے اندر چلے گئے۔

ارجمند بھابھی نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھا۔۔۔ "میں بڑی چیز اٹھا کر آپ سے کہتی ہوں ناصر بھائی مجھے نہایت ہی معتبر ذرائع سے یہ معلوم ہوا ہے۔۔۔"

جبھی تو میں کہوں کہ اس روز اس کی شکل پر کیسی وحشت برس رہی تھی بلکہ وحشت کیا ایک قسم کی نحوست۔۔۔ پھٹکار ایک دم" سرفراز دلہن نے کہا۔

"اور شکل بھی کیا تھی۔۔۔ بس رنگ ہی رنگ تھا۔ طباق ایسا منہ، بلی ایسی بالکل۔۔۔" جمیلہ بہن نے کہا۔

"اور ڈیل ایسا بے ہنگم تھا؛ پھاوڑا ایسے پاؤں۔ کھپڑا ایسے ہاتھ۔ بے حیائی دیکھو کر گھونگٹ تک نہ کاڑھا۔ بیٹی بیٹی رہ کر بالکل میم بن گئیں۔ ٹوکا لگاؤں ایسی

عورت کو میں ـــــ" سرفراز دلہن نے کہا۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اسی لڑکی کو یہ لوگ اس روز چندے آفتاب چندے ماہتاب بتا رہی تھیں۔ جس کی دسوں انگلیاں دسوں چراغ تھے۔ اور آج اس میں اتنے کیڑے کیسے پڑ گئے۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

"مگر بھابی ـــــ" جمیلہ بہن کہہ رہی تھیں ـــــ" اس وقت تو منگنی کے وقت تو وہ بالکل اچھی بھلی بیٹھی تھی۔"

"اے دوئی ـــــ تو کیا سب کے سامنے ایسے موقع پر رونے چلّانے لگتی؟ ہسٹریا کے مریضوں کے سر پر سینگ تھوڑا ہی ہوتے ہیں۔ کسی ایک ذری سی بات سے پتہ چل جاتا ہے۔ اب جب اسے معلوم ہوگا کہ نسبت ٹوٹ گئی تو زمین آسمان ایک کر دے گی ـــــ اللہ توبہ، توبہ، توبہ ـــــ خدا بری گھڑی سے بچائے بہن میرے آگے بھی لڑکیاں ہیں ـــــ" ارجمند بھابی نے جواب دیا۔

"یہ تو ہئی ہے ـــــ اور اس کی اماں خالہ بھی اسی لئے یہ بات چھپائے تھیں۔ اس کی خوش مزاجی ہی کی تعریفیں کر رہی تھیں۔ سچ ہے بہن کنجڑن اپنے بیر کھٹے نہیں بتاتی" سرفراز دلہن نے کہا۔

"جھلسا لگاؤں میں تو ـــــ" جمیلہ بہن نے کہا۔

"جبھی تو میں کہوں کہ اتنے دن شادی کیوں نہ ہوئی" سرفراز دلہن نے کہا۔

"ارے میں تو جبھی کھٹک رہی تھی کہ چونتیس پینتیس برس کی عمر ہو گی اور کنواری بیٹھی ہے۔ کوئی تو فنی ہوگی لڑکی میں۔ لو اب عقدہ کھل گیا۔ ورنہ اتنا دولت مند باپ اور اچھی خاصی صورت، تو کوار کوٹلہ یونہی چنارہا؟" جمیلہ بہن نے کہا۔

"بڑا غضب ہو جاتا۔ اے بی آدمی گھر بساتا ہے اپنے سکھ چین کے لئے نہ یہ کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔ نیم خبطی بیوی پلے پڑ جائے۔ عمر بھر کا روگ ——" ارجمند بھابھی نے کہا۔

"بال بال بچ گئے ناصر بھائی" سرفراز دلہن نے کہا۔

"اچھا بھابھی اب اس قصے کو یہیں ختم کرنا چاہیئے —— اب اس کے متعلق زیادہ تبادلہ خیالات کرنے کی ضرورت نہیں" ناصر چچا نے متانت سے کہا۔ اور اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

"اے بی گریس" ارجمند بھابھی نے ذرا پراسرار انداز میں کھنکار کر آواز دی —— "ذرا ایک گلاس پانی تو پلانا"۔

"گریس پانی کا جگ اور گلاس لے کر آئی۔ خواتین ناصر چچا کی منگنی اور متعلقہ مسائل پر بدستور زور و شور سے اظہار خیال کرتی رہیں۔ اب وہ تین موٹی تازی لیگ ہارن مرغیوں کی مانند بڑی طمانیت سے کلک کلک کر رہی تھیں۔

شام کو میں ابا جان کے ساتھ گھومنے کے لئے چلی گئی۔ بوری بندر کے ایک بک اسٹال سے کئی ماڈس کے رسالے خریدے۔ اور خوش خوش واپس لوٹی۔

رات کو، ابّا جان اور ناصر چچا کہیں دعوت میں چلے گئے۔ اور مجھ سے کہتے گئے۔ کہ میں گریسی کو بلا کر اپنے پاس بٹھالوں۔ موسن سون کی جھڑی کئی دن سے لگی ہوئی تھی۔ اور اس وقت باد و باراں کا شور زیادہ تیز ہو گیا تھا۔ علی اصغر چچا کے کمرے میں سوتا تھا۔ اور گریسی اسے سلا کر اپنے کمرے کی طرف جا چکی تھی۔ میں لکی ماؤس کے رسالے پڑھنے میں محو تھی۔ اور باہر برستی ہوئی بارش کے مقابلے میں اونچی دیواروں اور عنابی پردوں والے اس وسیع اور آرام دہ کمرے میں، چمڑے کے گدیلوں والی آرام کرسی پر بیٹھی لکی ماؤس پڑھتی خود کو بے حد محفوظ کر رہی تھی۔

لیکن کچھ دیر بعد طوفان کا زور بڑھ گیا تو کھڑکیاں بند کروانے کے لئے میں نے گریسی کو آواز دی۔

کوئی جواب نہ ملا تو پچھلے دروازے سے گزرتی اس کے کمرے میں پہنچی۔ سمندر پر بجلی بار بار چمک رہی تھی۔

گریسی کے مختصر سے کمرے میں داخل ہو کر دفعتاً ایسا لگا جیسے طوفان میں گھرے ہوئے جہاز کے عرشے پر سے ہٹ کر پُر سکون بند کیبن میں آگئی ہوں۔ ہیل میری فُل اف گریس — کمرے میں گریس کی آواز گونجی۔ پھر اس نے کونکنی میں Hail Mary شروع کیا۔

"نان مہ ریے گرین بھروے سوجی تجے سنگاتا استرام تبر توسد لیو فال تجے کُسی

Hail Mary. Full of Grace.

جے جیزس ــــ"

وہ موم بتیاں جلاتی گئی اور ہل ہل کر کہتی گئی ــــ "ماں تم ایک دم فرسٹ کلاس ہو ماں ــــ تم نے ہمارا نووینا قبول کر لیا ماں ــــ سنتا موریے دیواچے مائے امپاپیا کِتر دناتی کر ــــ آمین ــــ ان آنم بابا انی پترا اسپر یتا سنتا چے ــــ آمین ــــ دسا ادی تسا تیان سدا ئیر ونا ــ آمین ــــ"

میرے قدموں کی آہٹ پر وہ چونک کر پیچھے مڑی اور مجھے دیکھ کر ذرا گھبرا گئی اور غصّے سے کہا ــــ "تم اس ٹائم ادھر کیا کرنے آیا ہے۔ جا کر سو جاؤ۔"

"سمندر میں طوفان آ رہا ہے گریسی۔ میں تمہیں بلانے آئی تھی۔ کہ چل کر میرے کمرے میں بیٹھو ــــ" میں نے لجاجت سے کہا۔

دفعتاً شفقت اور محبت کا سیلاب اس کی آنکھوں سے امڈ پڑا۔

"کم ہیئر ڈارلنگ ــــ" اس نے خالص میموں والے لہجے میں کہا ــــ اور پچکار کر میرے سر پر ہاتھ رکھا ــــ "ٹافی مانگتا ــــ؟"

"یس پلیز ــــ گریسی"

وہ اٹھی اور الماری میں سے "بلیک میجک" ڈبہ نکالا۔

ٹافی کی ڈلی منہ میں ڈالتے ہوئے میں نے سوال کیا

"گریسی نووینا کیا ہوتا ہے؟"

"اُوہ یو ڈیم نوزی پارکر ــــ" اس نے مصنوعی خفگی سے کہا اور ایک لخت

بڑی پریشان نظر آئی۔

"نہیں ہیں ضرور بتاؤ گریسی۔ ہم بھی نووینا کریں گے۔"

"اچھا ہم تم کو بتائے گا۔ بٹ تم پرومس کرو کہ کسی کو نہیں بولے گا۔"

"پرومس گریسی!"

"اچھا۔ ادھر باندرہ پر ماؤنٹ میری ہے نا۔ ادھر ہم لوگ کا بہت بڑا دیول ہے۔ ادھر جاکر پریئر کرو تو ورجن دعا سن لیتا ہے ــــــ اور ماہم میں ایک اور دیول ہے چرچ آف سینٹ مائیکل ــــــ اس میں ورجن کا ایک فوٹو ہے۔ اینڈ وہ فوٹو مریکل کرتا ہے۔

"مریکل ــــــ گریسی؟"

"یس ــــــ ادھر تم پورا نوبدھ وار تک جاکر دعا مانگے تو تمہارا وش پورا ہو جائے گا۔ ہم نے نووینا چالو کیا اور نائن ویڈنس ڈے پورا کیا۔ پچھلے دن ہم ورجن سے گسہ ہو گیا تھا۔ مگر ورجن نے ہمارے لئے مریکل کر دیا۔"

"مریکل ــــــ گریسی ــــــ؟"

"چلو ــــــ چلو ــــــ" اس نے سرعت سے کہا۔ "اپنے پلنگ میں جاؤ ــــــ بہت لیٹ ہو گیا۔ پھر اس نے اپنی جناتی انگریزی شروع کر دی۔ جب وہ بہت غصے میں یا بہت زیادہ خوش ہوتی تھی۔ تو اپنی بے نقط کی اڑنگ بڑنگ انگریزی بولتی تھی۔ اس وقت وہ بے انتہا مسرور اور مطمئن نظر

آ رہی تھی۔

"اچھا۔ مگر کل تم بتاؤ گی کہ مریکل کیسا ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا، اس نے میری بات ٹال دی اور میرے ساتھ بیڈ روم کی طرف چلنے لگی۔ کمرے میں آ کر اس نے دریچے بند کئے۔ میرے صبح کے کپڑے نکال کر کرسی پر رکھے۔ اور پلنگ کے پاس فرش پر بیٹھ گئی۔

مجھے خیال آیا کہ اسے اس وقت اپنی ڈیوٹی بجا لانے کے لئے میرے پاس بیٹھنا پڑ رہا ہے۔ اور میں نے سوچا کہ ہم مسلمانوں کی نماز میں کوئی مخل نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں جا کر گریس کی نماز میں مخل ہو گئی تھی۔ اور یہ اس کی بے حد اہم نماز تھی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس رات کی گستاخی کے بعد آج حضرت مریم سے معافی چاہ رہی تھی۔

جوتے اور موزے اتارتے ہوئے میں نے کہا "گریس ——— اب مجھے بالکل ڈر نہیں لگ رہا۔ تم جا کر اپنی پریر کرو ———"

"لو ——— لو ———"

"گڈ نائٹ گریس ———" میں نے مسہری پر لیٹ کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

"آر یو شیور ——— ؟ کین آئی گو ——— ؟"

"گڈ نائٹ گریس ———"

اس رات ٹوٹ کر بارش ہوئی۔ اور سمندر کسی مہیب جانور کی طرح چنگھاڑتا

رہا۔ سمندر کی آواز خوفناک تھی۔ میں نے چادر کو اچھی طرح اوڑھ لپیٹ لیا اور جب ابّا جان دعوت سے واپس آئے میں گہری نیند سو چکی تھی۔

صبح کو ہر چیز دھلی دھلائی اور نکھری ہوئی نظر آرہی تھی۔ سمندر پرسکون تھا اور بے حد نیلا۔ دُور پی اینڈ او کا ایک بے حد طویل اور بے حد سفید جہاز وقار سے تیرتا ہوا لہروں پر سے گزر رہا تھا۔ نیچے سڑک پر مچھلی والیوں نے آوازیں لگانی شروع کر دی تھیں۔ کوارٹروں میں فائرمین کی خوبصورت بیوی پانی کے نل کے پاس کھڑی آسمان پر پھیلی ہوئی مونسون کی گھٹاؤں کو دیکھ رہی تھی۔ اور آپ سے آپ مسکرا رہی تھی۔ سامنے کے برآمدے میں تازہ اخبار آگئے تھے۔ ابّا جان اور ناصر چچا آرام کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اور گریسی حسب معمول اطمینان اور مصروفیت سے کھانے کے کمرے میں پسٹر پسٹر کر رہی تھی۔ اور ناصر چچا سے پوچھ رہی تھی کہ ٹرین میں ساتھ لے جانے کے لئے کیا ٹفن بنے گا ——— اگلے ہفتے میرا اسکول کھلنے والا تھا اور سہ پہر کی ٹرین سے ابّا جان اور میں لکھنؤ واپس جا رہے تھے۔

میں تیار ہو کر برآمدے میں آئی تو ناصر چچا نے اخبار اپنے چہرے کے سامنے سے ہٹایا ——— عینک اتار کر میز پر رکھی اور شگفتگی سے پوچھا ـ" کہئے صاحب یہ بھی ہو گیا ——— ؟"

پاکستان بنے ڈیڑھ سال گزر چکا تھا۔ ۴۸ء کے آخر میں میں لاہور گئی تو معلوم ہوا ناصر چچا ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد بمبئی سے لاہور آگئے ہیں۔ ایک روز میرے جائے قیام پر ان کا فون آیا کہ وہ علی اصغر کو کار لے کر بھیج دیں گے تاکہ وہ مجھے ان کے وہاں ماڈل ٹاؤن ــــ لے آئے ــــ

دوسرے روز صبح کو علی اصغر ایک لمبی چوڑی کار لے کر آپہنچا۔ اب وہ اٹھارہ سالہ نوجوان تھا۔ جونیر کیمبرج کے بعد اس نے پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اور اب تفریح میں مصروف تھا۔

"اب تمہارا کیا ارادہ ہے علی اصغر ــــ" کار میں بیٹھتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا۔

"اب ہم بزنس کرے گا۔ یہ کار ہمارے جس فرینڈ کا ہے ہم اس کی پارٹنرشپ میں کام شروع کرنے والا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

اس کے بعد وہ راستے بھر خاموش رہا۔ اسے شاید اچھی طرح معلوم نہ تھا، اور نہ شاید جاننے کی پروا تھی۔ کہ میں کون تھی۔ اور میرا اس سے کیا رشتہ تھا۔

"چچا کیسے ہیں ــــ؟" میں نے کچھ دیر بعد دریافت کیا۔

"ــــ؟" اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"تمہارے والد" میں نے وضاحت کی

"اوہ ــــ ڈیڈی ــــ ہی از آل رائٹ آئی سپوز۔" اس نے جواب دیا۔

اور بڑے اسٹائل سے اور نہایت زناٹے کے ساتھ ڈرائیور کرنے اور آہستہ آہستہ سیٹی بجانے میں مصروف رہا۔

"تمہیں یاد ہے علی اصغر ——— ایک مرتبہ ہم لوگ تمہارے وہاں بمبئی آئے تھے۔ یاد ہے؟" میں نے ایک بار پھر بات کرنے کی سعی کی ——— !

"اوہ ——— ہاں ——— ہاں ——— ہاں ——— ویل ویل، ویل آئی ریمبر ——— ناؤ ویٹ یو ٹیل می ——— تھوڑا سا یاد ہے ———" اس نے جواب دیا۔ اور انگریزی دھن کی سیٹی بجانے میں مصروف رہا۔

ماڈل ٹاؤن کی ایک کچی سڑک پر پہنچ کر اس نے جھونک کے ساتھ اسٹرینگ وہیل گھمائی اور دھچکے کے ساتھ کار ایک پھاٹک کے سامنے روک لی۔ اور مجھے اتار کر آگے چلا گیا۔

ایک چھوٹی سی کوٹھی کے احاطے میں آم اور پپیتے کے چند درخت کھڑے تھے۔ اور برآمدے کے سامنے گھاس کے ذرا سے قطعے پر ناصر چچا کرسی بچھائے دسمبر کی دھوپ میں بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ گھٹنے پر ایک ہاتھ رکھ کر ذرا دقت کے ساتھ کرسی سے اٹھے اور میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میں دوسری کرسی پر چپ چاپ بیٹھ گئی۔

بمبئی کے اس قیام کے بعد میں ناصر چچا سے اب ملی تھی۔ اور اس طویل وقفے میں دنیا بدل چکی تھی اور کیسی بدل لی تھی۔

ناصر چچا چند منٹ تک بالکل خاموش رہے۔ اور پھر آہستہ سے بولے ــــ

"سجاد، ہمارا دوست، ہمیں چوٹ دے گیا۔ اس دغا بازی کی ہمیں اس سے امید نہیں تھی۔" چند لمحوں بعد انہوں نے کہا ــــ "مگر وہ اچھا ہی رہا۔ انقلاب اور شکستہ دلی کا سامنا کرنے سے بچ گیا۔ جنت میں مزے سے بیٹھا ہوگا اپنے۔"

"جنت ــــ" میرے حلق میں کوئی چیز آ اٹکی ــــ "مرنے کے بعد روح یا جو کچھ بھی وہ ہے ــــ وہ زندہ رہتی ہے چچا ــــ؟ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

ناصر چچا نے عینک ماتھے پر چڑھائی۔ اور بھویں اٹھا کر مجھے بغور دیکھا۔ "سوالات کی عادت تمہاری ابھی تک نہیں گئی۔ کیوں صاحب! سوال کرنے چھوڑ دو ــــ سمجھے صاحب ــــ ورنہ زندگی میں تمہیں بہت دکھ ملیں گے ــــ اور خدا نہ کرے کہ تمہیں دکھ ملے ــــ" پھر وہ کلمے کی انگلی اٹھا کر ہوا میں کچھ لکھتے رہے اور دفعتاً بولے ــــ "ارے بھائی ہم نے سنا ہے تم افسانہ نگار بن گئی ہو" ــــ یہ تو ہمیں یاد ہی نہ رہا تھا۔ اور ایک دم تیوری بدل کر خفگی سے کہا "تم تو وہ دلفگار مینڈک والا ادب تخلیق نہیں کرتیں ــــ؟"

"دیکھو ــــ دیکھو یہ کیا واہیات خرافات ہے جو ادب کے نام سے پیش کی جا رہی ہے۔" انھوں نے میز پر سے ایک رسالہ اٹھایا۔ جو غالباً تازہ ادب لطیف یا ادبی دنیا تھا۔ اور ایک جدید نظم نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔

میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ کیا بکواس ہے ——؟ ایں ——؟ تم بھی یہی سب لکھتی ہو؟ سجاد کی بیٹی —— اگر یہ جہل خرافات لکھ رہی ہے تو —— تو ——" غم و غصے سے انہوں نے ،، سالہ میز پر پٹخ دیا۔ میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ناصر چچا بوڑھے ہو گئے تھے اور ہمیشہ کی طرح بہت پیارے تھے اور اس نئی دنیا اور اجنبی شہر کے اس اداس اجڑے ہوئے "ماڈل ٹاؤن" کی ایک کاٹج کے ویران احاطے میں بہت بے بس، بے یار و مددگار سے بیٹھے ہوئے، ترقی پسند ادب پر گرجتے ہوئے وہ مجھے بے حد پیارے لگے۔

"مگر چچا ——" میں نے دبی زبان سے کہا اوّل تو میں دلفگار مینڈک نہیں لکھتی۔ دوسرے یہ کہ ابّا جان تو اردو کے اولین ترقی پسندوں میں سے تھے۔ آپ نئے ادب سے اتنے خفا کیوں ہیں۔؟"

"مگر سجاد دلفگار مینڈک نہیں لکھتا تھا۔" انہوں نے گرج کر کہا ——

"ارے گریسی ——" انہوں نے اسی رو میں آواز دی۔ "ادھر آؤ دیکھو کون آیا ہے ——"

دوسرے لمحے ایک کھچڑی بالوں والی بوڑھی سی عورت ساری کا پلو کمر میں کھونسے جھاڑن سے ہاتھ پونچھتی برآمدے میں نمودار ہوئی۔ ذرا ٹھٹھکی اور قریب آ کر مجھے ذرا جھک کر اور آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

"اری احمق الذین —— پہچانتی نہیں یہ کون ہے؟" چچا نے کہا۔

"اوہ ــــ اوہ ــــ مائی ڈارلنگ ڈارلنگ لٹل سویٹ لٹل گرل ــــ" گریس نے چلا کر کہا اور مجھ سے لپٹ گئی۔

"ابھی یہ سسکیوں سے رونا شروع کر دے گی ــــ" ناصر چچا نے ذرا غصے سے کہا "لاحول ولاقوۃ ــــ گریس ــــ جاؤ۔ بی بی کے لئے کھانے کا انتظام کرو ــــ خوب مزیدار چیزیں پکاؤ ــــ" انہوں نے ایک بہت پرانی آواز میں اضافہ کیا۔

"کم اِن ــــ کم اِن ــــ ہاؤ آر یو مائی چائلڈ ــــ کم ایلونگ ــــ" گریس نے حسبِ عادت مارے خوشی کے اپنی بے نقط کی انگریزی شروع کی، اور مجھے کاٹیج کے اندر لے گئی۔

یہ ایک بہت بڑی کوٹھی کے احاطے کے اندر بنا ہوا کاٹیج تھا جو غالباً تقسیم سے قبل ہندو مالک مکان کا مہمان خانہ رہا ہوگا اور ناصر چچا نے بھاگ دوڑ کروا کے اسے اپنے نام الاٹ کروالیا تھا۔ انھیں یہاں آئے تقریباً ایک سال ہو گیا تھا مگر گھر کے انداز سے ایسا لگتا تھا۔ جیسے مسافروں کی طرح بیٹھے ہیں۔ میں نے بمبئی کے فلیٹ کی مانوس چیزوں کی تلاش میں نظریں دوڑائیں مگر سعیدہ چچی کی بڑی روغنی تصویر کے علاوہ اور کوئی چیز اس جگہ پر ماضی سے منسلک نہ تھی۔ چچا پرانی زندگی سے سارے رشتے منقطع کر چکے تھے۔ مجھے دفعتاً ایک بھیانک سا خیال آیا۔ کہ شاید ناصر چچا اب زیادہ دن زندہ نہ رہیں گے۔ دوسرے لمحے

مجھے اپنے اس خیال پر بڑا غصہ آیا —— کہ میں نے ایسی بدشگونی کی بات کیوں سوچی !!

گریس تیز تیز بولتی ہوئی مجھے باورچی خانے میں لے گئی جو اس نے حسبِ معمول بہت صاف ستھرا رکھا ہوا تھا۔ کھڑکی میں تازہ پھولوں سے بھرا گلدان تک دھرا تھا۔ اس نے فوراً پکانے ریندھنے کا انتظام شروع کر دیا۔ میں ایک مونڈھے پر بیٹھ کر اسے دیکھتی رہی۔

"گریس —— تم تو بوڑھی ہو گئیں ——" میں نے تاسف سے کہا۔

وہ انگیٹھی دہکاتے ہوئے میری طرف مڑی اور آہستہ سے بولی —— "میرا نام مت لو —— مجھے گریس چچی کہو ——"

"اوہ —— اچھا ——" میں نے جواب دیا۔ انگیٹھی کا دھواں میری آنکھوں میں گھسا تو میں نے آنکھیں میچ لیں اور مجھے دفعتاً بمبئی کی وہ طوفانی رات یاد آگئی جب گریس نے مریم سے جھگڑا کرنے کے بعد صلح کر لی تھی اور مجھے مرلیکل کے متعلق بتانے سے منکر رہی تھی —— "مبارک ہو، گریس چچی، تم اس عزت کی مستحق تھیں۔" میں نے آنکھیں کھولتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

گریس چچی نے سرعت سے پیڑے کاٹنے شروع کیے۔

"گریس چچی! تم نے ملازم نہیں رکھا۔ سارا کام خود کرتی ہو؟" میں نے کہا۔

"تمہارا انکل کا پنشن ادھر بہت دیری میں ملتا ہے۔ ہم لوگ کا سارا روپیہ ادھر پھنسا ہے۔ ہم لوگ کا بہت مشکل سے گذر ہوتا ہے اور نوکر کا کیا ضرورت ہے۔

تمہارا انکل کا خدمت کے لئے کیا ہم نہیں ہے؟ بالوں کی ایک کھچڑی لٹ پیشانی پر سے ہٹا کر انہوں نے کہا — " اُدھر ہمارا بچہ ضد کیا کہ پاکستان جائے گا۔ بزنس کرے گا۔ بمبئی میں اس نے کچھ اسٹڈی نہیں کیا۔ اسکول چھوڑ دیا پھر اُدھر اس کو سروس کیسے ملتا؟ پنشن کے بعد صاحب کلکتہ جاکر رہنا مانگتا تھا۔ مگر ہم لوگ بچے کے خیال سے ادھر آگیا۔ ادھر بھی سب ٹھیک ہے۔ گاڈ از گڈ — "

" تمہارا انکل بہت بیمار رہتا ہے۔ بمبئی میں ہندو مسلمان کی مارا ماری کے زمانے میں موالی لوگ جگہ جگہ آگ لگاتا تھا۔ تمہارا انکل اسے بجھانے کے لئے سارے میں بھاگا پھرتا تھا۔ ایک ہندو فیملی کو آگ سے بچاتے میں اپنی ٹانگ توڑ دیا۔ چھ مہینے بستر پر پڑا رہا۔ اس کے بعد سے اس کا ہیلتھ گر گیا۔ گاؤٹ کا تکلیف زیادہ ہو گیا۔ ہائی بلڈ پریشر ہو گیا۔ اب اس کا غصہ بہت تیز ہو گیا ہے۔ ہمارا اتنا شاندار صاحب ایک دم بوڑھا ہو گیا۔ ایک دم اولڈ مین بن گیا۔ پھر انہوں نے خالص ہیرئیوں کے انداز میں شکایت کرتے ہوئے کہا " ہم کہتا ہے کہ پرہیزی کھانا کھائے مگر وہ الم غلم کھانا مانگتا ہے اور ہم سے لڑتا ہے۔ "

" جب چھ سات برس اُدھر ہم تمہارے انکل سے شادی بنایا تو اس کو بول دیا تھا کہ اگر تم ہمارے ساتھ کوئی نان سنس کرے گا تو ہم تمہیں چھوڑ کر چلا جائے گا — " انہوں نے مصنوعی غصے سے کہا۔

"اب بیماری سے وہ بہت چڑچڑا ہو گیا ہے۔ خالی ہم اس کی بات سمجھ سکتا ہے۔ دنیا میں اس کا اب اور کوئی ساتھی نہیں ہے۔ اور ہم خدا سے اب صرف یہی مانگتا ہے کہ اپنے آخری سانس تک اس کی خدمت کرتا رہے ——"

شاید دھوئیں کی وجہ سے گریس چچی کی آنکھ میں پانی آ گیا تھا۔ انہوں نے پلو سے آنکھیں پونچھیں اور توا چڑھا دیا۔

"چچا ڈاکٹر سے علاج تو باقاعدہ کروا رہے ہیں نا؟ علاج میں تو ضد نہیں کرتے؟"

میں نے پوچھا۔

"بہت ضد کرتا ہے" گریس چچی نے چپاتی بیلتے ہوئے جواب دیا" ابھی محرم میں ہم اِدھر نواب قزلباش کے امام باڑے میں جا کر چاندی کا بڑا ضریح سے کلاوہ باندھا۔ جب صاحب اچھا ہو جائے گا تو اگلے سال امام حسینؑ کو چاندی کا گہنا چڑھائے گا —— انشاء اللہ ——"

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی "گڈ اولڈ گریس چچی" اب تم یہ سب بھی کرنے لگیں ——!"

"وائی ناٹ ——؟" انہوں نے چپاتی توے پر ڈالتے ہوئے کہا "جب ہم اُدھر بمبئی میں شادی بنایا تو مولوی صاحب نے ہمارا نام کنیز زہرا رکھا اور ہمارے کو کلمہ پڑھایا۔ سناؤں ——؟"

"ضرور ——!"

"___"

"ہیر — ہیر ——— ونڈرفل ۔ گریس چچی کمال کر دیا ۔ اتنا لمبا چوڑا کلمہ فر فر یاد ہے !"

اور اسی سانس میں انہوں نے پھکنی اٹھا کر دوسرے چولہے کی آگ تیز کرنا شروع کی اور بڑبڑائیں ——— "ڈس ڈیم بلیڈی کوئلہ ———"

گریس چچی نے اپنے بیٹے کا مزید تذکرہ نہیں کیا ۔ بیٹے نے شاید دونوں ماں باپ کو بہت مایوس کیا تھا ۔

میں کراچی واپس آگئی ۔ تین سال بعد اطلاع ملی کہ ناصر چچا کا انتقال ہو گیا ۔ اور علی اصغر بزنس کے لئے ڈھاکہ چلا گیا ۔ اور مشرقی پاکستان روانہ ہونے سے قبل اس نے گریس چچی سے کہا کہ بزنس کے سلسلے میں اسے جانے کہاں کہاں پھرنا ہوگا ۔ اور انھیں پردیس میں بہت زحمت ہوگی اس لئے وہ اپنے وطن واپس چلی جائیں ۔ شاید وہ اپنے دوستوں کو یہ بتاتے ہوئے جھینپتا تھا کہ گریس چچی اس کی ماں ہیں

اگر علی اصغر گریس چچی کا سگا بیٹا ہوتا اور اسے ان سے دلی ، فطری محبت ہوتی ، تب بھی ممکن تھا اپنی شادی کے بعد وہ ان سے یہی برتاؤ کرتا ۔ ماؤں کے ساتھ اکثر یہی کیا جاتا ہے اور گریس چچی ماں تھیں ۔

گریس چچی جانے کہاں گئیں ۔ بمبئی واپس آگئیں ۔ یا گوا چلی گئیں ، یا کہاں

غائب ہو گئیں ۔ دنیا بہت بڑی ہے اور گریس بی بی ایک بہت بے بضاعت، گمنام، غیر اہم بوڑھی عورت تھیں ۔

بدھ کی شام کو ماہیم کے چرچ آف سینٹ مائیکل میں کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ گرجا کا ہال، ہشت پہلو صحن اور سامنے کی فٹ پاتھ ۔۔۔۔ عبادت گذاروں سے کھچا کھچ بھری ہوتی تھی ۔ دور دور تک دکانیں لگتی ہیں جن میں موم کے بچے اور ہاتھ، پاؤں، ناک، کان بکتے ہیں اولاد کی بھوکی عورتیں، غرض مند لوگ بیمار، روگی، اپاہج اپنی اپنی مراد کے مطابق موم کے بچے اور دیگر اعضاء خرید کر مریم کے بڑے مجسمے کے سامنے چڑھاتے ہیں اور منت مانتے ہیں، کہ مراد پوری ہونے پر یہی چیزیں چاندی کی چڑھائیں گے ۔ ماہیم کے بس اسٹاپ پر چھوٹے چھوٹے بچے بس کے مسافروں سے مصر ہوتے ہیں کہ ان سے موم بتیاں اور پھول خریدے جائیں ۔ گرجا کے اندر سنہرا تاج پہنے اور نیلے لبادے میں ملبوس بے حد پیاری شکل والی مریم کا بلند و بالا مجسمہ استادہ ہے ۔ اس کے نیچے ایک چھوٹی سی بازنطینی تصویر مقدس ماں اور بیٹے کی ہے ۔ ان ساری منتوں، مرادوں اور دعاؤں اور وظیفوں کا مرکز یہ چھوٹی سی تصویر ہے جس کے لئے کہا جاتا ہے کہ معجزنما ہے ۔ ہر مذہب اور ہر نسل کے لوگ آ آ کر اس تصویر سے اپنا دکھ درد کہتے ہیں ۔

ماہیم کا یہ چوراہا بہت معروف جگہ ہے۔ اس کے ایک طرف ای ایس۔ ٹی بسوں کا اسٹیشن ہے۔ اس کے سامنے شیخ اسماعیل عمر اور رحمت اللہ حاجی اسمٰعیل پٹیل کے بانسوں کے ٹال کھڑے ہیں اس سے ملحق ماہم کریک ہے جہاں پانی میں خالی ڈونگیاں تیرتی رہتی ہیں۔ ماہی گیروں کی میلی میلی کشتیاں کھڑی رہتی ہیں اور کریک میں سے گزرنے والی سڑک بمبئی کے جزیرے کو سیلسٹ کے جزیرے سے منسلک کرتی ہے۔ اس سڑک کے دونوں طرف مچھیروں کے سُرخ کھپریل کے گھر اور ٹین کی جھگیاں سمندری پتوں میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اس سڑک کے کنارے کنارے محرّم کے زمانے میں سبیلیں لگائی جاتی ہیں۔ جن پر چاند تارے والے سبز اسلامی جھنڈے سمندری ہوا میں لہراتے رہتے ہیں۔

یہیں کچھ فاصلے پر پانی کے کنارے مخدوم شاہ باباؒ کا مزار ہے جہاں ہر سال دھوم کا عرس ہوتا ہے اور جمعرات کے روز برقعہ پوش عورتوں کے انبوہ جمع ہوتے ہیں۔

باندرہ، جوہو اور اندھیری جانے والی بسوں اور موٹروں کی لامتناہی قطاریں اس راستے پر سے گزرتی رہتی ہیں۔ یہیں پر ماہیم نالہ ہے اور پولیس کے سپاہی مضافات سے آنے والی ٹیکسیوں کو روک کر اندر جھانکتے ہیں کہ خانہ ساز ناجائز شراب تو اسمگل کر کے شہر میں نہیں لائی جا رہی۔

اس سڑک کے دوسرے سرے پر باندرہ کی خوبصورت اور سُبک نقش و

نگار والی سنگ سفید کی مسجد ہے جو ماہِ رمضان میں برقی قمقموں کے چراغاں سے جگمگاتی رہتی ہے۔ اور دن بھر اس کے شفاف فرش پہ بیٹھے ہوئے نمازی اس کی نازک جالیوں کے اندر سے نظر آتے رہتے ہیں۔ اس ... کے آگے بڑھ کر تالاب ہے اور "اسلامی ہوٹل" اور "شانِ محمدی ریسٹوران" اور "سبحان اللہ کیفے ..."

کریک کی سڑک پر سے بہت دور افق پر گھاٹ کی بھوری پہاڑیاں نظر آتی ہیں جن کے دامن میں ساحلی جھیلیں اور کھاری پانی کے قطعے ہیں۔ اور گاؤں ہیں مونسون کے دنوں میں ندی نالے بہنے پھرتے ہیں۔ اس سڑک کے بائیں جانب سطحِ آب کے اس پار ناریل کے جھنڈوں اور گھنے درختوں سے ڈھکا ہوا باندرہ کا جزیرہ نما ہے۔ اور ان درختوں میں سے نکلے ہوئے ماؤنٹ میری کے دو مینارے دور سے نظر آتے ہیں۔ اسی جزیرے نما پر پالی ہل ہے۔ جس کے اوپر محیر العقول زندگی گزارنے والے فلمی ستارے رہتے ہیں۔ جن کے محیر العقول وجود کی بنا پر ملک کے بیشتر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے ذہنوں نے "عروس البلاد بمبئی" کو جنت الفردوس کا درجہ عطا کر رکھا ہے اور جن فلمی ستاروں اور ان کے نگار خانوں تک رسائی کے لئے ان کے یہ نوجوان چست پوش پرستار بقول شخصے اپنا داہنا ہاتھ تک دے سکتے ہیں۔ اور آگے جا کر جوہو کا ساحل ہے۔ جہاں ناریل کے اونچے اونچے نظر

قریب جھنڈ ہیں اور جہاں چوڑے پتوں اور بڑے بڑے سُرخ پھولوں والے ٹروپیکل درختوں کے سائے میں بڑے رومینٹک اور افسانوی ناموں والے ہوٹل، تفریح گاہیں اور کاٹیج چھپے ہوئے ہیں۔

باندرہ کے جزیرہ نما پر ماؤنٹ میری ہے ——— نوزا سینٹرا دو مونتے ——— پہاڑی کی خاتون مریم۔ ساڑھے تین سو برس قبل پرتگالیوں نے یہاں مریم کا ایک معبد تعمیر کیا تھا۔ اور پچھلی صدیوں میں باندرہ کے پرتگالی قلعہ داروں اور ماہیم کے انگریز قلعہ داروں کے مابین خونریز لڑائیاں اور گولہ باریاں ہوا کرتی تھیں۔

اس خوبصورت پہاڑی کے تین طرف سمندر ہے اور کیلے اور تاڑ اور کھجور اور رنگ برنگے درختوں میں چھپی بل کھاتی ہوئی سڑکیں پالی ہل کی طرف جاتی ہیں اور ان درختوں کے نیچے لکڑی کے جنگلوں اور چھجوں والے "اولڈ ورلڈ" دو منزلہ بنگلے کھڑے ہیں قدیم پرتگالی گرجا کی جگہ پر ایک شاندار دیتا چرچ ایستادہ ہے اور اس کے احاطے کی اسٹال پر بھی موم کے بچے اور انسانی اعضاء بکتے ہیں اور ہر سال ۸ ستمبر کو یہاں بڑا بھاری میلہ لگتا ہے۔ گرجا کے مقابل میں ورجن میری کی ایک اونچی شرائن ہے۔ جس پر وہ سمندر کی طرف پشت کئے کھڑی ہیں۔ اور دونوں جانب سے سیڑھیاں مجسمے کی سمت جاتی ہیں ——— ان سیڑھیوں کے مختلف مقامات ہیں ——— دعا، عقوبت نفس

دکفارہ ـــــ مراقبہ ـــــ تسبیح ـــــ اصلاح نفس وبخشش ـــــ قربانی ـــــ سب سے اونچا مقام ـــــ شانتی اور سکون قلب ـــــ مقام مریم ہے۔ زائرین اپنے اپنے عذاب دل میں لئے گھٹنوں کے بل ان سیڑھیوں پر چڑھتے ہیں اور مریم کا دامن پکڑ کر رحم اور مدد کے طالب ہوتے ہیں اور مریم مسکراتی رہتی ہیں۔ اوران کے پیچھے افق سے افق تک پھیلا ہوا سرمئی سمندر لہریں مارتا رہتا ہے۔

اسی سمندر میں ساحل کے کنارے کئی میل دور جاکر دعاؤں کا ایک اور مرکز ہے جو پانی میں ایک چھوٹے سے ٹاپو پر کھڑا ہے۔ یہ حاجی علی کی درگاہ اور مسجد ہے اور ورلی کی سڑک سے اس درگاہ تک جانے والی پگڈنڈی جوار بھاٹا کے ساتھ ساتھ پانی میں ڈوبتی اور ابھرتی رہتی ہے۔ جمعرات کے روز یہاں قوالیوں کا ہنگامہ رہتا ہے۔ اور حاجی علی کے بس اسٹاپ پر بچے اور عورتیں اگربتیاں اور چڑھاوے کے پھول بیچتی ہیں۔ برقعہ پوش عورتوں کے ہجوم درگاہ کی طرف جاتے دکھلائی دیتے ہیں۔ اور رات کی سیال تاریکی میں درگاہ ننھے سے لائٹ ہاؤس کی طرح جھلملاتی ہے۔ حاجی علی سے چند فرلانگ کے فاصلے پر مہالکشمی کا مندر ہے۔ جہاں منگل کی شام کو رنگ برنگی ساریوں کے پلو آگے ڈالے۔ بالوں میں موگرے کے ہار سجائے، بڑی بڑی آنکھوں اور متین چہروں والی گجراتی عورتوں کی ٹولیاں آرتی کے لئے جمع ہوتی ہیں اور

جب سُرخ رنگ کا مدھم مدھم دہکتا ہوا آفتاب سرعت سے پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ اور سمندر کی نیلاہٹ اور شفق کا سیندور ایک دوسرے میں تحلیل ہو جاتے ہیں تو اس کاسنی سناٹے میں مندر کے گھنٹے کی آواز پانی کی لہروں کی طرح نرم روی سے پھیلتی چلی جاتی ہے۔

بدھ کی شام کو ماہیم کے گرجا میں کھوے سے کھوا چھلتا ہے، کیونکہ یہ نوویناؔ کے وظیفے کا دن ہے۔

ایک دن میں سامنے سے گزرتے ہوئے گرجا کے اندر چلی گئی۔ ابھی نوویناؔ کا مجمع آنا شروع نہیں ہوا تھا۔ ہال میں اکّا دکّا عورتیں بنچوں پر بیٹھی تھیں یا گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی تھیں۔ قربان گاہ پر للی کے سفید پھولوں کے انبار رکھے ہوئے تھے۔ اور سنہری موم بتیاں کا دھواں بن کر اس مجسمے کے قدموں میں منڈلاتی رہی ہیں۔ اور میں نے سوچا کہ یہ بات کیا ہے کہ ہر جگہ مندروں اور تیرتھ استھانوں میں درگاہوں اور مزاروں کے سامنے گرجاؤں اور امام باڑوں اور گردواروں اور آتش کدوں کے اندر —— یہ عورتیں ہی ہیں جو رو رو کر خدا سے فریاد کرتی ہیں اور دعائیں مانگتی ہیں۔ ساری دنیا کے معبدوں کے سرد، بے حس پتھر عورتوں کے آنسوؤں سے دھلتے رہے ہیں۔ عورتوں نے ہمیشہ اپنے اپنے دیوتاؤں کے چرنوں پہ سر رکھا اور کبھی یہ نہ جاننا چاہا کہ اکثر یہ پاؤں مٹی کے بھی ہیں۔

عورتیں اتنی پرستار، اتنی پجارنیں کیوں ہیں؟ اس لئے کہ وہ کمزور ہیں؟ اور سہارے کی حاجت مند ہیں؟ اس لئے کہ وہ اس مختصر سی زندگی میں بہت سے لوگوں سے بہت زیادہ محبت کرتی ہیں؟ باپ بھائی، شوہر، اولاد، پوتے نواسے، ان سب کے تحفظ اور ان کی سلامتی کے لئے فکر مند رہتی ہیں؟ شوہر یا محبوب کے پیار اور محبت کی ضمانت کسی ان دیکھی طاقت سے چاہتی ہیں؟ اپنے بچوں کے مستقبل کے لئے ہراساں رہتی ہیں؟ آخر عورتیں خدا کی اس قدر ضرورت مند کیوں ہیں؟ عورتیں کمزور ہیں؟ مگر ویلینٹینا بھی تو ہے جو عین اس وقت خلا کے سفر میں مصروف ہے...... اور عورت کمزور بھی ہے؟

"نان موز بے کرپن بھر دے سوچی تجھے سنگاتا ——" اگلی بنچ پر بیٹھی ہوئی ایک کونکنی لڑکی نے اپنا بچہ گود سے اتار کر پاس بٹھایا اور جھک کر دعا شروع کی ——

ذرا عورتوں کی ہمت دیکھیے۔ یہ معاشرے کی تخلیق اور پرداخت کی ذمہ داری سنبھالتی ہیں۔ جب یہ دلہن بنتی ہیں تو انھیں ہزار برس کی نیو کہا جاتا ہے یہ موت کے منہ میں جا کر ایک نئی زندگی دنیا میں لاتی ہیں۔ یہ تکلیفیں اٹھاتی ہیں افلاس اور تنگ دستی کا مقابلہ کرتی ہیں شوہر کی بے وفائی کا سامنا کرتی ہیں۔ سوت کا جلاپا سہتی ہیں۔ لیکن امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں۔

"استرام تبر توسد لو نال تجھے کسی چے جنیرس۔ درسادی تساتیا ان سدا

سرنتا ـــــ آمین ـــــ"

سوسائٹی میں جگمگانے والی "میم صاحبیں" لاکھوں روپیہ کمانے والی فلم ایکٹریسیں بین الاقوامی شہرت کی رقاصائیں، گلیمرس ماڈل لڑکیاں، یونیورسٹیوں کی ریسرچ اسکالرز، حکومت کی اعلیٰ افسر، ایرکنڈیشنڈ بنگلوں میں رہنے والی سوشل ورکرز، غلیظ کھولیوں میں رہ کر شرابی شوہروں کی مار کھانے والی مزدورنیں، دفتروں میں چھوٹی چھوٹی نوکریاں کرکے بڑے بڑے کنبے پالنے والی کلرک لڑکیاں شاندار فلیٹوں میں رہنے والی، دولت مند تاجروں کی حسین داشتائیں، کولابہ کی سڑکوں پر ٹہل کر گاہک تلاش کرنے والی فیشن ایبل طوائفیں۔ سفید گلی میں دھندا کرنے والی ٹکہیائیاں بیویاں اور باندیاں، رانیاں اور داسیاں بھولی بھالی اور تریا چتر والی، تعلیم یافتہ اور جاہل، معصوم اور روبیپاڑہ ملحد اور ادہام پرست ـــــ ان سب پر اپنی اپنی جگہ کیا گزرتی ہے؟

"ان آنم بابا۔ انی پترا، اسپرتیا۔ سنتا چے آمین ـــــ" لڑکی نے بچے کو گود میں لے کر اپنے سے لپٹا لیا۔ اور روتی رہی۔ شاید اس کے شوہر نے کسی دوسری عورت کے پیچھے اسے چھوڑ دیا تھا۔ شاید وہ بیوہ ہو گئی تھی۔ شاید اسے اس کے گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ کون جانے وہ کس لئے یوں روتی تھی۔

"سنتا مورتیے دیواچے مائے امپاپیا کتر دناتی کر۔ ـ آمین ـــــ"

وہ اٹھی۔ صلیب کا نشان بنایا۔ قربان گاہ کے آگے ایک گھٹنا ٹیک

کر جھکی اور بچے کو گود میں لئے لئے باہر چلی گئی۔

مجھے گریس چچی یاد آ گئیں۔ انہوں نے بھی اسی طرح شاید اسی بنچ پر بیٹھ کر گڑگڑا کر دعائیں مانگی ہوں گی۔

اور ورجن نے ان کی دعا سن لی ـــــ؟

یا یہ محض ایک اور اتفاق تھا ـــــ؟

فلسفی گریس چچی کے لئے کیا کہیں گے؟ اور عقلیت پرست اور ملحد۔ ہر ایک کے پاس اپنا اپنا علیحدہ جواب موجود ہے۔ میں یہ کس سے پوچھنے جاؤں؟ ابا جان مدتیں ہوئیں ختم ہو چکے۔ جن سے میں طرح طرح کے بچگانے سوالات کیا کرتی تھی۔ اور ناصر چچا یعنی نواب زادہ سید علی ناصر خان ایم اے۔ ایل ایل بی (علیگ) بھی عرصہ ہوا اپنے دوست سے جا ملے۔ اب میں کس سے جا کر پوچھوں کہ کیا زندگی میں واقعی معجزے ہوتے ہیں؟ اذیت اور افلاس اور بے انصافی اور بے رحمی اور تشدد سے بھری ہوئی اس دنیا میں معجزے ہوتے ہیں ـــــ؟

عبادت گزار اب آ آ کر ہال کی بنچوں پہ بیٹھ رہے تھے۔ میں سوچا کی۔ گریس چچی اس وقت جانے کہاں ہوں گی۔ اس بڑھاپے میں کیا اسی بمبئی میں کہیں آیا گری کر رہی ہوں گی؟ (کیونکہ ان کے پاس زندگی گزارنے کے لئے ایک محبت بھرے دل کے علاوہ اور کوئی بھی کوالی فکیشن نہیں تھی۔) کیا اب

بھی وہ اس بنچ پر آن کر بیٹھتی ہوں گی - اور وہ جن کو مخاطب کر کے کہتی ہوں گی۔
"دیکھو ماں ——— ہم تمہارے کو ایک بات بولتا ہے - کان کھول کر سن لو ——
تم نے ہمارا وِش پورا کیا - ہمارے بچے کے لئے گھر کا سیکورٹی بنائے رکھا - ہمارا
صاحب ورلڈ کا گریٹیسٹ، فائینسٹ مین تھا - مگر وہ ہمیں اس دنیا میں اکیلا
چھوڑ کر چلا گیا - اب ہم پھر تمہارے پاس آیا ہے ——— بتاؤ اب ہم کیا کرے -
ایک دم جلدی بولو ——— ورنہ ہمارا تمہارا دوستی ختم ———"

اور مجھے ایک لحظے کے لئے ایسا لگا جیسے گریس چچی سچ مچ میرے نزدیک بیٹھی
عبادت میں مصروف ہیں - میں نے مڑ کر دیکھا، مگر وہ میرا واہمہ تھا -

گریس چچی کے بجائے میرے برابر میں موٹے موٹے ہونٹوں والی کوئی گوانی
عورت اودے رنگ کی سبز کنارے والی ساری میں ملبوس بالوں میں سفید
پھولوں کا گجرا لپیٹے کہنیوں تک پھنسی پھنسی آستینوں کا کھن بلاؤز پہنے - سیاہ
ریشمی جالی سے سر ڈھانپے خاموشی سے تسبیح پھیرنے میں مشغول تھی -

میں نے چاروں طرف نظر ڈالی - گرجا اب عقیدت مندوں سے کھچا کھچ بھر
گیا تھا - میں خاموشی سے اٹھی اور باہر آ گئی -

سڑک پر ٹریفک کا ہجوم تھا - لیکن عجیب سی خاموشی طاری تھی - سامنے
کریک پر شام کا نیلگوں اندھیرا چھا رہا تھا - اور سمندری ہوا میں دُور کے زمانوں اور
گم شدہ آوازوں کی گونج تھی - میں نے دُور جزیرہ نما کے افق پر جھکے ہوئے سناٹے

کو دیکھا اور مجھے ایک مرہٹی نظم —— یاد آگئی ——

"نیلا آسمان ہری
تنہا ستارہ رادھا
کھوئی ہوئی
وہ دل کی تمنا ہے۔
سارے زمانوں میں
وسیع زمین گووندا
دھان کا کھیت رادھا۔
ازل سے ابد تک باوفا
وہ مدھر زبان والی ہے۔
سارے زمانوں میں
سیدھا بہتا ہوا دریا کرشن
کنارے پر جھکا ہو جنگل رادھا۔
جو کوئی سوال نہیں کرتی
مجسّم تسلیم و رضا
وہ ابدی راحت ہے۔
سارے زمانوں میں ——"

سیاہ سمندر پر روشنیاں ٹمٹمانے لگیں۔ میں پھاٹک پر کھڑے ہوئے عبادت گذاروں کی بھیڑ میں سے نکلتی ہوئی، فٹ پاتھ پر آگئی اور سڑک عبور کرنے کے لئے سُرخ رنگ کے اس مہیب فائر انجن کے گزرنے کا انتظار کرنے لگی۔ جو ٹن ٹن کرتا زناٹے سے باندرہ کی طرف نکلا جارہا تھا۔۔۔۔

آئینہ خانے میں

جب بھی مجھ سے اپنے بارے میں لکھنے کے لئے کہا جاتا ہے تو مجھے بڑی سخت اُلجھن اور اُس سے زیادہ ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ میں اپنے متعلق کیا کہوں۔ ہر شخص کو اپنے بارے میں بہت خوش فہمیاں ہوتی ہیں۔ اپنی ساری کمزوریوں اور خامیوں کو جانتے ہوئے بھی وہ خود کو دھوکا دینا چاہتا ہے کہ وہ بہت اچھا ہے۔ دوسرے ہی اُسے غلط سمجھتے ہیں۔ اور اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں اتنا کچھ لکھنے کے بعد بھی کچھ نہ کہہ سکی۔ میں نے اپنی صلاحیتوں کے مطابق بہت کوشش کی کہ زندگی کے بھیدوں کو نئی تخلیق اور تجربوں، دوردن اور رنگوں اور صدیوں کی حدوں میں باندھ لوں میں نے دلوں، دماغوں اور روحوں کے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ میں نے ان لوگوں کے بارے میں سوچا

جنہوں نے زمانہ اور دل کی کسک، اور روحانی خلا اور تنہائی اور خوف اور شک و شبہ اور دہشت کے اندرونی مرکز پر خود کو اکیلا پایا۔ لیکن چاروں طرف اندھیرا تھا اور سناٹا اور اس سناٹے میں لاکھوں کروڑوں انسان جیتے اور مرتے رہے۔ میرے ساتھ اور مجھ سے علیحدہ۔ میں نے زمین کا کاروبار نپٹائے بغیر آسمان کی طرف دیکھا اور زندگی کی لامحدودیت نے مجھے ششدر کر دیا۔

ہزاروں بار دہرائی ہوئی بات ہے کہ انسان کے خیالات اور کردار کی تشکیل میں اس کی پرورش، اُس کے ذہنی اور شعوری پس منظر اور اس کے گھرانے کا بہت دخل ہوتا ہے۔ میرے والد سید سجاد حیدر یلدرم اردو کے بہت بڑے صاحبِ طرز ادیب اور اُردو افسانہ نگاری کے پیش روؤں میں تھے۔ انہوں نے اُردو زبان کو نہ صرف فکری، فلسفیانہ اور لطیف ادب ہی دیا بلکہ اس میں حسن کاری کے نئے رنگ ڈھنگ بھی پیدا کئے۔

ترکی سے ان کو محبت تھی۔ بہت سے ترکی ڈرامے اور ناولیں اُردو میں ترجمہ کر کے آج سے نصف صدی پہلے اُنہوں نے اُردو کو ترکی اور یورپی خیالات اور طرزِ اظہار سے روشناس کرایا۔ وہ ادیب کے علاوہ ایک بڑے باکردار اور نیک خصلت شخص تھے۔ اور بہت ہی پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ میری والدہ بھی کم و بیش پچاس پچپن برس سے لکھ پڑھ رہی ہیں۔ وہ اپنے زمانے میں سماجی اور اصلاحی ناول نگار کی حیثیت سے بہت ہی مقبول رہی ہیں۔

وہ گنتی کی اُن مسلمان عورتوں میں ہیں جنہوں نے آج سے ۵۰ سال قبل سب سے پہلے شمالی ہندوستان میں پردہ چھوڑ کر قومی اور تعلیمی کاموں میں بڑی لگن سے حصّہ لیا۔

والد صاحب کے عزیز اسکول ساتھیوں اور قریبی دوستوں میں وہ لوگ شامل تھے جنہوں نے ملک کی سیاسی و تہذیبی تاریخ کو اپنی شخصیتوں سے روشن کیا۔ ان سب کا ذکر میں بچپن سے اپنے گھر میں سنتی آتی تھی۔ ملک کے بہت سے عظیم عالموں، ماہران تعلیم، شاعروں اور ادیبوں کی دھندلی دھندلی یادیں اب بھی میری یادداشت میں محفوظ ہیں۔ نامور لوگ اور گمنام سیدھے سادھے انسان جگمگاتی ہوئی عظیم شخصیتیں اور خاموش منکسر مزاج مرد اور عورتیں۔ ان سب کا ہجوم میرے چاروں طرف رہا۔ بچپن میں ذہنی اور عقلی سچائی اور انسان دوستی کی اہمیت میرے والد نے مجھے اچھی طرح ذہن نشین کرادی تھی۔ اس لئے آگے چل کر جب زندگی کے چند بھیانک موڑ میرے سامنے آئے تو میں اپنے آپ سے کسی طرح سمجھوتہ نہ کرسکی۔

نوکری کے سلسلے میں ہر تیسرے سال والد صاحب کا ایک جگہ سے دوسری جگہ تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ اور اُن میں سے بعض مقامات بے حد انوکھے تھے میں علی گڈھ میں پیدا ہوئی اور انڈمان کے ٹاپوؤں میں

ہوش سنبھالا۔ چاروں طرف سمندر تھا۔ اور ناریل کے جھنڈ اور عظیم اور گہرا سناٹا۔ انڈمان کے ٹاپوؤں کے بعد اتر پردیش کے دور افتادہ مشرقی اضلاع اور خاموش پہاڑی مقامات —— دس بارہ سال کی عمر تک میں نے بہت سے شہر دیکھے۔ کئی سمندری سفر کئے۔ ممالک غیر بھی گئی۔ بچپن کی یادوں کا ایک فانوس ہے جو میری یادداشت میں جھلملاتا رہتا ہے۔

میں اکثر بیمار رہتی تھی یا والدہ صاحبہ کا خیال تھا کہ بیمار رہتی ہوں اس وجہ سے باقاعدہ طور پر اسکول کبھی نہیں گئی۔ بچپن زیادہ اکیلے گزرا کیونکہ میرے اکلوتے بڑے بھائی مجھ سے عمر میں سات سال بڑے ہیں، میں دن رات باغ میں آم کے پیڑوں کے نیچے کھیلا کرتی۔ اور کہانیاں بنتی رہتی۔ میری دل پسند کہانی یا دن کا خواب یہ تھا کہ میں ایک بے حد غریب کسان کی لڑکی ہوں (ہمارے مالی کی دس سالہ بیوی رام دئی اس بارے میں میری آورش تھی)، اور میں اپنا چھوٹا سا بقچہ سنبھال کر اس کوٹھی میں آئی ہوں اور یہاں نوکر ہو گئی ہوں۔ سب کی نظر بچا کر میں اکثر فرش پر اکڑوں بیٹھ جاتی اور رام دئی کی نقل میں ایک ہاتھ پر روٹی رکھ کر کھانا کھانے کی کوشش کرتی۔ اور اس کے بعد نیلا ٹیونک پہن کر اپنے کانونٹ جاتی اور آئرش ٹیچر سے پیانو بجانا سیکھتی۔

تبھی سے میں نے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ پہلی کہانی شاید سات

سال کی عمر میں لکھی تھی، جو مجھے اب تک یاد ہے کہ اس طرح شروع ہوئی تھی "رات کے بارہ بجے تھے کاٹھ گودام کے اسٹیشن پر قلی لالٹین لئے اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے تھے ——" ہیروئن شاید میری گڑیا تھی جو خود ہی ٹکٹ خرید کر پاؤں پاؤں چل کر غلط ٹرین میں بیٹھ گئی تھی۔

میں نے شروع میں لکھا ہے کہ مجھے سچائی اور ایمانداری کا سبق بہت شدت سے پڑھایا گیا تھا۔ ہمارا خاندان اپنی جاگیردارانہ روایات کے باوجود خاصا دقیانوسی اور مولویت کا رنگ لئے ہوئے تھا۔ یہ لوگ ماڈرن بھی تھے اور پُرانی قدروں سے محبت کرنے والے بھی۔ ایمانداری کے سلسلے میں مجھے بچپن کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ دہرہ دون میں ہمارے باغ میں بے حد نفیس لیچیاں تھیں۔ والدہ صاحبہ نے منع کر دیا تھا کہ لیچیاں چھونا بھی نہیں، کھانسی ہو جائے گی۔ لہٰذا میں گرمیوں کی سنسان دوپہریا میں سرخ سرخ لیچیوں سے لدے ہوئے پیڑوں کے نیچے —— کھیلا کرتی، اور کبھی یہ خیال بھی نہ آیا کہ ایک لیچی توڑ کر چکھ لوں۔ اس شدید ایمانداری کی وجہ سے بڑی ہو کر مجھے بڑی سخت مصیبتیں اُٹھانی پڑیں یہ سیاسی نقطۂ نظر، تصورات، ذاتی تعلقات کے سلسلے میں، جہاں کہیں ابن الوقتی، تھوڑی چالاکی، مفاد پرستی اور دھوکہ دھڑی اور کامن سنس (Common sense) کی ضرورت پڑی وہاں میں ہمیشہ سچ بولنے پہ تلی

رہی اور نتیجے میں خوب جوتے کھائے۔

میری دوسری عادت جو شعور آنے پر پکی ہو گئی وہ میرے ذہنی تجزیہ کی تھی ـــــ جذبات، واقعات، مسائل، یعنی ہر چیز کا ذہنی تجزیہ اور اعلان ـــــ میری اس عادت کو میرے والد خوب سمجھتے تھے۔ اور میرے لئے پریشان رہتے تھے کہ آگے چل کر اس بے حد الجھی ہوئی دنیا میں میرا کیا حشر ہوگا۔ وہ میرے دوست اور سچے مددگار تھے۔ میں اُن کے پاس بیٹھ کر بڑی اونچی اونچی باتوں پر اُن سے بات چیت کرنے کی کوشش کرتی خدا کا تصور، سچائی اور حقوق کا اصول، نیت و داد، ملکی سیاست، موت اور زندگی ـــــ میں ہر چیز پر سوال کر کر کے ان کو پریشان کر دیا کرتی۔ یہ کیوں ہے؟ ـــــ یہ کیا ہے؟ ـــــ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ـــــ وہ رسائی سے مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے۔

ابھی مجھے زندگی سے مقابلہ کرنے کی عقل بھی نہیں تھی کہ اچانک موت میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اپریل ۱۹۴۳ء میں میرے والد کا سایہ میرے سر سے اُٹھ گیا۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی۔ والد کے انتقال کے بعد یہ میرے لئے دوسرا زبردست ذہنی اور جذباتی حادثہ تھا۔ میں نے افسانے ۱۹۴۴ء سے لکھنا شروع کر دیئے گئے۔ تقسیم ہند

کے صدمہ نے ۱۹۴۷ء کے آخر میں ساڑھے انیس سال کی عمر میں مجھ سے "میرے بھی صنم خانے" لکھوائی۔ جو میرا پہلا ناول تھا۔ اور جسے آج بھی اردو کی چند اچھی ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد میں نے جو کچھ لکھا اس کے صدمے کے زیر اثر لکھا۔ ذہنی جلاوطنی نے مجھے بہت پریشان کیا، انیسویں صدی کے ادیبوں کے لئے مسئلہ صرف جمالیاتی تصور کا تھا۔ آج کے ادیبوں کے لئے یہ مسئلہ سیاسی بن چکا ہے۔ سارتر نے ایک جگہ کہا ہے کہ ادیب اس لئے لکھتا ہے کہ تخلیق میں ایک چیز کا رشتہ دوسری چیز سے قائم کر سکے۔ لیکن آج کے دور میں ادیب اور دنیا کے درمیان بہت سی چیزیں دیوار بنا دی گئی ہیں۔ کارل مارکس کا یہ زاویۂ نگاہ ہے کہ انسان سماج کی ایک اکائی ہے اور وہ اس سے علیحدہ نہیں رہ سکتا۔ اور کافکا کا یہ کہنا ہے کہ انسان بنیادی طور پر اکیلا ہے۔ ان دونوں متضاد نقطہ ہائے نظر نے سارے جدید ادب کو متاثر کیا۔

لیکن میرے سامنے مسئلہ (Communication) کا تھا۔ میں نے محبت، نفرت، مذہبی کٹڑپن اور بے رحمی کے بارے میں بہت غور کیا انسان کی انسان کی جانب بے رحمی انفرادی اور اجتماعی طور پر۔ اجتماعی بے رحمی کے ساتھ تقسیم کا مسئلہ پھر سامنے آگیا۔ ملک تقسیم کیوں ہوا؟ کیا یہ تقسیم تاریخی حیثیت سے ناگریز تھی۔ اس سوال نے مجھے فلسفہ

تاریخ کی طرف کھینچا۔ اس کا جواب دینے کی کوشش میں ایک ناول "آگ، کا دریا" لکھا۔ دریا کو زمانے کا Symbol بنا کر میں نے تین ہزار سال کی پھیلی اور اُلجھی ہوئی ہندوستانی تاریخ میں سے ہندوستانی شخصیت کی عظمت کو گرفت میں لانے کی کوشش کی۔ (وقت کے علاوہ الفاظ میرے لئے دوسرا مسئلہ ہیں۔)

انسان عقلی حیثیت سے برابر سفر میں ہے۔ پہلے مجھ میں ایک طرح کا دانشورانہ گھمنڈ تھا۔ اب مجھ میں ایک طرح کی Intellectual Modesty) آگئی ہے۔ پہلے میں سمجھتی تھی کہ میری داخلی اور خارجی شخصیت میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ پھر مجھے پتہ چلا کہ میری خارجی شخصیت شاید غلط ہے۔ داخلی شخصیت اپنے آپ کو سمجھانے کے لئے ہمیشہ بے تاب رہتی ہے، مگر کچھ نہیں سمجھا پاتی۔ ہم سب الگ الگ جزیروں میں گھرے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف ایک نامعلوم اسرار کا جسے زندگی کہتے ہیں، ایک تاریک خوفناک، ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ ہم الفاظ کے ذریعہ دنیا سے اپنا رابطہ قائم کرنا چاہتے ہیں، مگر زندگی اور زیادہ اُلجھ جاتی ہے۔ شاید سارتر نے ہی کہا ہے کہ ہر لفظ ہماری ہار کا اقرار ہے کہ ہم (Communicate) نہیں کر سکتے۔

شاید مجھے Romantic سمجھا جائے گا۔ یہ صحیح بھی ہے کیونکہ مجھ میں

Classical اُدرشوں کی اَفسوسناک حد تک کمی ہے۔

لکھنے میں ماحول میرا خاص کردار ہے۔ ان کہے الفاظ ایسے احساسات جن کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا، کمرے کی ٹون، آسمان کے رنگوں کی کوئی جھلک، کھڑکی کے باہر جھکے ہوئے پیڑ کا ایک پتا، ماحول، حالات، وقت گھنے جنگل، پہاڑ، ندیاں۔ یہ سب میرے لئے ناٹک میں حصہ لیتے ہیں۔ خاص طور پر اسی وجہ سے جنوب مشرقی ایشیا، اور مشرقی بنگال نے مجھ پر سحر کر رکھا ہے۔ وہاں کے گھنے جنگلوں، وہاں کی ندیوں، وہاں کے پہاڑوں میں چھپے ہوئے کسی گھر کی ایک جھلک نے مجھے طرح طرح کی کہانیاں سنائی ہیں۔

جہاں تک انسان کا تعلق ہے۔ میں اسے بہت زیادہ نہیں سمجھ پائی۔ انسان آسانی سے سمجھ میں آنے والی چیز بھی نہیں۔ اس کا ذہنی تجزیہ میرے لئے ناقابلِ حصول ثابت ہوا ہے۔ شاید اسی لئے میری کہانیوں میں اچھی کردار نگاری نہیں ہوتی۔ ہر انسان کی شخصیت کے اندر کتنی تہ در تہ شخصیتیں ہیں۔ کتنے پہلو، کتنے ان دیکھے اور اجنبی راز ہیں۔ میرے لئے مرد اور عورت بعض اوقات ایسی پرچھائیاں ہیں جو میرے سامنے سے گزرتی ہیں، میں نہایت خوش ہو کر اپنے آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں انہیں پہچان سکتی ہوں۔ مگر وہ پرچھائیاں سامنے سے نکل جاتی

ہیں۔ ان کے کسی ایک رویہ، محبت یا نفرت کا تجزیہ کر کے میں ان کے سارے چہرے پر کوئی فیصلہ تھوپ نہیں سکتی۔ ہم سب ذاتی طور پر الگ الگ ادھورے سلسلے ہیں۔ اسی وجہ سے زندگی کے زیادہ گہرے تجربات کو — ایسے تجربات کو جن کی وجہ سے دل و دماغ اور روح کے پرخچے اُڑ جاتے ہیں، الفاظ میں ڈھال کر قاری کے سامنے پیش کرنا ناممکن ہے۔ فن کار خود اپنی چتا جلاتا ہے — اپنی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ اور ایک دن اسی میں بھسم ہو جاتا ہے۔ اگر اس آگ کی لپٹوں کی ہلکی سی جھلک بھی ادبی تخلیق کی شکل میں دنیا کے سامنے آجائے تو اسے جلنے والے کی خوش قسمتی کہہ لی جائے — حالانکہ یہ ایسی لمبی چوڑی خوش قسمتی بھی نہیں۔

میں بڑی ہو کر بہت سے پُر خلوص دوستوں کے درمیان گھری رہی ہوں۔ اور ان کی وجہ سے میری یادوں کا فانوس تیزی سے جھلملاتا رہا ہے۔ بہت سے دوست ایسے ہیں جن سے برسوں ملاقات نہیں ہوئی اور نہ شاید کبھی ہو۔ مگر ایسا لگتا ہے جیسے وہ پاس ہی موجود ہیں۔ اور اکثر یہ بھی محسوس ہوا کہ بعض دوستی کی چند گھڑیاں ایسی انوکھی اور غیر حقیقی ہیں کہ شاید زندگی میں ان کی کوئی جگہ نہیں۔ وہ بہت جلد ختم ہو جائیں گی، اور کبھی واپس نہ آئیں گی۔ اور ایسا ہی ہوا۔

۱۹۵۲ء میں میرا دوسرا ناول "سفینۂ غم دل" (جو خاصا بوگس تھا)

چھپا، تو مجھ سے کسی نے کہا تھا کہ تم اپنے ناولوں میں زمین آسمان کے قلابے ملاتی ہو۔ مگر حقیقت میں بچے کی طرح خوف زدہ ہو۔

میں نے زندگی کی لا معنویت اور مخول پر جی بھر کے قہقہے بھی لگائے ہیں۔ اور جی بھر کر روئی بھی ہوں۔ مجھے بہت سی خوشیاں بھی ملی ہیں اور بہت سے غم بھی۔ میں خوش ہوتی ہوں تو ساری دنیا کی خوشی میں اپنے آپ کو شامل کر لیتی ہوں۔ لیکن دکھ، موت کی طرح ایک ایسا تجربہ ہے کہ جس میں دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ ہم اپنی اپنی لاشیں کاندھوں پر اٹھائے گھوم رہے ہیں۔ ہمارے سامنے اپنی اپنی صلیبیں الگ گڑی ہیں۔ اور ہم اُن سے برابر کرب پاتے رہتے ہیں۔ الفاظ اس حقیقت کو اپنی گرفت میں کیسے لا سکتے ہیں۔

پچھلے سال میں نے ایک نیا ناول لکھنا شروع کیا۔ میں چودہ برس بعد اپنے گاؤں گئی۔ جو اتر پردیش میں ترائی کے قریب ہے۔ جہاں ہمارے آبائی محلہ میں تالاب کے کنارے میرے پرکھوں کی بنائی ہوئی حویلی کھڑی تھی جو ۱۹۴۷ء کے بعد دھیرے دھیرے ڈھا گئی۔ اب اس کے کھنڈر باقی ہیں اس کی اینٹوں میں لمبی لمبی گھاس اُگ آئی ہے۔ کیونکہ اس حویلی کی مرمت کرانے والے سب پاکستان چلے گئے۔ ہمارا خاندانی بھاٹ جو ہمارے یہاں شادیوں کے موقع پر دولہا کا شجرہ سنایا کرتا تھا جو اُسے

زبانی یاد تھا، میرے پاس آکر رونے لگا۔ "سب لوگ دوسرے دیش کو سدھار گئے۔ میں اب بھوکوں مر رہا ہوں۔"

کھنڈر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ اس سے کچھ فاصلے پر جلاہوں کی ایک بستی تھی۔ یہ جلاہے ہماری رعیت تھے اور ان کو حکم تھا کہ کچے مکانوں میں رہیں اور جوتے اتار کر ہمارے سامنے آئیں۔ اب حویلی کے کھنڈر سے بھی اونچے اُن کے پختہ مکان آس پاس کھڑے ہیں اور وہ اپنی شخصیت اور احترام کے احساس کے ساتھ قصبہ میں سر اُٹھا کر چلتے ہیں۔ "یہ جلاہنیں اب لیڈی ہملٹن کے برقعے سلواتی ہیں" ایک خستہ حال رشتہ دار سیدانی بی بی نے جو مشین پر ان کے برقعے سی سی کر اپنی گزر کر رہی ہیں طنزیہ لہجے میں کہا، جلاہوں۔۔ کے پکے مکان اور اُن کی عورتوں کے لیڈی ہملٹن کے برقعے ۔۔۔ یہ وہ خاموش انقلاب ہے جو پچھلے چودہ سال میں ہندوستان میں آیا۔ ایک زوال پذیر جاگیردارانہ تہذیب کا سورج ڈوب چکا اور اب ایک نئے "یگ" کی بنیادیں رکھی جا رہی ہیں۔

اسے صحیح معنوں میں سماج وادی سماج بنانے میں کتنی دیر لگے گی۔ مگر یہ بڑی بات ہے کہ ایک نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ میں نے اسی ناول کا نام "کھنڈر" سوچا ہے۔ یہ کھنڈر ایک مٹتی ہوئی تہذیب کا مرثیہ نہیں۔ کیونکہ اسی ملبے پر ایک نئے سماج کی بنیاد رکھی جائے گی۔ لیکن تمام خامیوں

کے باوجود مجھے اس تہذیب کے مٹ جانے کا بہت افسوس ہے جو پرانی قدروں اور ہندو مسلم تہذیبی ایجاد کی علم بردار اور نام لیوا تھی۔
لیجئے۔ میں نے اتنے صفحات سیاہ کر ڈالے۔ مگر بات وہیں کی وہیں رہی۔ اپنے بارہ میں کیا لکھوں؟ ساری زندگی کا حاصل حرف چند لفظ۔!!